کلیات بلونت سنگھ

(افسانے)

حصہ اول

تحقیق، تدوین، ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی-066 110

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 550
قیمت : 259 روپے
سلسلہ مطبوعات : 1312

Kulliyat-e-Balwant Singh, Vol.-I
Compiled by Jameel Akhtar

ISBN : 978-81-7587-278-3

ناشر: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، 167/8، سونا پریا چمبرس، جولینا، نئی دہلی۔110025
Paper used 70 Gsm TNPL

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

کلیات بلونت سنگھ کی یہ اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ بلونت سنگھ کی تصانیف ان کی نگرانی میں عمل میں آیا تھا اس کے بعد اشاعت ثانی نہیں ہو سکی اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مرتب نے کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا ہے۔ جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں ان کی حیثیت بھی اصل ہی کی ہے۔ اس لیے کہ ان کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔ کلیات کی تدوین میں تقویم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ افسانوی مجموعوں کے علاوہ درمیان میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شائع شدہ افسانوں کے سنہ اشاعت کے مطابق رکھی ہے اور جن افسانوں کا سال اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہو سکا ہے انھیں مجموعے کے زمانۂ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھا گیا ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو ترجیح دی گئی ہے۔

اہل علم سے گذارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تا کہ اگلی اشاعت میں دور کی جا سکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

انتساب

اپنی شریکِ حیات

نشید

کے نام

جس کی وجہ سے میری زندگی کو نیا مفہوم ملا

فہرست

☆	کچھ اس کلیات کے بارے میں	جمیل اختر	vii
1-	سزا		1
2-	دیش بھگت		17
3-	جگا		31
4-	نیتا		57
5-	پردیسن		75
6-	ماتا ہری		91
7-	حوا کی پوتی کا افسانۂ محبت		105
8-	شہناز		113

9-	گرہنی	135
10-	مہمان	153
11-	بھول بھلیاں	171
12-	خدا کی وصیت	185
13-	پنجاب کا البیلا	215
14-	خود دار	253
15-	رنگ	263
16-	سمجھوتہ	271
17-	دیمک	285
18-	کسبی	299
19-	کمپوزیشن ٹیچر	311
20-	جنگل میں منگل	323
21-	اس کی بیوی	329
22-	بیمار	353
23-	خلا	375
24-	تین باتیں	395

کچھ اس کلیات کے بارے میں

بلونت سنگھ اپنے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ جون 1921 میں چک بہلول ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔ بلونت سنگھ نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' ''ساقی'' اگست 1938 میں شائع ہوا۔ 1938 سے 1944 تک آٹھ افسانے ساقی میں شائع ہوئے۔ اگست 1938 کے بعد دوسرا افسانہ 'دیش بھگت' ساقی نومبر 1940، 'جگا' ساقی جنوری 1941، 'نینا' ساقی جولائی 1941، پردیس، ماتاہری، حوا کی پوتی کا افسانہ محبت 1943 تک شائع ہوئے۔ پہلی بار جولائی 1944 میں ان کا ایک افسانہ ''شہناز'' ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ یہیں سے انہوں نے افسانوی دنیا میں اڑان بھرنا شروع کی۔ اس کی اپنی وجہ بھی ہے۔ 1942 میں بی اے کی ڈگری الٰہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کرنے کے بعد بلونت سنگھ کچھ دنوں کے لیے لاہور منتقل ہوگئے، جہاں انہیں مولانا صلاح الدین احمد (اڈیٹر ادبی دنیا) راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی صحبتیں ملیں۔ ان کی ملاقاتوں نے بلونت سنگھ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ بلونت سنگھ جو ابھی تک آہستہ خرام تھے برق رفتاری سے دوڑنے لگے۔ اب تقریباً ہر دوسرے تیسرے ماہ ان کا ایک افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہونے لگا اور پھر بلونت سنگھ تواتر سے لکھنے لگے اور مختلف ادبی رسائل میں چھپنے لگے۔ ''ساقی'' میں ان

کے کل دس افسانے اور دو ڈرامے، ''قلوپطرہ کی موت'' اور ''مرغی'' شائع ہوئے۔ 'ادبی دنیا' میں سات افسانے اور ایک ڈراما ''سکہ زن'' شائع ہوئے۔ ''ساقی'' اور ''ادبی دنیا'' کے بعد ان کی کہانیاں ہمایوں لاہور، آج کل دلی، نقوش لاہور اور فسانہ میں شائع ہوئیں— کچھ کہانیاں مسیحی دنیا، سہیلی، نئی دنیا، تیج ویکلی میں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن ان کا ابھی تک کوئی صحیح سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ایک کہانی ''ڈنڈ'' تیج ویکلی میں شائع ہوئی ہے جو ہندی میں ہے۔ ہندی میں ان کی کہانیاں آج کل دلی، جاگرتی، ہنس، مایا، منوہر کہانیاں اور اردو ساہتیہ الٰہ آباد میں شائع ہوئیں۔

لیکن رسائل کی مکمل فائل کسی ایک لائبریری میں نہیں ملنے کی وجہ سے تمام کہانیوں کی دریافت یا تلاش ممکن نہیں ہوسکی۔ دوسرے، وسائل کی کمی بھی کہانیوں کی تلاش میں مانع رہی۔ سرکاری اداروں میں اشتہار پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے وسائل محدود کر دیئے جاتے ہیں جس سے معیاری تحقیق کا عمل پورا نہیں ہو پاتا اور آدھا ادھورا جو بھی محدود وسائل میں دستیاب ہو پاتا ہے اسے غنیمت جان کر اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس پروجیکٹ میں بھی دشواریاں رہیں۔ شروع میں جب میں نے اس پر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنی ہوگی لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ بلونت سنگھ کی تخلیقات کی تلاش کا سفر کانٹوں بھرا رہا۔ دہلی کے تمام اہم کتب خانے بلونت سنگھ کی کتابوں سے محروم ہیں۔ دلی یونی ورسٹی، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی پبلک لائبریری، ساہتیہ اکیڈمی، دلی اردو اکادمی اور لوگوں کے ذاتی کتب خانے، کہیں بھی بلونت سنگھ کی تمام کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ایک دو کتابیں ہی ہیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، پٹنہ کی خدا کی بخش لائبریری جو تحقیق کا بڑا گڑھ سمجھی جاتی ہیں وہاں سے بھی چند کتابیں ہی دستیاب ہوسکیں۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی کی لائبریری بھی اپنے محبوب فکشن نگار کے سرمایے سے محروم ہے۔ وہاں سے تلاش کے بعد بھی کچھ دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعوں میں سے تین خدا بخش لائبریری پٹنہ سے، ایک آزاد لائبریری علی گڑھ سے، ایک ساہتیہ اکیڈمی دلی سے اور ایک

بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ (الہ آباد) سے دستیاب ہوا۔ اس طرح بہ ہزار دقت یہ منزل طے ہوئی۔ میں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی دشواریاں اس راہ میں پیش آئیں گی اور اس پر بھی جب تحقیق کے لیے ہندوستان کی اہم لائبریریوں کا دورہ کرنے کے لیے کوئی وسیلہ بھی نہ ہو۔ گھر بیٹھے تحقیق کے جاں کاہ مراحل کو انجام دینا ناممکن ہے۔ اس میں مکمل جہاں کبھی نہیں ملتا۔

اس پر بھی بات صرف افسانوی مجموعوں کی تلاش تک ہی محدود ہو تو کسی حد تک بات بن بھی جاتی۔ لیکن معاملہ اگر اس سے بھی آگے کا ہو تو مشکل کی دیواریں حائل ہوجاتی ہیں۔ اپنے ذاتی وسائل کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ میں نے کلیات کی تدوین میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ افسانوی مجموعوں کو ہی کسی بھی فکشن نگار کی کل پونجی تصور نہیں کیا جائے بلکہ رسائل کی دنیائے بے پایاں میں غوطہ زن ہوکر گوہر آب دار تلاش کیا جائے اور فکشن نگار کی موجود پونجی میں اضافہ کر کے کلیات کے معنی و مفہوم کو مکمل کیا جائے۔ اس عمل میں نہ صرف دشواریاں ہزار ہیں بلکہ ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا''

تحقیق و تلاش کا کیڑا جب تک انگ انگ کو نہ ڈسے اور جذبۂ صادق خون کی رگوں میں موجزن نہ ہو اس دشوار گذار عمل کا تصور محال ہے اور میں جب اس طرح کے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر اس سے پورے طور پر عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک حقیر انسان کی بساط میں یہ کہاں۔ یہ تو محض سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ میں نے محدود وسائل کے باوجود اپنی بساط بھر پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ اور الہ آباد کا سفر بھی اس پروجیکٹ کے سلسلے میں ذاتی مصارف سے کیا۔ تقریباً ایک ہفتے تک الہ آباد میں رہا۔ بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ سے ملا۔ منجو سنگھ الہ آباد کے ایک کالج میں ہندی کی لکچرر ہیں۔ بے حد ملنسار، خلیق، متین اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ اگرچہ وہ اردو نہیں جانتیں پھر بھی انہوں نے جہاں تک ممکن ہوسکا ہے بلونت سنگھ کی تمام

چیزیں بہت سنبھال کر رکھی ہیں۔ ادبی مزاج نہیں ہونے کی وجہ سے وہ بلونت سنگھ کی جمع پونجی کو اردو اور ہندی والوں سے نہ کیش کرا سکیں اور نہ ہی اپنے شوہر کی ادبی تشہیر کا کوئی سامان کر سکیں۔ بلونت سنگھ کے بیٹے اور بیٹی میں بھی باپ کی وراثت کو سنبھالنے کا ہنر نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سبھی بے حد خلیق ہیں، شگفتہ مزاج ہیں مہمان نواز ہیں۔ منجو سنگھ بے حد معاون ثابت ہوئیں انہوں نے جو کچھ بھی ان کے پاس تھا سبھی میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس میں سے جو چیز میرے کام کی تھی میں نے الگ کر لی اس طرح ان سے بہت سی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ رسائل میں چھپے ہوئے چند افسانوں کی کٹنگ۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کتابوں کی مکمل فہرست ان سے حاصل ہوئی۔ الٰہ آباد کے کچھ احباب نے بھی بھرپور تعاون کیا اور نئی معلومات فراہم ہوئیں۔ اس طرح الٰہ آباد کا سفر بہت کامیاب رہا اور پروجیکٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں کئی ماہ تک رسائل کے ذخیرے سے تلاش وجستجو کا عمل جاری رہا جس کے نتیجے میں بہت سی نئی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سی چیزیں وسائل کی کمی کی وجہ سے معلومات ہونے کے باوجود مجھ سے دور رہیں یا دستیاب ہونے سے رہ گئیں۔ جو چیزیں معلومات ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکیں ہیں اس کی فہرست آگے آئے گی۔ اور نئے دستیاب شدہ افسانوں، ڈراموں اور مضامین کی فہرست بھی دی جائے گی تاکہ تحقیقی کامیابی کی داستان بھی بیان ہوسکے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اتنی ہی دشواریوں، کٹھنائیوں اور مشکلات کے بعد رسائل کے کرم خوردہ، دیمک زدہ اور گرد آلود فائلوں سے تھپکیاں دے دے کر کوئی کہانی نکلتی ہے۔ آج کے سائنٹفک دور میں مواصلاتی انقلاب کے باوجود اردو میں تحقیق کے ٹولس وضع نہیں کیے جاسکے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحقیق کی راہ میں صدہا دشواریاں جو پہلے تھیں وہ آج بھی موجود ہیں۔

اس لیے اردو کا محقق، تحقیق کے تمام تقاضوں سے کما حقہ عہد بر آ نہیں ہوسکتا۔ اردو میں معیاری تحقیق کا فقدان ہوتا جارہا ہے اسے محقق کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ ادھر تحقیق کے سلسلے میں مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بعض اوقات بڑی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے جو سہولت فراہم ہونی چاہیے وہ نہیں مل پاتی اور تحقیق کا سفر نامکمل رہ جاتا ہے۔ مکمل جہاں تو مجھے بھی نہیں مل پایا اس کی وجہ وسائل کی کمی تھی جس کا ذکر پہلے کرچکا ہوں۔ چلیے یہ عمل آدھا ادھورا ہی سہی پورا تو ہوا اور بلونت سنگھ کی تخلیقات کے ذخیرے میں اس تحقیقی کاوش کے نتیجے میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا بلکہ انکساری سے کہا جائے تو ایک حقیر سا اضافہ ہوا۔

بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجہوں سے پیدا ہوا جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظرانداز کیا جانا تھا۔ اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف اور بقول اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد اخبارات میں ان کی موت کی خبر نمایاں طور پر شائع نہیں ہوئی اور جب ارتھی اٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ کیسی وردنا کی تھی۔ نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔ سوائے چند ایک کے۔ مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔ شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔ یہ ناانصافی اور وردنا کی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔ میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تاکہ اس ناانصافی کی تلافی ہوسکے۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔ ہزارہا دشواریوں کے باوجود میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوسکا ہوں۔ نئی نسل اب اس کلیات کا مطالعہ کرے گی اور تنقید کی نئی عینک لگا کر پڑھے گی تاکہ بلونت سنگھ کو انصاف مل سکے

اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین قدر میں آسانی ہو اس سے شاید بلونت سنگھ کی روح اطمینان کی سانس لے سکے گی اور ادب تخلیق کرنے پر جو شرمندگی اسے ہورہی تھی وہ شاید ختم ہوجائے۔

دوسرے میرے ذریعے کی گئی تحقیق کے نتیجے میں بلونت سنگھ کے موجود سرمائے میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا ہے اس سے بھی تنقید کے نئے باب وا ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے جو تنقید اب تک ہوچکی ہے شاید اس سوچ میں بھی کوئی تبدیلی واقع ہو۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید ہوئی تھی وہ آدھے افسانوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اب پونجی دوگنی ہوگئی ہے۔

اردو میں بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعے صرف چھ ہیں:

1- **جگا** — مکتبہ اردو لاہور، پہلی اشاعت اپریل 1944
2- **تار و پود** — مکتبہ جدید لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ کتاب 1945 کے اواخر یا 1946 کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانے جولائی 1945 تک کے ہیں۔
3- **ہندوستان ہمارا** — سنگم پبلی شنگ ہاؤس، الٰہ آباد سے جون 1947 میں پہلی بار شائع ہوا۔
4- **سنہرا دیس** — اس میں بھی سن اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945 اور 1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ یہ کتاب 1950 کے دہے میں شائع ہوئی ہوگی۔
5- **پہلا پتھر** — مکتبہ جدید لاہور، دسمبر 1953
6- **بلونت سنگھ کے افسانے** — مکتبہ اردو لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں چند افسانے نئے اور بقیہ پرانے ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ تین اور مجموعوں کا نام ملتا ہے۔ ''شیرازہ''، ''اجلے پھول'' اور

''پنجاب کی کہانیاں'' لیکن ان مجموعوں کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔
اب ذرا ان چھ مجموعوں میں شامل کہانیوں پر بھی تفصیلی نظر ڈالیے:

1- جگا

(1) جگا (2) پردیسن (3) نینا (4) سزا (5) ماتا ہری (6) دیش بھگت
(7) حوا کی پوتی کا افسانۂ محبت (8) قلوپطرہ کی موت (ڈراما)
(9) مرغی (ڈراما) (10) پیامبر (ڈراما)

2- تارو پود

(1) سمجھوتہ (2) گرنتھی (3) دیمک (4) کسبی (5) مہمان (6) شہناز
(7) خود دار (8) کمپوزیشن ٹیچر (9) جنگل میں منگل (10) اس کی بیوی
(11) بیمار (12) خلا (13) پنجاب کا البیلا (14) تین باتیں۔

3- ہندوستان ہمارا

(1) ہندوستان ہمارا (2) پتھر کے دیوتا (3) بھیک منگے (4) کسک
(5) ڈاکو (6) موت (7) اجنبی (8) جھرجھری (9) آزاد فاقہ
(10) سکوت (11) روشنی (12) بھیک۔

4- سنہرا دیش

(1) چکوری (2) منی کی موت (3) بابو مانک لال جی (4) رنگ (5) سہارا
(6) سورما سنگھ (7) عذاب (8) سنہرا دیش (9) تلچھٹ (10) مداوا
(11) ہمارا مکان (12) لمس (13) کٹھن ڈگریا (14) رقیب (15) پیپرویٹ۔

5- پہلا پتھر

(1) بازگشت (2) نہال چند (3) کلی کی فریاد (4) تین چور (5) بابو مہنگا سنگھ

(6) آشیانہ (7) کالے کوس (8) لمحے (9) ویہلے 38 (10) تعمیر

(11) ایک معمولی لڑکی (ناولٹ) (12) اعتراف (13) پہلا پتھر۔

6- بلونت سنگھ کے افسانے

(1) جگا (2) کٹھن ڈگریا (3) کرنیل سنگھ (4) خوشبودار موڑ (5) گھر کا راستہ

(6) پنجاب کا البیلا (7) شکریہ (8) گن ہل پر رم جھم۔

ان افسانوں میں جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا کو چھوڑ کر باقی سب افسانے نئے ہیں۔

اب ذرا ان کے ہندی افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ہندی میں ان کے افسانوی مجموعے دس ہیں:

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے) اونکار شر دھر پرکاشن، الہ آباد، 1954

(1) ونڈ (2) جگا (3) چور (4) گرنتھی (5) البیلے (6) کچھ چھن (7) تین باتیں

(8) کالی تیتری (9) پہلا پتھر (10) ویہلے 38

2- چلمن، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1970

(1) پرتی دھونی (2) شوبینہ (3) مہمان (4) منی کی موت (5) سوابھیمان

(6) بابو مانک لال جی (7) اس کی پتنی (8) ویہلے 38 (9) کسک

(10) بہو (11) چلمن

3- پہلا پتھر۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد، 1971

(1) پہلا پتھر (2) چکوری (3) میں ضرور روؤں گی (4) پیپرویٹ (5) کچھ چھن

(6) تین باتیں (7) ویشیا (8) تعویز (9) نہال چند (10) اپریکیت

(11) بابا مہنگا سنگھ (12) سورما سنگھ۔

4- میری پریہ کہانیاں، راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی۔ 1971

(1) اندھیرا اجالا (2) تین باتیں (3) رنگ (4) سوابھیمان (5) دیمک

(6) کلی کی فریاد (7) تین دیویاں (8) بنواس (9) زندگی کا خوبصورت موڑ
(10) تیسرا سگریٹ (11) کالی تیتری

5- دیوتا کا جنم۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد 1977
(1) دیوتا کا جنم (2) گمراہ (3) گلیاں (4) باندھ (5) گھات (6) دوسرا ہنی مون
(7) زلف کی داستان (8) پھلکاری (9) پورا جوان (10) رکھوالا
(11) چاند اور کمند (12) پیلا پھاٹک (13) تری کون (14) جنازہ (15) شرط۔

6- پرتی ندھی کہانیاں۔ راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1977
(1) گرنتھی (2) پہلا پتھر (3) کچھ چھن (4) تین باتیں (5) سورما سنگھ
(6) شہناز (7) دیمک (8) کالی تیتری (9) شرط (10) سزا (11) جگا۔

7- بن باس تتھا انیہ کہانیاں۔ پرتیبھا پرکاشن، الہ آباد، 1978
(1) بن باس (2) ڈاکو باگر سنگھ (3) دو بہنیں (4) قبرستان کی حسینہ
(5) گوری چلی سسرال (6) پٹھان (7) رشتہ (8) ٹکسال والا (9) جھرنا
(10) بدائی (11) راہی (12) کیا کریں دونوں (13) لاٹری زندہ باد
(14) تتلیاں

8- ایلی ایلی۔ راج کمل پرکاشن، دہلی 1982
(1) ایک بات (2) گھر کا راستہ (3) تین پتر (4) چیتنا (5) ست رنگا کبوتر
(6) کنیادان (7) گن ہل پر رم جھم (8) حسن والے (9) شکریہ (10) تنتر
(11) پیلاں (12) گرنتھی (13) چندر لوک (14) ترپتی (15) گرینڈ ہوٹل

9- میری تینتیس کہانیاں: آتما رام اینڈ سنز، دہلی 6، 1988
(1) شکریہ (2) جگا (3) ایک ہی ناؤ پر (4) ونڈ (5) دوسری بھول (6) مہمان
(7) رقیب (8) اس کی پتنی (9) شام کے دھندلکے میں (10) پیپرویٹ
(11) شہناز (12) سنہرا دیس (13) نہال چند (14) شرط (15) چندر لوک

(16) چالیس سال بعد (17) اڑان (18) چیتا (19) گن ہل پر رم جھم
(20) پیلاں (21) تیغ (22) ارداس (23) دیدار (24) کومل سنگھ کی پریمیکا
(25) دل ناداں (26) بھیگی آنکھیں (27) پرتیچے (28) مکھن سنگھ کا اپہرن
(29) تین دیویاں (30) پھمن کور (31) پھلکاری (32) آگے کے دو دانت
(33) اندھیرا اجالا۔

10۔ میں ضرور روؤں گی۔ راجیو پرکاشن، الہ آباد، سال اشاعت درج نہیں ہے۔
(1) شام کے دھندلکے میں (2) دوسری بھول (3) شہناز (4) چکوری
(5) پیپر ویٹ (6) ویشیا (7) رقیب (8) میں ضرور روؤں گی (9) کسک
(10) پرتی دھونی (11) ایک ہی ناؤ پر (12) بابا مہنگا سنگھ (13) کٹھن ڈگریا

ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ 1954 میں شائع ہوا وہ بھی صرف پنجاب کی کہانیوں کا انتخاب۔ دوسرا افسانوی مجموعہ سولہ برس بعد 1970 میں شائع ہوا۔ اتنے لمبے خلا کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ اردو میں آخری افسانوی مجموعہ پہلا پتھر 1953 میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندی مجموعہ آیا ہے۔ اور بلونت سنگھ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں تواتر سے لکھ رہے تھے۔ ہندی میں ان کے ناول 1961 سے 1986 تک یعنی ان کے انتقال کے سال تک لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں اور اردو میں افسانے بھی 1983 تک پابندی سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں ناول صرف تین شائع ہوئے اور ہندی میں 24 ۔ اس سے یہ تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کے مقابلے ہندی میں شائع کرنے کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید اردو میں گھٹتے قاری اور مندا بازار ہو جبکہ ہندی میں قاری اور مالی منفعت دونوں ہی تھا۔

ہندی اور اردو کے تمام افسانوی مجموعے اور ناول ان کی حیات میں شائع ہوئے۔

ہندی افسانوی مجموعوں میں کہانیوں کی تکرار بہت ہے۔ تکرار کے ساتھ کل 132 کہانیاں ہوتی ہیں۔ تکرار کی نفی کر کے کل 100 کہانیاں ہوتی ہے۔ بارہ نئی کہانیاں

ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(1) تا حیات (2) آنند کارج (3) ڈاکٹر پاپڑ سنگھ (4) بادام رنگیں (5) تیجھٹ
(6) بھیگی پلکیں (7) چار استاد (8) جیجا جی (9) سمجھوتہ (10) زن گذراں
(11) اس رات کی بات (12) ننھا جھجھکو

ان کو شامل کر کے ہندی میں کل 112 کہانیاں ہوتی ہیں۔

اردو مجموعوں میں شامل کہانیاں 65 ہیں اور نئی دریافت شدہ کہانیاں 67 ہیں۔ اس طرح کل 132 کہانیاں شمار ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کی کل ملا کر 112+132=244 کہانیاں ہوتی ہیں جو اب تک میری نظروں کے سامنے آ سکی ہیں۔ اردو کی 132 کہانیوں میں سے تقریباً آدھا سے زیادہ ہندی مجموعوں میں جوں کی توں شامل کر لی گئی ہیں۔ یعنی چند کہانیوں کے صرف عنوانات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کہانیوں کے عنوان ہندی اور اردو میں ایک ہی ہیں۔

وہ کہانیاں جو دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں

	اردو کہانی	ہندی کہانی
1	آبشار	جھرنا
2	آنند کارج	آنند کارج
3	ایک ہی ناؤ میں	ایک ہی ناؤ پر
4	اس کی بیوی	اس کی پتنی
5	البیلا	البیلے
6	اجنبی	آپر یچت
7	ارداس	ارداس

8	باندھ	باندھ
9	بابو مانک لعل جی	بابو مانک لعل
10	بابا مہنگا سنگھ	بابا مہنگا سنگھ
11	بھیگی آنکھیں	بھیگی آنکھیں
12	پہلا پتھر	پہلا پتھر
13	پورا جوان	پورا جوان
14	پھلکاری	پھلکاری
15	پھمن کور	پھمن کور
16	پیپر ویٹ	پیپر ویٹ
17	پیلا پھاٹک	پیلا پھاٹک
18	تلچھٹ	تلچھٹ
19	تین باتیں	تین باتیں
20	تیسرا سگریٹ	تیسرا سگریٹ
21	تین دیویاں	تین دیویاں
22	تعویذ	تعویذ
23	تین خط	تین پتر
24	تکون	تری کون
25	جگا	جگا
26	چکوری	چکوری
27	چلمن	چلمن
28	چاند اور کمند	چاند اور کمند
29	چار استاد	چار استاد

30	چیتا	چیتا
31	حسن والے	حسن والے
32	دیمک	دیمک
33	دوسری غلطی	دوسری بھول
34	دوسرا ہنی مون	دوسرا ہنی مون
35	ڈاکو باگڑ سنگھ	ڈاکو باگڑ سنگھ
36	دیدار	دیدار
37	رنگ	رنگ
38	رشتہ	رشتہ
39	رخصتی	بدائی
40	رقیب	رقیب
41	زلف کی داستان	زلف کی داستان
42	زن گذراں	زن گذراں
43	سزا	سزا
44	سمجھوتہ	سمجھوتہ
45	سنہرا دیش	سنہرا دیش
46	سورما سنگھ	سورما سنگھ
47	شہناز	شہناز
48	شکریہ	شکریہ
49	شرط	شرط
50	کلی کی فریاد	کلی کی فریاد
51	کالی تیتری	کالی تیتری

52	کومل سنگھ کی محبوبہ	کومل سنگھ کی پریمکا
53	کسک	کسک
54	گلیاں	گلیاں
55	گھر کا راستہ	گھر کا راستہ
56	گن ہل پر رم جھم	گن ہل پر رم جھم
57	گرنتھی	گرنتھی
58	گمراہ	گمراہ
59	گوری چلی سسرال	گوری چلی سسرال
60	منّی کی موت	منّی کی موت
61	مہمان	مہمان
62	مکھن سنگھ کا اغوا	مکھن سنگھ کا اپہرن
63	نہال چند	نہال چند
64	ویہلے 38	ویہلے 38

اسی طرح ہندی کی تقریباً 50 کہانیاں ایسی ہیں جو اردو میں نہیں ہیں۔ اور وہ صرف ہندی میں ہی لکھی گئی ہیں۔

آگے کے دو دانت، ایک بات، اندھیرا اجالا، اڑان، اس رات کی بات، بہو، بنواس، بھیگی پلکیں، بادام رنگیں، پرتی دھونی، پیلاں، پٹھان، پرتیچے، ترپتی، تنتر، تتلیاں، تا حیات، تینج، ٹکسال والا، جنازہ، جیجا جی، چندر لوک، چالیس سال بعد، چور، دیوتا کا جنم، دو بہنیں، دل ناداں، دنڈ، ڈاکٹر پاپڑ سنگھ، رکھوالا، راہی، زندگی کا خوبصورت موڑ، سوا بھیمان، ست رنگا کبوتر، شونیہ، شام کے

دھند لکے میں، قبرستان کی حسینہ، کنیا دان، کچھ چھن، کیا کریں دونوں، گھات، گرینڈ ہوٹل، لاٹری زندہ باد، میں ضرور روؤں گی، ننھا جھمکو، ویشا۔

اس طرح اردو میں بھی 75 کہانیاں ایسی ہیں جو صرف اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اور ہندی میں نہیں ہیں۔

آشیانہ، آزاد فاقہ، آبگینہ، ایڈیٹر لوگ، اعتراف، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ایک رات، اس حمام میں، بھیک، بازگشت، بیمار، بھک منگے، بھول بھلیاں، بیڈمنٹن کی چڑیا، بات ایک رات کی، بادلوں کی چھاؤں تلے، پھانس، پنجاب کا البیلا، پتھر کے دیوتا، پردیسن، پامسٹ، پودے، پردیسی چاند، پاسبان، تین چور، تعمیر، تیاگ، ٹارزن، جزیرے، جنگل میں منگل، جھرجھری، چالان، چارسو برس پہلے، حوا کی پوتی کا افسانہ، حد فاصل، خوددار، خلا، خوشبودار موڑ، خدا کی وصیت، دیش بھکت، دودھ بھری گلیاں، ڈاکو، دل بلبل، دانت ایک بات ایک، دستک، راستہ چلتی عورت، روشنی، سکوت، سہارا، سکہ زن، سنگ انداز، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیا، صبح شام آرزو، عذاب، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کسبی، کمپوزیشن ٹیچر، کالے کوس، کٹھن ڈگریا، کاتے، لمس، لمحے، لٹکتی شامیں، مداوا، ماتاہری، موت، نیتا، ناگ پھنی، واپسی۔

لیکن یہ بھی ایک بڑا تحقیقی معاملہ ہے۔ اردو ہندی کی تمام کہانیوں کی چھان پھٹک کر کے ہی اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ سرسری جائزے یا ذاتی تاثر کی بنیاد پر کوئی ٹھوس رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس طرف اشارے کا مقصد

صرف اتنا ہے کہ کہانیوں کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ اور اردو، ہندی کے پچڑے میں پڑ کر بھی محقق اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ اردو میں دستیاب کہانیوں کو ہی اردو کی میراث سمجھے اور ہندی میں موجود کہانیاں ہی ہندی کی کہلائیں۔ ترجمہ کر کے دونوں کے سرمایے میں نقب زنی کرتے وقت بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں زبان کی اصل پونجی کیا ہے۔ اور درآمد شدہ پونجی کیا ہے۔ ناقد بھی فن کا تجزیہ کرتے وقت کہانی کے بریکٹ میں (اردو) اور (ہندی) ضرور لکھیں تاکہ قاری کا ذہن صاف رہے اور وہ کسی مخمصے میں گرفتار نہ ہو۔

اب رہی بات اشک صاحب کے قول کی بقول اشک صاحب بلونت سنگھ 300 سے زائد کہانیوں کے خالق ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حتمی بات نہ ہو بلکہ صرف اندازہ ہو۔ اگر اس اندازے کو تھوڑی دیر کے لیے سچ مان بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ 244 کہانیاں تحقیقی جانفشانی کی اس جاں کاہ مہم میں میرے سامنے سرنگوں ہو تو گئیں۔ اور وہ جن کا وجود عام اردو قاری کے لیے پردۂ خفا میں ہے (اگر ایسا ہے) اگر وہ دستیاب ہوئیں تو یہ تعداد مکمل بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اشک صاحب کی بات کو صرف اندازہ ہی تصور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں بچی ہوئی کہانیاں اردو میں اب کم ہی ہوں گی۔ ہندی میں زیادہ ہونے کا گمان اغلب ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرے کی چھان پھٹک ابھی میں نے کی نہیں ہے۔

اب پھر رجوع کرتے ہیں اردو مجموعوں کی طرف

''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الہ آباد سے شائع ہوا ہے ۔ تمام مجموعوں کے اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو بد دل ہوگئے یا انہوں نے اس جانب خود توجہ نہیں دی۔ اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو

دیکھتے ہوئے انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔ اس لیے اردو مجموعوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں اردو سے تین گنی کتابیں ہیں۔

چونکہ ان کی کتابوں کے ایک سے زیادہ اڈیشن شائع نہیں ہوئے اور تمام اڈیشن بلونت سنگھ کی حیات میں ان کی نگرانی میں شائع ہوئے اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی بھی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا گیا ہے جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی اصل کی ہے۔ بنیادی متن کے طور پر حاصل افسانے کو ہی اصل مان لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔

کلیات کی تدوین میں تقویم کا خیال رکھا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب میں افسانوی مجموعوں کی مکمل ترتیب باقی نہیں رہی۔ بیچ بیچ میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی۔ پہلی جلد میں 'جگا' اور 'تارو پود' کے افسانوں کے علاوہ ساقی اور ادبی دنیا میں 1945 تک شایع افسانے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ایک افسانہ ''رنگ''، ادبی دنیا نومبر 1945 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجموعہ سنہرا دیش میں شامل ہے۔ لیکن تاریخی ترتیب میں یہ افسانہ پہلی جلد میں جگہ بنا پایا۔ اس جلد میں ایک افسانہ 'خدا کی وصیت' نیا ہے۔ یہ ادبی دنیا جون 45 میں شائع ہوا تھا۔

سن اشاعت کے لحاظ سے ترتیب اس لیے کہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہی طریق کار زیادہ سائنٹیفک ہے۔ کسی بھی فن کار یا تخلیق کار کے فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے میں یہ تاریخی سیڑھی بے حد معاون ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے ایک دشواری اور تھی۔ تمام افسانوں کی سنہ اشاعت یا سن تخلیق مجھے دستیاب نہیں ہوسکی۔ ایسی صورت میں جو تاریخی ترتیب میں نے تیار کی اس میں جن افسانوں کی سنہ اشاعت ماہ وار معلوم نہیں ہوسکی اس

کے لیے میں نے یہ طریق کار اپنایا ہے کہ جس مجموعہ میں یہ افسانہ شامل ہے اس کی سن اشاعت کو ہی اس کی درمیانی تاریخ مان لی۔ اگرچہ اس میں مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اور کوئی دوسری صورت سمجھ سے باہر تھی۔ مثلاً 'جگا' 1944 میں شائع ہوا۔ جگا میں شامل افسانے 1938 تا 1944 تک ہیں۔ لیکن 'تار و پود' کی سال اشاعت ہی معلوم نہیں۔ اس میں 1944 تا 1945 سن کے افسانے شامل ہیں۔ لہٰذا اس کی سن اشاعت بھی میں نے 1945 متعین کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں 1945 کے بعد کے افسانے نہیں ہیں۔ سنہرا دیش میں بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945-1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں۔ 1947 میں 'ہندوستان ہمارا' شائع ہوا۔ اس میں شامل کہانیاں بھی ظاہر سی بات ہے کہ 1947 تک کی ہی ہوں گی اور یہ مجموعہ 'سنہرا دیش' یقیناً 'ہندوستان ہمارا' کے بعد آیا ہوگا۔ حالات کا تجزیہ اور موجود شواہد تو یہی کہتے ہیں۔ اس لیے 1945 کے اواخر میں 'تار و پود' کے شائع ہونے کا امکان اغلب ہے۔ ایسی صورت میں 'سنہرا دیش' 1947 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔ چاہے وہ تاریخ 1950 ہو یا 1951 ہو۔ جب تک کوئی اور تحقیقی شواہد نہیں ملتے۔ انہی تاریخوں پر یقین کرنا ہماری تحقیقی مجبوری ہے۔ لہٰذا انہی سنہ اشاعت کے لحاظ سے کلیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور نئے افسانے اپنی تاریخی ترتیب میں ان کے درمیان ہی جگہ پاسکے ہیں۔

نئے حاصل شدہ افسانے جون 1945 سے لے کر 1980 تک کے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'جگا' (1944) کے بعد ان کا افسانوی مجموعہ سنہرا دیش ہے جو 1950 کے لگ بھگ آیا ہے۔ اس زمانے کے بھی کئی افسانے اور ڈرامے ان مجموعوں میں شامل نہیں ہوسکے۔ بعد میں ایک انتخاب ''بلونت سنگھ کے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں تین پرانے افسانے 'جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا' کو چھوڑ کر باقی سبھی افسانے نئے ہیں اور امید قوی ہے کہ یہ مجموعہ 1980 کے دہے میں آیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانہ اگست 1969 سے مارچ 1979 تک کا ہے۔ بلونت سنگھ کا انتقال

1986 میں ہوا۔ لہٰذا یہ مجموعہ ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ اسے بھی کسی ہندوستانی پبلشر نے نہیں شائع کیا بلکہ اسے بھی مکتبہ اردو ادب لاہور جو بلونت سنگھ کی کتابوں کے پبلشر رہے ہیں انہوں نے شائع کیا ہے۔ بلونت سنگھ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جگا'' کو چھوڑ کر کسی بھی مجموعے میں کوئی دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ، حرف گفتار نہیں ہے جس سے کہ اس کے عالم وجود میں آنے کا پتہ چل سکے۔ مجموعوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناشر نے اپنی صوابدید سے جو کچھ اسے میسر آیا لے کر شائع کر دیا ہے۔ ممکن ہے بلونت سنگھ سے اجازت بھی لی ہو۔

بلونت سنگھ پر اب تک میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہندوستان میں تین تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک دلی یونی ورسٹی میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور تیسرا کلکتہ یونی ورسٹی میں۔ ممتاز آراء اور شاہدہ مفتی دونوں خاتون کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ ممتاز آرا کا مقالہ 'بلونت سنگھ — فن اور شخصیت' کتابی صورت میں شایع بھی ہوگیا اور شاہدہ مفتی کے مقالے کا بیشتر حصہ سہ ماہی جامعہ کے بلونت سنگھ نمبر اور کتاب نما کے گوشۂ بلونت سنگھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب ابھی شایع نہیں ہوئی ہے۔ ان دونوں طالبات کی بھی مناسب رہنمائی نہیں کی گئی جس سے بلونت سنگھ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی تحقیق کے تقاضے پورے ہوئے۔ آدھی ادھوری معلومات کی بنیاد پر مقالے تیار کرائے گئے اور ڈگری تفویض کر دی گئی۔ کسی نے بھی نئے افسانوں کی تلاش کا جوکھم نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ کتابوں کی سنہ اشاعت کے متعلق بھی مستند معلومات حاصل نہیں کی۔ شاہدہ مفتی نے بھی جامعہ کے خاص نمبر اکتوبر تا دسمبر 2001 میں کتابوں کی فہرست تو دی ہے لیکن وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ دوسرے کسی بھی کتاب کی تاریخ اشاعت اور پبلیشر کا نام درج نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ واضح کیا ہے کہ کون سا افسانوی مجموعہ ہے اور کون سا ناول، ہندی فہرست میں یہ خلط ملط خاص طور پر ہے۔ یعنی یہ فہرست بھی تحقیقی تقاضوں سے عاری ہے۔ شاہدہ مفتی نے بلونت سنگھ کے

گیارہ نمائندہ افسانوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس میں 'چاند اور کمند' اور 'پورا جوان' نئی کہانی ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی سنجیدہ کوشش بلونت کے بارے میں ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نارنگ چونکہ تحقیق کے مرد میداں ہیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو وقار و اعتبار حاصل ہے۔ وہ جب بھی کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو تحقیق تقاضوں سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

'بلونت سنگھ کے بہترین افسانے' کے نام سے اکیس افسانوں کا ایک بہت ہی جامع انتخاب انہوں نے کیا جس کا پہلا اڈیشن 1995 میں ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب اردو، ہندی اور انگریزی تین زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے ستر صفحے کا بسیط عالمانہ مقدمہ لکھا اور بلونت سنگھ کو نئے سرے سے ڈسکورس کیا۔ ان کی کہانیوں پر بالتفصیل گفتگو کی۔ ان کی دریافت نے بلونت سنگھ کی تفہیم کے نئے دروازے کھول دیئے۔ یہ کتاب ایک ایسے وقت میں آئی جب اردو والے بلونت سنگھ کو بھول چکے تھے۔ نارنگ کی سعی خاص طور سے توجہ دلانے پر آجکل، کتاب نما اور سوغات نے بلونت سنگھ پر خاص نمبر اور گوشے نکالے۔ جیسا کہ انہوں نے تحریر کیا ہے۔

نارنگ نے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیاں منتخب کیں۔ اس عمل میں تین نئی کہانی بھی دریافت کی۔ 'راستہ چلتی عورت'، 'کالی تیتری' اور 'گمراہ'— گویا اٹھارہ کہانی مجموعوں سے اور تین رسائل سے لیں۔ یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور تحقیق میدان سر کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا قابل ستائش ہے۔

نارنگ نے بلونت سنگھ کی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ناشر اور سنہ اشاعت کے ساتھ جو تحقیق کا طریقہ کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے اس میں کہیں کہیں تسامح ہوا۔ جیسے ایک ''معمولی لڑکی'' اور ''عورت اور آبشار'' ناولٹ ہے لیکن فہرست میں

ناول لکھا گیا ہے۔ اس طرح 'چک پیرا کا جسّا' ناول ہے اسے افسانوی مجموعہ لکھا گیا ہے۔ تیسرے 'تارو پود' کی سنہ اشاعت 1944 درج کی گئی ہے جو درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پچھلے صفحے پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس میں شامل تمام افسانے 1944 اور 1945 کے ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعہ 1945 کے بعد ہی شایع ہوا ہے۔

ناول ''رات چور اور چاند'' 1961 میں ادارہ فروغ اردو لاہور، نقوش پریس سے شایع ہوا۔ اس سے قبل یہ ناول نقوش میں قسط وار مارچ 1956 سے اکتوبر 1961 تک متواتر شایع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس ناول کا سن اشاعت نارنگ نے 1948 درج کیا ہے۔

ہندی کتابوں کی فہرست بھی مقام اشاعت، سنہ اشاعت اور پبلشرز کے ساتھ دی گئی ہے۔ لیکن اس میں ناول اور افسانوی مجموعے کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ اگر یہ بھی کردیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہندی کتابوں کی کل تعداد فہرست کے مطابق 1929 ہے۔ بلونت سنگھ پر کیے گئے اب تک کے کاموں میں نارنگ کا کام سب سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے۔

نارنگ نے 'بلونت سنگھ کا فن- سائیکی، ثقافت اور شکست رومان' کے عنوان سے جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس کا اختتام یوں کیا ہے:

> ''ایسی پر لطف کہانیوں کا فن کار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہوسکتا .... اگرچہ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور قاسمی کے فوراً بعد کے معاصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہیں اس قدر نہیں ٹھہریں، اور پھر قبل از وقت موت سے وہ نگاہوں سے جلد اوجھل بھی ہوگئے۔ تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی باز آفرینی کے اعتبار سے، نیز جگا، گرنتھی، سورما سنگھ، ویلے 38 ، پہلا پتھر، دیش بھگت، کالی تیتری یا کٹھن ڈگریا کے خالق کی حیثیت سے اردو

> افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کی خاص خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا ہے، وقت اُسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔"

نارنگ کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ میرے اس حقیر کام کو بلونت سنگھ کی از سرِ نو دریافت کی ایک کوشش ہی سمجھنا چاہیے۔ وقت بلونت سنگھ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکا۔ نارنگ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

چھ افسانوی مجموعوں کے افسانوں کے علاوہ اس کلیات میں نئے تلاش کیے گئے افسانے 67 سے زیادہ ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

نئے افسانے : آبشار، آبگینہ، آنند کارج، ایک ہی ناؤ میں، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ارداس، ایک رات، باندھ، بادلوں کی چھاؤں تلے، بھیگی آنکھیں، بات ایک رات کی، بھول بھلیاں، پھانس، پامسٹ، پودے، پھلکاری، پھمن کور، پردیسی چاند، پیلا پھاٹک، پاسبان، پورا جوان، تیسرا سگریٹ، تین خط، تین دیویاں، تعویز، تیاگ، تکون، جزیرے، چاند اور کمند، چلمن، چالان، چار سو برس پہلے، چار استاد، چیتنا، حد فاصل، حسن والے 1998 میں، خدا کی وصیت، دودھ بھری گلیاں، دیدار، دوسرا ہنی مون، دل بلبل، دستک، دانت ایک بات ایک، ڈاکو باگڑ سنگھ، راستہ چلتی عورت، زلف کی داستان، رخصتی، زن گذراں، سکہ زن، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیہ، صبح و شام آرزو، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کالی تیتری، کومل سنگھ کی محبوبہ، گلیاں، گوری چلی سسرال، لٹکتی شامیں، مکھن سنگھ کا اغوا، ناگ پھنی، ھوالشافی۔

اب وہ افسانے جن کا نام تو معلوم ہے لیکن جن تک رسائی نہیں ہوسکی ہے وہ یہ ہیں:

البیلا، اس حمام میں، بیڈمنٹن کی چڑیا، دوسری غلطی، سنگ انداز، کاتتے، واپسی، یہ لمحے، پودے۔

نئی کھوج میں ڈرامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔

ڈرامے: پامال محبت، پھانس اور سکہ زن ہیں اور **ناولٹ**: عہدِ نو میں ملازمت کے تیس مہینے، **مضامین**: چار سو برس پہلے، فلمی انٹرویو، حضرت چھچھوندر چھچھوندری، ایڈیٹر لوگ اور کرشن چندر اور فراق گورکھپوری سے لیے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اتنی ساری نئی سوغات اس کلیات میں شامل ہے۔

عنوان کی سطح پر ایک تکرار اور ایک تبدیلی ہے۔ مثلاً 'کالے کوس' یہ ان کے ایک ناول کا نام ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان سے ایک افسانہ بھی اس کلیات میں شامل ہے۔ اسی طرح 'رشتہ' کے نام سے ایک افسانہ 'سوغات' کے شمارہ آٹھ گوشۂ بلونت سنگھ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ یہ در اصل 'کرنیل سنگھ' نام کی کہانی کا بدلا ہوا عنوان ہے۔ یہ کہانی ہندی میں 'رشتہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور ہندی مجموعے میں اسی نام سے شامل ہے۔ اردو میں کرنیل سنگھ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ 'آبشار' ان کے ایک افسانے کا عنوان ہے جو 'آج کل' مارچ 1955 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں 'عورت اور آبشار' کے نام سے ان کا ایک ناولٹ بھی شائع ہوا۔ کچھ لوگ اس کو ایک ہی مانتے ہیں۔ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ دراصل یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ آبشار افسانے کو ہی پھیلا کر ناولٹ کا روپ دیا گیا ہے لیکن افسانہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ دونوں کے متن میں بھی کافی فرق ہے۔ وہی فرق جو افسانے اور ناولٹ میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ افسانہ آبشار ہی بعد میں 'عورت اور آبشار' کے نام سے کتابی شکل میں آیا مناسب نہیں ہے۔ عنوان میں اضافے کے ساتھ ساتھ متن میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ گرچہ کہانی کا محور عورت ہی دونوں میں ہے۔

کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شایع شدہ افسانوں کے

سنہ اشاعت کے مطابق رکھی گئی ہے اور جن افسانوں کا سال اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ ان کی اشاعت مجموعے کے زمانۂ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھا گیا ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو ترجیح دی گئی ہے۔

یہ کلیات کی جلد اول ہے۔ اس میں کل چوبیس افسانے شامل ہیں، جس کا زمانۂ اشاعت 1938 سے1945 تک ہے اس میں افسانوی مجموعہ 'جگا' کے سات افسانے، 'تارو پود' کے چودہ افسانے 'سنہرا دیش' سے ایک افسانہ اور مجموعے سے باہر کے دو افسانے 'بھول بھلیاں' اور 'خدا کی وصیت' شامل ہیں۔

اب میں آخر میں ان افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس تحقیقی کام میں میری معاونت کی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر منجو سنگھ، ڈاکٹر عطا خورشید علی گڑھ، یوں تو ان کے تعاون کے لیے شکریے کے الفاظ ناکافی ہیں۔ میں تہ دل سے ان سب کا مشکور ہوں۔

جمیل اختر

فروری 2009

18 جی، سی پی ڈبلیو ڈی کالونی

وسنت وہار، نئی دہلی-57

موبائل: 9818318512

سزا

یہ کہانی پنجاب کے ایک گاؤں سے وابستہ ہے۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو ایک حویلیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکانات گارے کے بنے ہوئے تھے۔ وہی جوہڑ، وہی ببول، شریہنہ اور بیریوں کے درخت، وہی گھنے پیپل کے تلے رُوں رُوں کرتے ہوئے 'رہٹ' وہی صبح کے وقت کنوؤں پر کنواریوں کے جمگھٹ، دوپہر کو بڑے بوڑھوں کی شطرنج اور چوپڑ، شام کو نوجوانوں کی کبڈّی اور پرسکوت راتوں میں وارث علی شاہ کی ہیر، ہیر اور قاضی کے سوال و جواب وہی مضبوط، نٹ کھٹ اور چنچل چھوکریاں اور وہی سیدھے سادے بلند قامت اور وجیہہ نوجوان ——

شام ہو چکی تھی۔

گھر میں پکانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ اس لیے جیتؔ کور پیسہ آنچل میں باندھ کر دال لینے کے لیے گھر سے باہر نکلی۔ لیکن چار قدم چل کر رُک گئی۔ سامنے پیپل کے نیچے گمدر کے قریب لکھمن سنگھ چارپائی پر بیٹھا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

جیتؔ کور جانتی تھی کہ وہ اُس کے پاس سے گذرے گی تو وہ اُسے بغیر چھیڑے ہرگز نہ رہے گا۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ بجائے دال کے کسی کھیت سے ساگ لے آتی ہوں۔ اس طرح سے وہ پیسہ چھوٹا بھائی چنّن خرچ کرلے گا۔ آج دوپہر بھر وہ کھانڈ کی

رنگ دار گولیوں کے لیے روتا رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کھیتوں کی طرف چل دی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ببول اور کیکروں کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ جیت کور چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں سے شلوار بچاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ جامن کے قریب بیروں کی جھاڑیاں تھیں، اُس نے تھوڑے سے بیر چھنن کے لیے توڑ لیے، پھر آگے بڑھی۔ اس کے چہرے سے افسردگی اور غصہ کے آثار ہویدا تھے۔ اس وقت وہ پھمن سنگھ کی بابت سوچ رہی تھی۔ آخر پھمن سنگھ اُسے کیوں دق کرتا ہے۔ اگر اور نہیں تو ستری اُس سے کم حسین تو نہ تھی۔ وہ اُسے کیوں نہیں چھیڑتا؟ لیکن ستری کے تین جوان بھائی تھے۔ اگر کوئی اس کی طرف انگلی بھی اٹھائے تو وہ اس کا خون پی جائیں۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنا بھائی یاد آ گیا۔ تین سال پہلے جب کہ اُس کی عمر پندرہ برس کی تھی اُس کا بھائی گھر سے کھانا کھا کر کنویں پر گیا۔ جہاں اُس نے تربوز کھا لیا۔ اور شام تک ہیضہ سے مر گیا۔ اس کا بھائی گاؤں بھر میں سب سے زیادہ دراز قد تھا۔ اس کا سینہ ایسا تھا جیسے کسی بڑی چکی کا پاٹ۔ ایک بالشت اونچی اور موٹی گردن ۔ چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ ۔ کلائی پکڑنے اور کبڈی کھیلنے میں دور دور تک کوئی اس کی برابری کا دعوے دار نہ تھا۔ ایک دفعہ کبڈی میں اس نے تھپڑ مار کر اپنے حریف نوجوان کی ہنسلی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ یہ باتیں یاد کر کر کے جیت کور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بھلا آج اُس کا بھائی زندہ ہوتا تو کیا پھمن سنگھ کی ہمت پڑ سکتی تھی کہ اُس سے چھیڑ خانی کرے۔ کل ہی کی بات تو ہے کہ اس بدمعاش نے اُس کا آنچل کھینچ کر اُس کا سر ننگا کر دیا تھا۔ یہ سب اسی لیے تو تھا کہ وہ نمبردار کا لڑکا تھا اور دوسرے یہ اُن کے قرض دار تھے۔ ماں کی موت کے بعد ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ماں کے بعد باپ مرا۔ باپ کے بعد اس کا بھائی مرا اور اب بوڑھا دادا رہ گیا تھا۔ جسے وہ باپو کہا کرتی تھی۔ یا چھنن تھا۔ چھ سال کا بچہ۔ ماں باپ کی آخری نشانی۔ کئی دفعہ فصلیں خراب ہوئیں۔ نمبردار کا ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ سر پر ہو گیا۔ زمین علاحدہ رہن تھی۔ باپو بوڑھا تھا۔ ان تمام مصیبتوں پر طرہ یہ کہ بے شرم پھمن سنگھ اُسے دم نہ لینے دیتا تھا۔

اب جیت کور کا پھر سے خون کھولنے لگا۔ اُس کے دل میں تمام مردوں کے لیے

نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ اب تارا سنگھ کو ہی دیکھو اُس کا نہ آگا نہ پیچھا۔ بس لے دے کے اُس کی ماں ہے تھوڑے دن کی مہمان۔ اُسے بھلا کا ہے کا فکر؟ زمین ہے۔ ایک کچا مکان۔ تین بیل۔ ایک بھینس اور ایک گائے بھی ہے۔ اُسے اپنی اکیلی جان کے لیے یہ کافی سے زیادہ ہے۔ مارے بے فکری کے رانڈ کا سانڈ ہو رہا ہے۔ جب دیکھو مونچھ پہ ہاتھ۔ اتنا لمبا چوڑا جوان ہو کر بے چاری کمزور لڑکیوں پر آوازے کستے شرم نہیں آتی۔ میں تو کہوں گی کہ سبھی مرد پرلے درجے کے مغرور، غنڈے اور پاجی ہوتے ہیں۔ جب کبھی پانی کا گھڑا کنوئیں سے اٹھا کر لاتی ہوں تو کیسی بھدّی آواز سے گاتا ہے:

نکّا گھڑا چک لچھیے! تیرے لک نوں جرب نہ آوئے۔

نکّا گھڑا چک لچھیے!

(اے دوشیزہ تو چھوٹا گھڑا اٹھایا کر۔ مجھے خوف ہے کہ تیری نازک کمر میں بل نہ آجائے۔)

باپو کا خیال ہے کہ میں اُس سے شادی کرلوں، مگر میں ایسے لفنگے کے ساتھ شادی کروں کیوں؟ مانا کہ پھمّن سنگھ کی طرح اُس نے دست درازی کبھی نہیں کی۔ مگر اس قسم کے گانے نوجوان لڑکیوں کو سنا سنا کر گانا بھی تو بھلے آدمیوں کا کام نہیں۔

اس وقت جیت کور کو رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کاش واہگورو اکال پرکھ اُسے طاقت دیتا تو وہ ان دل پھینک عاشقوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔

چلتے چلتے وہ رک گئی۔ سامنے گنّے کے کھیتوں کے پاس ہی ہرا بھرا ساگ کا کھیت تھا۔ لیکن وہ کھیت تھا تارا سنگھ کا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مویشی باندھنے کا مکان خالی معلوم پڑتا تھا۔ رہٹ چل رہا تھا۔ اور پاس ہی بیل بندھا ہوا تھا۔

اُس نے جب اچھی طرح سے دیکھ لیا کہ نزدیک کوئی نہیں ہے تو چپکے سے کھیت میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔ اور جلدی جلدی ساگ توڑنے لگی۔ معاً ایک آواز سن کر اُس

نے سہم کر سر اوپر اٹھایا۔ دیکھا کہ دور گنّے کے کھیتوں سے تاڑو ہاتھ میں پھاوڑا لیے بلند آواز سے گالیاں دیتا چلا آتا ہے۔ اس کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوئی اور وہ ساگ وہیں پھینک کر جلدی جلدی دوسری طرف کو چل دی۔ اتنے میں تاڑو وہاں پہنچا۔ اس نے توڑا ہوا ساگ ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کی طرف لپکا۔ اِدھر اس کے چھوٹے چھوٹے پھٹے ہوئے سلیپر ہری گھاس پر بار بار پھسلتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ تاڑو اس کو پکڑا ہی چاہتا ہے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ تاڑو بھی دوڑا۔ مختصری دوڑ کے بعد تاڑو نے اُسے جا دبوچا۔ اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔ ''کیوں ری جیتو! ہم سے یہ چالاکیاں؟ ہر روز تو ہی ساگ چُرا کر لے جاتی تھی نا؟ آج میں بھی اسی تاک میں بیٹھا تھا۔''

جیتو روتے ہوئے اور اُس کی آہنی گرفت سے بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تیرے کھیت میں پہلے کبھی نہیں آئی...... چھوڑو مجھے۔''

''کبھی نہیں آئی تھی......'' تاڑو دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''چل آج میں تجھے چکھاتا ہوں مزا۔''

تب تاڑو اُسے گھسیٹتا ہوا۔ کچے مکان کی طرف لے گیا اور دروازہ کھول کر اُسے زور سے اندر دھکیل دیا۔ وہ بھینس کے اوپر گرنے سے بال بال بچی۔ اُس کی ایک چوڑی بھی ٹوٹ گئی۔ چوڑی کو ٹوٹتے دیکھ کر دامن صبر اُس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ چیخ کر بولی۔ ''تو نے میری چوڑی توڑ دی۔ میں نے اتنے شوق سے میلے سے لی تھیں......'' اُس کی آواز بھرّا گئی اور وہ شکستہ چوڑی کے ٹکڑوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہانے لگی۔

اب تاڑو نرم پڑ گیا۔ دل میں افسوس بھی پیدا ہوا۔ یکا یک اُس نے دیکھا کہ چوڑی کا ٹکڑا چبھ جانے سے جیتو کی کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ ایک دم آگے بڑھا۔

''اوہو! جیتو تمہاری کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ لاؤ......''

''ہٹ'' جیتو نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''بدمعاش...... کلموہا...... مسٹنڈا......''

تاڑو گالیاں کھا کر خاموش ہوگیا۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ بات کا بتنگڑ بن جائے

گا وہ تو دو گھڑی کے لیے جیتو کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اُسے دق کرنے میں اُسے مزہ آتا تھا۔ لیکن اُس کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ جیتو کا کوئی نقصان ہو یا وہ اُسے کوئی جسمانی ایذا پہنچائے۔

جیتو دیوار کے پاس کھڑی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اور تارو اپنی گردن کھجا رہا تھا۔ اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ مگر وہ ہمدردی کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔ دو گھڑی بعد وہ باہر نکل آیا اور دروازہ بند کر کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تارو سرسوں کا عمدہ ساگ لیے صحن میں داخل ہوا۔ جیتو نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بھیگی بھیگی لانبی پلکوں کو دیکھ کر تارو کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اُس کو اپنی حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور ساگ کا گٹھا آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جیتو! اب تم گھر جاؤ۔ لو یہ ساگ۔''

جیتو پہلے ہی بھری پڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر ساگ لیا اور الٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ تمام ساگ بکھر کر زمین پر گر پڑا۔ اور دو چار پتے تارو کی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں پھنس کر رہ گئے۔ تارو منہ سے کچھ نہ بولا اور جھک کر ساگ کو چننا شروع کر دیا۔

جیتو جلدی سے باہر نکل آئی۔ تارو بھی ساگ لیے پیچھے لپکا۔ جیتو پانی کی نالی پھاندنے لگی، اس کا ایک پاؤں زمین میں دھنس گیا۔ کیوں کہ زمین نمی کی وجہ سے نرم ہو رہی تھی۔ اس نے پاؤں باہر کھینچ لیا۔ لیکن سلیپر پھنسا رہ گیا۔ تارو نے بڑھ کر جلدی سے سلیپر کھینچ لیا اور کہنے لگا۔ ''تم ٹھہرو میں ابھی دھوئے دیتا ہوں —''

نالی کے کنارے کپڑے دھونے کی سل پڑی تھی۔ جیتو اس پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی اور تارو پانی کی دھارا میں پہلے ساگ دھونے لگا۔ وہ اب کوئی صلح کی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ دھیمی آواز اور اپنی دانست میں بہت نرم لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

جیتو! یہ بھینس تو اب دو کوڑی کی نہیں رہی۔ تین سیر صرف تین سیر دودھ دیتی ہے۔ بھلا ایسی بھینس رکھنے سے فائدہ ؟ — ایک بھوری بھینس میری نظر میں ہے۔ کم

سے کم سولہ سیر دودھ دینے والی۔ دام زیادہ ہیں۔ مگر کچھ ہرج نہیں۔ مجھے بھینس رکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے ایک سو پچپن روپے جمع کیے ہیں۔ بڑی مشکل سے، بہت ہی مشکل سے۔ اُس بھینس کو ضرور خریدوں گا۔ ایسی مریل بھینس رکھنے سے کیا فائدہ؟ ایسی بھینس......"

تارو کو اپنی باتیں بالکل مہمل سی معلوم دے رہی تھیں۔ اُسے اتنا بھی حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ نظر اُٹھا کر جیتو کی طرف دیکھ لے۔ اس نے ساگ دھو کر ایک طرف رکھ دیا اور اب ٹوٹا ہوا سلیپر دھونے لگا۔ ایک بات اور سوجھی بولا۔ " اور ہاں تم دریامو کو تو جانتی ہی ہو۔ بہت ہی کھوٹا آدمی ہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ چنن کے کان اینٹھ رہا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کچھ ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ اس نے کھیت سے ایک خربوزہ چرایا تھا۔ میں نے چنن کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ بے چارا چڑیا کی طرح سہا ہوا تھا۔ اور پھر میں نے دودھپ دریامو کی گردن پر دیئے اور کہا کہ " تو اتنی سی بات پر لونڈے کو مارے ڈالتا ہے۔ خبردار! جو اسے کبھی ہاتھ بھی لگایا تو...... جانتا نہیں چنن کس کا بھائی ہے؟"

یہ کہہ کر تارو خاموش ہو گیا۔ اور اُس نے چپکے سے کنکھیوں سے جیتو کی طرف دیکھا۔ مگر وہ ابھی تک منہ پھلائے خاموشی سے اپنے کبوتروں کے سے سفید سفید پاؤں کو ٹھیکری سے رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ تارو اٹھا اور سلیپر اُس کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔ اور ساگ اُس کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ بے نیازی سے اٹھی اور اٹھلاتی ہوئی چل دی۔ وہ نزدیکی رستہ سے جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ کیوں کہ اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ رستہ خراب تھا۔ کھیتوں میں پانی بھرا تھا۔ اور مینڈھ بہت کم چوڑی تھی جیتو نے سلیپر ہاتھ میں لے کر بجائے مینڈھ کے، پانی میں سے ہو کر جانے کی ٹھانی۔ تارو جلدی سے آگے بڑھا اور اس کا بازو تھام کر بولا۔ " تم سلیپر پہن کر مینڈھ پر سے چلی چلو۔ کیوں کہ پانی کے اندر کانٹے دار جھاڑیاں...... میں تمہیں سہارا دیئے رہوں گا......"

جیتو نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور کہنے لگی۔ " تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم لوگ ہر کام بری نیت سے کرتے ہو۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب تم لوگوں کی اس

قسم کی حرکات چپکے سے برداشت نہ کروں گی۔"

یہ خراب نیت، کے الفاظ سن کر تارو نے اپنی صفائی کرنا چاہی۔ مگر جیتو چمک کر بولی۔" اور آج میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں کہ آیندہ مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ ہاتھ توڑ دوں گی۔"

تارو نے پہلے اس کے نرم و نازک ننھے منے ہاتھوں کو دیکھا پھر اپنے بھاری بھرکم، میلے کچیلے اور کھردرے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور تب اس کے لبوں پر تبسم پیدا ہوا۔

جیتو کو اس کی یہ حرکت دیکھ کر زہر سا چڑھ گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑاق سے سلیپر اس کے منہ پر دے مارا۔

"جیتو!" تارو معاً شیر کی طرح غصہ میں گرجا۔ لیکن پھر نا معلوم کیا سوچ کر خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر کے لیے دونوں طرف سکوت سا رہا۔ پھر جیتو بے پروائی سے شلوار اٹھا کر پانی میں چل دی۔ سلیپر کی ایک کیل تھوڑی باہر نکلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے تارو کی پیشانی پر خراش آگئی اور خون بہنے لگا۔ مگر وہ خون سے بے پروا جیتو کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں جو کانٹے دار جھاڑی ہوتی اُسے اپنے پھاوڑے کے ایک وار سے اُکھاڑ کر جیتو کا راستہ صاف کر دیتا۔ جب یہ پانی کا راستہ ختم ہوگیا تو تارو نے بڑھ کر کانٹے دار جھاڑی میں سے راستہ بنا دیا اور خود ٹھہر گیا۔ جیتو نے ایک لمحہ کے لیے اس کے خون سے تر کرتے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

تاریکی میں اُس نے گھر کا دروازہ کھولا۔

ایک طرف چراغ جل رہا تھا۔ باپو گنڈا سے سے جوار کاٹنے میں مشغول تھا۔ چمن قینچی سے کاغذ کے پھول بنانے میں مصروف تھا—!

جیتو اندر داخل ہوئی تو باپو نے ایک دفعہ سر اٹھایا۔ اور پھر جھک گیا۔ چمن نے ایک مرتبہ کہا "بہن آگئی" اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

اس نے کونے میں سے کپاس کی سوکھی چھڑیاں اٹھائیں اور اُنہیں توڑ کر چولھے میں رکھا اور اوپر اُپلے رکھ کر آگ جلائی، تب مٹی کی ہنڈیا میں ساگ پکنے کے لیے رکھ دیا۔

باپو آہستہ سے بولا۔ ''آج نمبردار اور سپاہی پھر آئے تھے۔''

وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ عالم خیال میں تاریکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اُن کی بربادی اور تباہی ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جگ ہنسائی اس کے علاوہ تھی۔ اُس نے سرد آہ بھر کر سر جھکا لیا اور کچھ بے چینی سے اٹھی اور آٹا لے کر تنور پر روٹی پکانے چلی گئی۔

روٹی کھاتے وقت باپو نے بتایا کہ سپاہی کہتا تھا کہ اگر پرسوں تک روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو گھر کی قرقی کرادی جائے گی۔

انسان پر مصیبت آتی ہے تو ایک نہیں بلکہ سینکڑوں مصائب پے در پے حملہ آور ہو کر انسان کو بے بس و لاچار بنا دیتے ہیں۔

آج گویا آخری دن تھا۔ باپو صبح سے باہر گیا ہوا دوپہر کو گھر واپس آیا، اُس کے اداس جُھرّیوں دار چہرے سے صاف عیاں تھا کہ روپے کا بندوبست نہ ہوسکا۔ جیتو کی ماں کا ایک سونے کا زیور بیچا تھا۔ کل بائیس روپے جمع ہوئے تھے۔ باقی ایک سو تیس کہاں سے آئیں گے۔ گھر کے مویشی بیچنے سے کچھ روپیہ مل سکتا تھا۔ مگر انہیں سے تو روزی تھی اگر وہ بک گئے تو گویا دال روٹی سے بھی گئے۔ جیتو دوپہر کا کام ختم کر کے گھر سے باہر تھوڑی دیر تک کھلی ہوا میں کھڑی رہی۔ نمبردار ابھی تک نہ آیا تھا۔ لیکن اُسے آنا ضرور تھا۔ اور کل؟ کل تمام دنیا ان کا تماشہ دیکھے گی۔

سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی اور آسمان پر چھا گئی۔

جیتو گوردوارے کی طرف چل دی۔ یہ چھوٹا سا گوردوارہ گاؤں سے کم وبیش تین

فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ عمارت پرانی تھی ۔ دو تین کوٹھریاں مسافروں کے واسطے بنی ہوئی تھیں ۔ اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔

گوردوارے کا کام ایک پرہیزگار اور پاک باز بزرگ کے سپرد تھا۔ جیتو کے باپو کی اُن سے گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ بزرگ جیتو کو سکھ گوروؤں کی پاک زندگی کے واقعات ان کی قربانی اور ایثار کی کہانیاں سنایا کرتے تھے جس سے جیتو کے دل کو گونہ تسلی ہوتی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ بزرگ دوسرے گاؤں میں کسی کام کی وجہ سے گئے ہیں۔ اس نے کنوئیں پر اشنان کیا۔ کتاب پاک کے آگے سر جھکایا اور بابا نانک کی درگاہ سے رو رو کر اس مصیبت کے ٹل جانے کی دعا کرتی رہی۔ پھر اُس نے چنبیلی کے پھول چُنے اور چمن کے لیے ہار گوندھنے لگی۔ کیوں کہ آج صبح اس نے اس سے ہار کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اتنے میں بارش شروع ہوگئی۔ خوب موسلا دھار ہوئی۔ آخر جب بارش بند ہوگئی اور وہ بزرگ نہ آئے تو جیتو نے ہار اپنے بالوں کے جوڑے سے لپیٹا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

بادل ابھی تک چھائے ہوئے تھے۔ روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ وہ ہنوز گھر سے کافی دور تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایک سپاہی اور گاؤں کا نمبردار اُن کے گھر سے باہر آ رہے ہیں۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اُس کے پاؤں شل ہوگئے۔ آخر کیا ہوا ہوگا؟ کل...... ہاں کل ڈھول پٹ جائے گا...... وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کی طرف جانے کی بجائے اور ہی کسی طرف چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے بوڑھے دادا کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ مگر اس کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ گھر جائے۔ وہ عجب پریشانی میں چلتی گئی نہ معلوم کتنی دور تک — آخر اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا اور وہ وہیں کھیت کے کنارے بیٹھ گئی۔

ہم دکھ سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا کہ دکھ کے تصور سے وہ جانتی تھی کہ اس تکلیف کا سامنا اُسے کرنا ہی پڑے گا۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ تاریکی چھا جائے اور وہ

اندھیرے میں سب کی نظروں سے بچ کر چپکے سے اپنے گھر میں چلی جائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی تصویر آ گئی۔ جہاں اُس نے بچپن سے اب تک اپنی زندگی کے دن گذارے تھے۔ اور اب وہ گھر غیروں کا ہونے والا تھا۔

تاریکیاں چھانے لگیں۔ آسمان پر اکا دکا تارا جھلملانے لگا۔ مویشی واپس گاؤں کو جا رہے تھے۔ جوہڑ کے کنارے پیلے پیلے مینڈک ٹرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ٹڈے اپنی تیز آواز سے بول رہے تھے۔ اور گدھ بیریوں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔

جیتو نے سر اٹھایا۔ سامنے دھندلکے میں تارو کا کچا مکان اور رہٹ نظر آ رہا تھا۔ آج تارو کا کنواں دیکھ کر جیتو پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔ پچھلا واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب کہ وہ ساگ لینے کے لیے گئی تھی۔ تارو کی بدمزاجی، اس کی چوڑی کا ٹوٹنا، تارو کا پچھتانا اور اُسے ساگ لاکر دینا، اس کا سلیپر دھونا پھر ہاتھ لگا دینا۔ تب سلیپر کھا کر بھی ضبط کرنا، اس کے راستے سے کانٹے صاف کرنا۔ اور اس کی پیشانی سے لہو کا بہنا سب اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ تارو میں ہزار عیب سہی مگر دل کا برا نہیں اور آج جب کہ اس کا دل اُمڈ آتا تھا وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی داستانِ غم سنے۔ اگر سننے والا ہمدردی کے کلمات بھی کہہ دے تو اس کے دل کو تسلی ہو جائے۔ مگر ایسا ہمدرد تھا کون ——؟

تارو کے کنوئیں پر اس وقت کیسا امن وسکون تھا۔ اس وقت رہٹ کی روں روں اور مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن نے کیا عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ شرینہہ کے بلند درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہرے بھرے کھیت میں سفید گھوڑی گھاس چر رہی تھی، گنوں کے کھیت کے پاس کتے کھیل رہے تھے۔ کبھی دم ہوا میں اٹھا کر عجب انداز سے چلتے کبھی غرّا کر ایک دوسرے پر لپکتے، اور پھر اکٹھے ہو کر نئے کھیل کھیلنے کی تجویزیں سوچنے لگتے۔

جیتو کو خواہ مخواہ یقین ہونے لگا کہ تارو اُس کا دکھڑا ضرور ہمدردی سے سنے گا۔

یہ سوچ کر اس طرح سے وقت بھی کٹ جائے گا اور اس کے دل کا بار بھی ہلکا ہو جائے گا۔ وہ کنوئیں کی طرف چل دی۔ مدار کے پیڑوں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ کنوئیں پر پہنچ گئی۔ ہری ہری گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ جیتو نے ادھر اُدھر تارو کو دیکھا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اور کچھ ٹھٹکی۔ ٹھٹک کر بڑھی اور آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے تارو نے کرخت اور تحکمانہ آواز میں پوچھا۔

جیتو خاموش رہی۔

"ارے بھئی کون ہے؟ چلے آؤ دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

جیتو نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

تارو اسے دیکھتے ہی اُچھل پڑا۔ "آؤ جیتو! تم کیسے رستہ بھول پڑیں؟"

اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ اس نے تارو کی طرف جو کہ پیڑھی پر بیٹھا گنا چوس رہا تھا دبی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "یوں ہی اِدھر آئی تھی۔ سوچا کہ ماں سے ملتی جاؤں۔"

"ماں ؟ ماں تو کنوئیں پر بہت کم آتی ہے۔ آتی بھی ہے تو دن کو ۔ اس وقت گھر پر ہی رہتی ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ تارو کی ماں کنوئیں پر نہیں رہتی، گاؤں میں رہتی ہے۔ بظاہر وہ واپس جانے کے لیے لوٹی تو تارو نے ڈرتے ڈرتے پیڑھی اپنے تلے سے نکال کر اُس کی طرف دھکیل دی اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "جیتو! اب آئی ہو تو بیٹھو...... اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو بیٹھو۔ ساگ لے جاؤ۔ چنن کے لیے گنے لیتی جانا۔ گنے بہت میٹھے ہیں۔"

جیتو پیڑھی لے کر تاریک کونے میں بیٹھ گئی۔ تارو شاید دل میں سمجھا ہوگا کہ ساگ اور گنوں کا داؤ چل گیا۔

تارو نے ٹاٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "آج تو بارش اچھی ہوگئی۔ ہوا مزے کی

چل رہی ہے...... کیا تم شربت پیوگی؟ بہت عمدہ گڑ رکھا ہے۔"

"نہیں، پیاس نہیں اس وقت۔"

"اچھا کچھ ہرج نہیں تم گڑ گھر لے جانا اور کل کو شربت بنا کر دیکھنا۔"

"اچھا۔"

"میں نے چنّن سے کہا تھا کہ گنّے لے جائے، مگر وہ آج تو آیا نہیں۔ اُسے یہاں بھیج دیا کرو۔ رستہ جانتا ہی ہے۔ رس (گنّوں کا) پی جایا کرے گا۔ اور یہ ہمارے پچھواڑے بیر لگے ہوئے ہیں، لال لال بہت میٹھے۔ میں اِدھر اُدھر کے چھوکروں کو توڑنے نہیں دیتا میں کہتا ہوں کہ چنّن آئے تو کھائے۔ آخر بچہ ہے نا، اُسے بیر بہت بھاتے ہیں۔ جب ہم تم چھوٹے تھے، یاد ہے نا، ہم بھی تو بیر کھانے جایا کرتے تھے۔"

"کیوں تارو! تمہارے گنّے تو خوب ہوئے ہیں اب کے۔" جیتو نے بات کا رخ بدل کر کہا۔

"ہاں سب 'واہگورو' اکال پرکھ، کی کرپا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"کہو تو باہر سے گنّا لا دوں۔"

"نہیں تارو میرا جی نہیں چاہتا۔"

اب پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی۔ تارو اُس کی خاموشی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ پھر بہت احتیاط سے کہنے لگا۔ "جیتو! ...... مجھے دراصل ڈر لگتا ہے کچھ کہتے ہوئے، کہیں تم خفا نہ ہوجاؤ...... آخر بتاؤ نا تم آج اس قدر خاموش کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے —؟"

یہ ہمدردی کا کلمہ سن کر جیتو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر تاریکی کی وجہ سے تارو انہیں دیکھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز کو چھپا نہ سکی۔ "نہیں تارو ...... تمہیں کیا بتاؤں......"

تارو کے چہرے پر سختی کے آثار پیدا ہوگئے۔ آنکھیں غصہ میں چمکنے لگیں۔ وہ کرخت آواز میں کڑک کر بولا۔ ''پھمن سنگھ نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟ بتا دو جیتو! وہ دیکھ سامنے کرپان لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے آج ہی تیز کی ہے۔ میں پھمن کی بابت تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ مگر اب اس کی موت دور نہیں۔ یہ کرپان اُسی کا خون پینے کے لیے رکھی ہے......''

''نہیں تارو'' جیتو ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''یہ بات نہیں۔ یہ بات بالکل نہیں...... میں بتاتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا نہیں...... اصل بات یہ ہے کہ......''

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ تارو چیتے کی طرح چوکنا ہوگیا اور اس کا ہاتھ فوراً پاس پڑی ہوئی کلہاڑی پر جاپڑا۔ جیتو نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیا میری بہن یہاں ہے؟'' چنن نے آہستہ سے دروازے میں سے سر نکال کر تارو سے پوچھا۔

تارو نے اطمینان کا سانس لیا اور کلہاڑی پیچھے کی طرف سرکا دی۔

'' چاند! آجاؤ میں یہاں ہوں۔''

چنن دوڑ کر آیا اور اپنی بہن کی گود میں چڑھ بیٹھا۔

'' ڈھونڈ لیا نا تمہیں؟ میں تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں پھر میں نے سوچا کہ بہن ضرور ہمارے لیے بیر لینے کے لیے تارو کے کنوئیں پر گئی ہوگی۔''

جیتو اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''کیوں رے! تجھے ڈر نہیں لگا۔ اندھیرے میں۔''

''نہیں۔''

تارو بولا۔ '' واہ! بھلا شیروں کے بچوں کو بھی کبھی ڈر لگا ہے۔''

چنن نے تارو کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ''اچھا تم نے کہا تھا کہ گنے دیں گے لاؤ اب؟...... میں تو بہت سے لوں گا۔''

''آؤ جتنے چاہو لے لو''

''اچھا، لاؤ دو۔'' یہ کہہ کر وہ گودی سے اُترنے لگا۔ مگر پھر رُک گیا۔'' ذرا ٹھہروا ایک بات ہے تمہیں نہیں بتائیں گے۔'' پھر بہن کے کان میں کہنے لگا۔'' بہن ہمیں ایک پیسہ دو۔ تم نے کہا تھا.....''

''گھر پر لینا۔''

چنّن شانوں کو ہلا کر ضد سے کہنے لگا۔'' نہیں ابھی دو۔''

'' تم بہت اچھے ہو چنّن۔'' جیتو نے چمکارتے ہوئے کہا۔'' اس وقت نہیں۔''

''تو تارو سے لے دو۔''

''اس کے پاس بھی نہیں ہے۔''

'' ہے کیوں نہیں..... آج جب تم باہر چلی گئی تھیں۔ تارو ہمارے گھر آیا اور باپو کو اس نے چھن چھن کر کے بہت سے روپے گن دیئے.....''

''چنّن!!'' جیتو حیرت سے بولی۔

لیکن چنّن اپنی ہی دھن میں تھا۔'' مگر میں تو کہتا ہوں کہ باپو نے بہت برا کیا۔ اُس نے شام کو سب روپیہ نمبردار کو دے دیا.....''

جیتو کی حیرانی کی حد نہ رہی'' مگر' یہ تم سے کس نے کہا؟''

'' کس نے کہا؟ چنّن چیخ کر بولا۔'' میں نے خود دیکھا۔ اچھا بتاؤ اب میں تارو سے پیسے لے لوں؟''

''تم نے خود دیکھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموشی سے ہوا میں تاکنے لگی۔ ایک بڑے طوفان اور آندھی کے بعد گویا یکا یک بادل پھٹ گئے، ہوا خاموش ہوگئی۔ اور ہر طرف بالکل امن و سکون ہوگیا۔ اس کے دماغ کی پریشانیاں دور ہوگئیں۔ اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ اس محویت کے عالم میں اُسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب چنّن نے تارو سے پیسہ لیا۔ اور کب وہ کنوئیں پر سے گنّے لینے کے لیے باہر دوڑ گیا۔

اور کب تارو اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھینس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس راحت آمیز محویت میں جیتو کو تارو کا خیال آیا، وہی دنیا میں اُس کا سچا ہمدرد تھا۔ کس قدر نیک۔ اتنی دیر باتیں کرنے کے باوجود اس نے اُن روپوں کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ وہ روپے اُس نے کس قدر مصیبتوں سے جمع کیے تھے۔ مگر اس نے اپنی ذاتی خواہش پر اس کی ضرورت کو ترجیح دی۔

تارو کا خیال آتے ہی اُس کی صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی جب اس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ہر کام خراب نیت سے کرتا ہے، یہ کیسے بے معنی اور خودغرضانہ الفاظ تھے۔ وہ اس کی زخمی پیشانی، وہ بہتا ہوا خون۔ وہ اس کا ضبط و تحمل جیتو چونکی اور اُس کی آنکھیں تارو کو ڈھونڈنے لگیں جو کہ اس کی طرف پشت کیے بھینس کے پاس کھڑا تھا۔ جیتو اس کے پاس جا کر آہستہ سے بولی۔ ''تارو!''

وہ خاموش رہا۔

''میری طرف دیکھو تارو۔''

تارو نے دیکھا کہ جیتو کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

وہ اپنی بھاری آواز میں بولا۔'' روتی کیوں ہو جیتو میں تو ہر وقت اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ تمہارے کام آسکوں، مجھے اُس دن کا اپنی حرکت پر بہت افسوس ہے۔''

جیتو نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ دیا جس جگہ کہ اس کے کمبخت ہاتھوں نے سلیپر مارا تھا۔ پھر دھیرے سے کہنے لگی:

''تارو اب میں جاتی ہوں۔ میں پھر آؤں گی، اب تم آرام کرو، ہاں میں پھر آؤں گی۔

یہ کہہ کر وہ واپس پیڑھی کے پاس آئی اور سلیپر پہن کر لوٹی تو دیکھا کہ تارو راستہ روکے دروازے کے آگے کھڑا ہے۔ وہ مسکرا کر اپنے کرخت لہجہ میں بولا۔'' جیتو! آج پھر میری نیت خراب ہو رہی ہے۔ آج پھر سزا دے دو۔''

جیتو نے جھینپ کر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ تارو پر ڈالی پھر جسم چراتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی، اپنے جوڑے سے چنبیلی کا ہار کھولا اور کچھ مسکرا کر اور کچھ لجا کر وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔

تارو نے راستے سے ہٹ کر دروازہ کھول دیا۔

آگے چنن گنے لیے بھاگا آرہا تھا۔ جیتو نے گنے تھام لیے اور اُسے گود میں اٹھا لیا گوبر اور کیچڑ سے پاؤں بچاتی ہوئی چل دی۔ چنن اس کے گلے کے گرد باہیں حمائل کر کے کہنے لگا۔ ''بہن' تارو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہیں کیسا لگتا ہے۔''

جیتو دل ہی دل میں شرما گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی سن تو نہیں رہا، جواب دیا۔ ''ہاں چنن! تارو مجھے بھی...... تارو بہت اچھا آدمی ہے۔''

جیتو کو اب بھی تارو کے گانے کی بھاری اور بے سری آواز سنائی دے رہی تھی۔

نِکا گھڑا چک لچھیے! تیرے لک نوں جرب نہ آوے
نِکا گھڑا چک لچھیے!

یہ افسانہ ماہنامہ 'ساقی دہلی' اگست 1938 میں پہلی بار شائع ہوا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''جگا'' مطبوعہ 1944 میں شامل ہے۔

دیش بھگت

شام ہوچکی تھی۔ میں چھوٹے بھائی کو چٹھی لکھ رہا تھا کہ اتنے میں چچا اندر داخل ہوئے بغیر کسی تمہید کے بولے۔ ''سنو! آج ذرا خاص کام ہے۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

'خاص کام' والے الفاظ سن کر میں نے سرہانے سے صفا جنگ[1] اٹھائی اور اسے فرش پر ٹیک اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسلمانوں کا محلہ ہے...... میاں لوگوں کا، سمجھے؟ ...... اور پھر روپے کا معاملہ[2]......''

میری ان سے کوئی رشتہ داری نہ تھی، بس ہمارے گاؤں کے رہنے والے، والد صاحب سے بھی کچھ دعا سلام تھی۔ مجھ پر مہربان تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔ میری عمر تقریباً بائیس برس کی تھی، قد ذرا نکلتا ہوا، چوڑا سینہ، سڈول بازو، مضبوط ہاتھ پاؤں، باوجود چار مرتبہ کوشش کرنے کے بھی ایف اے پاس نہ کرپایا تھا۔ چچا کا میانہ قد، گندمی رنگ، کھچڑی داڑھی، دبلے پتلے مگر سخت ہڈی کے تقریباً پینتالیس سالہ بزرگ۔ انہیں پنجاب چھوڑے تین سال ہوچکے تھے۔ اس جگہ ان کا ایک اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ تھوڑا بہت ٹھیکے داری کا کام بھی مل جاتا تھا۔

غبار اور دھند کے گہرے کفن نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا، بازاروں میں کان پڑی

---

1. ایک قسم کی کلہاڑی۔ سکھوں کا ایک ہتھیار۔

2. یہ ان کا بہت فرسودہ اور بے معنی بہانہ تھا۔

آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یکہ والوں کے آوازے ان کی گالیاں، اور قوالیاں — دور دھندلکے میں مسجد کے قریب، کسی گھر کی چھت پر سفید سفید کبوتروں کی ٹکڑیاں ہوا میں پرواز کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم گھنٹہ کے قریب سے ہوکر بیگم سرائے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

نکڑ پر بادشاہ خاں پٹھان کی چائے کی دکان تھی، اس جگہ سود خوار پٹھانوں کا اجتماع ہوتا تھا، بیٹھے چائے پیتے یا قہوہ اڑاتے، دوتین بے بال و پر چھوکرے، آگ جلانے پیالیاں دھونے، چائے بنانے اور پھر گاہکوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور کبھی ریکارڈ بجتے:

لڑم دے لڑم

وہ مورے رادو کا لڑم دے لڑم

کبھی کوئی خان اپنی شلوار اوپر چڑھا، ٹانگیں رانوں تک ننگی کر، کسی ہندوستانی موچی سے جھڑکنے لگتا۔ اور کہتا:

''امرا کابل میں چپل اوتا، تمرا دیس میں چپلی''

یا پھر پہلو والی ''گرم گرم قلیہ پراٹھا'' کی دکان پر شاہ صاحب، ایک بزرگ سبز پوش، داڑھی مہندی سے سرخ کیے آن بیٹھتے۔ آنکھیں جلالِ معرفت کے مارے خونِ کبوتر چہرہ کندن کی طرح تاباں، زلفیں چکنی چپڑی اور عطر بیز ...... ان کے تشریف آور ہوتے ہی عقیدت مندوں کے غول کے غول جمع ہونا شروع ہوجاتے، مجّن (مظہر) شہر کے بے تاج بادشاہ، جمن رنگ ساز، قمر جلد ساز، اور للو مالک۔

''جاتے کہاں ہو کس طرف خیال ہے

گھڑیوں کا بس یہی اسپتال ہے''

وغیرہ جیسی ہستیاں آن اکٹھی ہوتیں، گراموفون کو چابی دے کر ملکہ عالم کا ریکارڈ چڑھا دیا جاتا اور سب لوگ تالیوں کے ساتھ، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو'' گانے لگتے۔

اس طرح پیسہ اخبار والا چلاتا۔ ''ہٹلر کی پیش قدمی — برطانیہ کا دنداں شکن جواب ...... جاپان کی برطانیہ کو گیدڑ بھبکی — ایک پیسہ میں۔''

یہ سن کر وہ بزرگ سبز پوش سر کو زور کے ساتھ گردش دے کر نعرہ لگاتے ''یا علی'' اور پھر وہی ''اللہ ہو، اللہ ہو۔''

ادھر یہ ہنگامہ تو ادھر کھجلی کے مارے ہوئے کتے شامی کبابوں کی بو پا کر تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر ہوا میں سونگھا کرتے اور کبھی موقع پا کر کچھ نہ کچھ لے بھی اڑتے تھے۔

کچھ دور جانے کے بعد چچا مہگی پنواڑن کی دکان کے آگے جا کر رک گئے۔ مہگی کی عمر بتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بدن کی بھاری، گورا رنگ، ناز و ادا کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل، ہونٹوں پر مسی کی دھڑی، پان کا بیڑا بڑھاتی تو اپنی نشیلی اور کٹیلی آنکھیں پہلے تو گاہک کی آنکھوں سے لڑا دیتی تب شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیتی، اور پنڈلیوں کو دھوتی سے ڈھانپ کر اپنی چاندی کی پازیبوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

میلے کچیلے چیتھڑے پہننے والے مزدور، ڈاک خانہ کے قریب بیٹھنے والے خطوط نویس منشی یا ہوٹلوں کے گائڈ نشہ کی ترنگ میں آتے اور اسے دیکھ کر مچل جاتے۔ اپنی اندر دھنسی ہوئی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھتے۔ کبھی اتنا کہنے کے لیے ''ہائے ری آج تو غضب کا بناؤ سنگھار کر رکھا ہے'' کبھی کسی کجری کا بول از قسم۔

''گھر سے نکسی نند بھو جیا
جلم دونوں جوڑی رے، سانوریا''

اور کبھی پان لیتے وقت اس کی ہتھیلی کو اپنی انگلی سے کھجا دینے کی تمنا میں ایک پیسہ کے پان اور ایک پیسے کی چار والی پری مارکہ سگریٹ خرید لیتے تھے۔

چچا کو دیکھتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ ''ارے پنجابی بابو! کون دیس رہت ہو اَب۔''

''مہکی بس کیا پوچھو ہو، تم ہمن کو بھولت نا نہہ۔''

''مہکی سر پر آنچل کھینچ سنبھل کر ہو بیٹھی اور پان لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اور وہ میرے لیے تم چندری لان کو کہت رہے۔''

چچا سنی اَن سنی کر کے اس کے لال لال گالوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولے۔ ''اب لاؤ دیوگی بھی، نہیں!''

مہکی کچھ لجا گئی، اور ملامت آمیز نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں اور گاہک بھی آ گئے۔ میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بائیں طرف برآمدے میں ایک بڑھیا کسی چالاک لومڑی کی طرح سب کو تاڑ رہی تھی، اس کے قریب ہی ٹاٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ جس میں سوائے اس کے کہ جوان تھی، اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نوجوان عورت نے مجمع کے آدمیوں کو اپنی طرف چھپی نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو جھٹ سے قمیص کے بٹن کھول، گریبان الٹ الٹ کر لالٹین کی روشنی میں کھٹمل پکڑنے لگی۔ اور گاہے ساڑی ہٹا کر اپنی ٹانگیں کھجانے لگتی۔

کچی اور سیاہ دیواروں پر پان کی پیک کے نشانات ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے بھوت ناچ رہے ہوں۔ کمرے کے اندر جاپانی عورتوں کی نیم عریاں، پھٹی پرانی تصویریں نظر آ رہی تھیں ایک طرف کھاٹ پر بستر بچھا ہوا تھا، اور اس کے پاس ہی فرش پر ایک مٹیالے رنگ کا اُگالدان بھی پڑا تھا۔

ایک مرد نے نوجوان عورت کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کچھ پوچھا۔ تو بڑھیا نے تاریکی میں آگے جھک کر حلق میں سے آواز نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''آٹھ آنے——''

تاریک اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی گلی کے نکڑ پر سرکاری لیمپ کی دھندلی روشنی میں صفا جنگ کی چمک اور میری

گھیرے دار شلوار سے خائف ہو کر بچے گھروں میں گھس کواڑ بند کر لیتے تھے۔

کمہاروں کے محلے کے قریب پہنچ کر چچا گندے نالے کی طرف چل دیئے۔ راستہ گھوڑوں اور گدھوں کی لید سے اٹا پڑا تھا۔ چھپروں والے ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات تھے۔ کمہاروں کی بھاری بھرکم عورتیں چبوتروں پر لیٹی، روتے ہوئے ننھے بچوں کو دودھ پلا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گندے نالے کے پل پر سے گزرتے ہوئے میں نے ناک پگڑی کے شملے سے ڈھانپ لی۔ اس کے بعد ہم بڑے تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہاں شہر بھر کی گندگی جمع تھی۔ لوگ ٹٹی بھی یہیں پھرتے تھے۔ جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو بھنگیوں کے محلہ سے سور آ کر منہ مارنے لگتے، کہیں کہیں کتے دم توڑتے نظر آتے تھے۔ کہیں کسی گدھے کا پنجر پڑا تھا اور کسی طرف گھوڑے کے جبڑے کے پاس کوئی گدھ مرا پڑا تھا۔ یہ کچا تالاب بہت بڑا تھا۔ اس کے اندر کئی انسانوں اور جانوروں کا پیشاب اور غلاظت جمع تھی۔ اس کا پانی بہت گاڑھا، از حد بدبودار اور سیاہ رنگ کا تھا۔ چاند کی چاندنی اس کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ اس کی سطح پر ابھرے ہوئے بلبلے اس طرح دکھائی دیتے تھے۔ جیسے کسی شخص کے جسم پر آتشک کے زخم۔

یہاں سے گزر کر بہت دیر تک ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر کار چچا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے رکے اور آوازیں دینے لگے۔ ''مجید! او مجیدے!!''

میں نے کہا۔ ''چچا آپ نے فضول میں اتنا بڑا چکر لگایا، یہ گلی وہی نہیں جو اسٹیشن سے آنے والی سڑک سے جا ملتی ہے۔''

چچا دیدے چمکا کر بولے۔ ''ارے میاں! اُدھر جاتے تو بھلا یہ سیر کیسے ہوتی، بس تم بھوند وہی رہے ...... ہی ہی ادھر کیا رکھا تھا ...... ہی ہی ...... ارے او مجیدے او۔''

''ہجور گلام تو ادھر کھڑا ہے۔''

میں نے گھوم کر دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا، چوڑے شانوں والا مرد جھکا فرشی سلام

کر رہا ہے۔ باوجود سردی کے ایک میلا کچیلا تہبند کمر سے لپیٹے ہوئے تھا۔ اور جسم پر صرف ایک چادر۔

''آیئے آیئے آکا! اندر چلے آیئے۔''

یہ کہہ کر اس نے ٹاٹ کا گلا سڑا پردہ اٹھایا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔

''گران کسم (بہن کی گالی دے کر) سالوں نے جینا مسکل کردیا ہے۔ یاہ پولس بھی بس کھدا کی پنا ہے۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن کے کونے میں ایک پائخانہ، پاس ہی لکڑیوں کا انبا، گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواروں پر اپلے، ایک طرف کھٹملوں سے بھرپور ٹوٹی ہوئی کھاٹ ادھر چولہے کے قریب مٹی کے تیل کی کپی، اس کی چھوٹی سی لو بے پناہ تاریکی سے جنگ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ چولہے کے قریب ایک بڑھیا اینٹ پر بیٹھی ایک باسی روٹی توڑ توڑ کر کھا رہی تھی، ہاتھ میں پیاز اور فرش پر چٹنی کا پتہ۔

مجید چچا کو بتا رہا تھا کہ کیسے ان کے محلے میں کسی نے ایک ہندو پر لاٹھی چلا دی جس سے اس کا سر تو بچ گیا مگر ایک کان صاف اڑ گیا۔ اور کسی طرح وہ چیختا چلاتا محلّہ کے ناکے کی طرف بھاگا، اور پھر ناکے کے صحن میں بے ہوش ہوکر گر پڑا تھا۔ اور کیسے پولیس اس کو (مجید کو) ناحق دو گھنٹہ سے کوتوالی میں بٹھائے دق کر رہی تھی، اور اب کہیں جاکر اس کی خلاصی ہوئی تھی۔ چچا یہ باتیں سن کر کچھ پریشان ہوگئے۔

مجید چولہے کی طرف گیا، پتہ میں سے انگلی پر چٹنی لگاکر چاٹی، اور چٹخارہ لے کر بولا۔ ''کاہے کی ہے؟''

''پیاج کی۔''

پھر وہ چھت سے لٹکی ہوئی ہنڈیا میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ ''تنبا کو کاں ہے؟''

پوپلے منہ والی بڑھیا بولی۔ ''بوتبے کے پیچھے۔''

مجید حقہ پینے لگا۔ چچا کی جانب دیکھ کر بڑھیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ماں ہے میری۔''

اتنے میں پردہ اٹھا۔ ایک کالے کلوٹے مرد نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ''کو مجید کھاں! پولیس میں کا ہوا؟''

چچا اس کی صورت دیکھ کر گھبرائے، اس کا سر استرے سے منڈا ہوا، یہ موٹی گردن، ٹوٹے ہوئے کان، چوڑے نتھنے ......

چچا نے میرا ہاتھ دبایا۔

''بتلائیں گے، یہ کہہ کر مجید اٹھا اور اس کے پاس جا کر کانا پھوسی کرنے لگا، خیر وہ شخص تو چلا گیا اور مجید پھر آ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔

چچا نے پیشانی سے پسینہ پونچھا، کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''اچھا بھئی مجید اب کچھ معاملہ کی بات ہونی چاہیے۔''

''ہاں ہاں۔'' مجید نے سر گھما کر کہا۔ پھر بڑھیا کی طرف جھکا۔ ''کیوں ماں! (آنکھ مار کر) پکھانے گئی کیا؟''

بڑھیا نے دبی زبان میں کچھ جواب دیا۔

''دھت تری کی ماں! تو بھی عجب اول جلول ہے۔''

اس نے حقہ رکھ دیا اور ''ابھی آیا۔'' کہہ کر جانے لگا۔

چچا گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''مجید! ہم باہر سڑک پر کھڑے ہوتے ہیں، تم اسے ادھر ہی لے آنا۔''

''کسم اللہ پاک کی، پنجابی بابو جدھر حکم ہو لے آؤں۔''

''اچھا تو ہم سڑک پر کھڑے ہیں۔''

یہ کہہ کر چچا بھاگم بھاگ سڑک پر آ کھڑے ہوئے۔ اور اسٹیشن سے آنے والے یکوں کو دیکھنے لگے۔

چچا، مجید، ایک نوجوان لڑکی، بڑھیا اور میں، کل پانچ اشخاص ایک تواریخی باغ کی چار دیواری کے پاس کھڑے تھے۔

مجید نے کچھ طویل بیان شروع کر رکھا تھا، اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے چچا سے کہہ رہا تھا ...... ''روج پوجا کرن جات رہی ...... میں نے سمجھایا، پگلی پوجا سے کا ملی؟ چل پنجابی سنگ سادی کرا دوں گا، بس پنجاب دیس جا، گہنا کپڑا پہن، کھانا پینا مجا اڑانا ...... بس ایسی دھپل پھانس کر لایا ہوں، پنجابی سردار! لونڈیا کا ہے ہیرا سمجھو ...... گریب ہیں کوئلوں میں رکھا ...... تمرے پاس جاکر چمک بڑھوا ہی کرے گی۔''

لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ یا چودہ برس کی ہوگی۔ گندمی رنگ، ناک چوڑی، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، بڑی بڑی زرد آنکھیں، بال خشک بدبودار، ہاتھوں اور کلائیوں پر میل، دبلی پتلی، سہمی ہوئی کبوتری کی طرح ایک میلی سی پھول دار چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

چچا لڑکی کو لے کر چند قدم آگے نیم کے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے ۔ تھوڑی دیر خاموشی سی طاری رہی، پھر چچا کی دبی دبی باتوں کی آواز آنے لگی۔ ''...... کیا نام؟ ...... بتاؤ نا! ...... ارے بتاؤ ...... ہوں؟ کیا کہا؟ اچھا ...... اچھا۔ واہ! خوب نام ہے ...... ہاں! ہاں! سردی لگتی ہے؟ ہاں لگتی ہوگی ...... بولونا! تم تو کچھ بھی نہیں کہتیں ...... منہ کیوں چھپاتی ہو ...... ارے رے روتی ہو؟ ...... اچھا جانے دو ...... روتی کیوں ہو ...... لو نہ سہی ...... او...... اوہ ...... اوہو ...... ارے نہیں ......۔''

''تم کا کرت ہو، چھوٹے پنجابی؟'' مجید نے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

''پڑھتا ہوں۔''

''پڑھت ہو؟ ...... ہو ہو ہو ...... ہی ہی ...... بابو ہوجاؤ گے۔'' چچا اور لڑکی واپس آ گئے۔

مجید نے مجسم سوال بن کر چچا کی طرف دیکھا۔ چچا بولے۔ ''ابھی جھینپتی ہے ......''

مجید نے لڑکی کی ٹھوڑی اٹھا کر کہا۔ ''اری چھرماتی کیوں ہے، سونے کے کنگن ملیں گے ...... چندریا ملے گی ......''

لڑکی نے زرد زرد آنکھوں سے مجید کی طرف دیکھا ...... اور پھر لمبی اور گہری سسکی بھر کر خاموش ہوگئی۔

بڑھیا اور لڑکی کو واپس گھر کی طرف روانہ کردیا گیا، اور ہم تینوں تاڑی خانہ پہنچے۔

یہ چچا کے رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمیں تین لوہے کی کرسیاں اور تین ٹانگ کی ایک میز مل گئی۔

تاڑی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے جہاں دیوار پر ایک ''گندی بیماریوں کا شرطیہ علاج۔'' نمایاں حروف میں رقم تھا ایک چاٹ والے کی دکان تھی۔ مزدور لوگ تاڑی کے نشہ میں مست، وہاں بیگن کے پکوڑے دہی ڈلوا ڈلوا کر کھا رہے تھے۔ دیوار کے سایہ میں ایک گونگی بھکارن بیٹھی تھی۔ اس کی صورت مکروہ تھی۔ اور جسم پر ٹاٹ کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے، جب کوئی شخص دہی آلود پتہ نالی کی طرف پھینکتا تو دبلے پتلے کتوں اور اس گونگی بھکارن کے درمیان پتہ حاصل کرنے کی کشمکش مزدور لوگوں کی مسرت کا سامان بہم پہنچاتی تھی، وہ خوش ہوتے تھے کہ دنیا میں کسی کی بے بضاعتی پر وہ ہنس سکتے ہیں۔ وہ وحشیانہ انداز سے دانت نکال نکال کر قہقہے لگاتے اور اچھل اچھل کر اپنے چوتڑ پیٹتے تھے۔

مجید دو آبخوروں میں تاڑی اور ایک مٹی کی چینی میں بھنی ہوئی کلیجی لایا۔ تاڑی فروش نے ایک صراحی تاڑی سے بھر کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ اب دونوں تاڑی پینے لگے۔

لالٹین کی دھندلی روشنی میں عجب عجب لوگ نظر آرہے تھے، نشہ میں چور واہی تباہی بک رہے تھے، کہیں ٹوٹے ہوئے آبخورے کہیں کوئی چچوڑی ہوئی ہڈی پڑی تھی —

اور کسی طرف کوئی کتا نشہ میں بے ہوش شرابی کا منہ چاٹ رہا تھا۔

چچا نے دوبارہ آبخورہ بھر کر کہا۔ ''لیکن اس کی ٹانگیں بہت پتلی ہیں ...... کمزور ہے بے چاری ......''

''ابی عمر ہی کا ہے۔''

بہت دیر تک دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی۔ پھر مجید بلند آواز میں بول اٹھا۔ ''ارے یابی حاجر...... اور حکم کے گلام ہیں ...... وہ وہ مٹھائی کھلاؤں گا جو ایک باری یاد بھی کرو تم۔''

مگر جو بات ہم نے کہی وہ بھولنا نہیں۔''

''ارے نہیں صاحب! جب کہو تبھی ہو جائے جسن ...... ٹھکر کا ہے۔''

اتنے میں ہم ایک شرابی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''ارے کوئی ہمری بھی سنو۔ دیکھو یہ لونڈا......''

''اماں جا'' ایک اور بھاری بھرکم پہلوان نے اس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہا...... اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں تاڑی سے لبریز آبخورہ لے کر اٹھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ — اس نے چھلکتا ہوا آبخورہ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دیب داس ہوں ...... دیب داس!...... (زور سے کھانس کر) دکھ کے ...... دُکھ کے ...... ہا...... ہا!! دکھ کے اب دن......''

اتنے میں نائی کا لونڈا پہلے شرابی سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا — پہلوان نے زور کی لات اس شخص کے رسید کی۔ ''ابے او...... آ...... ادھر آ...... چلا آ...... ہاں بیٹے ...... ہاں، توبہ کر...... ہاتھ جوڑ...... دعا مانگ۔ دیکھ جیسے میں مانگتا ہوں۔

''یا الاہی! دے لگائی...... اور وَعو عو عو دو۔''

معاً اس کا تہبند کھل کر زمین پر آ رہا، اس کے منہ سے قے کا فوارہ نکل پڑا...... اور اس کی استرے سے منڈی ہوئی ٹانگوں پر قے کا مینہ برس گیا۔

تین چار دن کے بعد — میں سنیما دیکھنے کے بعد دس بجے کے قریب گھر جا رہا تھا، سوچا، چلو تھوڑی دیر چچا سے گپ رہے۔

چچا ایک بھوجنالیہ میں سب سے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ میں رہتے تھے۔

اوپر پہنچا۔ مگر دروازے کے پاس جا کر میں ٹھٹک گیا، اندر سے کچھ باتوں کی بھنک سنائی دے رہی تھی۔

میں نے چپکے سے درار میں سے جھانکا، دیکھا کہ وہی لڑکی کھڑی تھی۔ چچا اس کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، مجید نے آگے جھک کر کہا۔ ''دیکھ بوت حرمجد گی کرے گی تو حلال کر کے پھینک دوں گا......''

لڑکی نے انتہائی کرب کی حالت میں تڑپ کر خود کو آزاد کیا اور دروازے کی طرف لپکی۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ مگر مارے دہشت کے اس کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔

چچا بڑے جوش و خروش کے ساتھ جھپٹے، انہوں نے اس کو دبوچا، اور پلنگ پر پٹخ دیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی نے جدوجہد بند کر دی......

مجید نہائیت اطمینان کے ساتھ گورونانک صاحب کی تصویر کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اور تصویر کو احترام کی نظروں سے دیکھنے میں مگن تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ چل کر اسٹیشن کے بک اسٹال سے کوئی رسالہ وغیرہ خریدا جائے۔

جب بھوجنالیہ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ چچا سیڑھیوں پر سے اُتر رہے ہیں۔ مجھے اشارے سے بلایا اور پوچھنے لگے کہ بھائی اتنے دن کہاں رہے، دکھائی نہیں دیئے۔

سیڑھیوں کے پاس ہی پنڈت جی کی دکان تھی۔ پنڈت جی پان بھی بناتے اور لسی بھی بیچتے تھے۔ چچا کو دیکھتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھ (کہنیوں تک) جوڑ کر کہا۔ ''جے واگورو جی کی۔''

کہیے پنڈت جی، چت پرسن ہے نا؟''

چچا اس وقت اکالیوں والی پگڑی باندھے تھے۔ کھدر کا لمبا کرتا، گلے میں پیلی رنگ کی صافی اور پھر کرپان......

''سردار جی آج تو بہت دیر سے اُترے۔'' پنڈت جی نے سوال کیا۔

چچاؔ نے نہایت متانت سے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''پنڈت جی! آج سکھ منی صاحب کا پاٹھ کرتے ہوئے دیر ہوگئی۔

اتنے میں کچھ اور لوگ بھی آگئے، چچا اور پنڈت جی دونوں نے ایک بھکارن کو دھتکارا۔ پنڈت جی بولے ''ماپھ کر ماپھ کر...... حرامجادی...... نکھرے مت دکھا...... بہت دیکھے۔''

عورت ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پنڈت جی نے مونچھوں کو ہٹا کر گنگا جل کی لٹیا منہ سے لگالی۔ اور پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ ''جب بھگانیوں نے بھارت ورش پر حملہ کیا تو یہی لوگ تھے جنہوں نے ان کا مکابلہ کیا، ابلاؤں کی رکشا کی، بہت پراپکاری لوگ ہیں یہ۔''

چچا نے اپنے دبلے پتلے کمزور کاندھوں کو حرکت دی۔ اور پھر اپنی نوانچ تلوار کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ''پیڑے ہیں پنڈت جی؟ دو گلاس لسی......''

''چچا میں تو لسی پی کر آرہا ہوں، مجھے اجازت دیجئے۔'' میں نے کہا۔

اسٹیشن پر جاکر دیکھا تو اس قدر بھیڑ تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پلیٹ فارم تک پہنچنا ناممکن ہوگیا۔ لہٰذا باہر سے ہی تماشہ دیکھتا رہا، ایک شخص نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔ ''بولو راشٹرپتی پنڈت جواہر لال کی جے!''

ساری مخلوق نے گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ ''راشٹرپتی جواہر لال کی جے! مہاتما گاندھی کی جے!! بھارت ماتا کی جے!!!''

اور جب جواہر لال جی بگھی پر آکر بیٹھ گئے۔ تو اتنے میں چچا ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار لیے نمودار ہوئے انہوں نے متعدد بار پرنام کرنے کے بعد ہار پنڈت جی کے گلے میں پہنا دیا۔

''مجید کھاں۔'' بھی کھدر کا کرتا پہنے کانگریسی رضا کار کی حیثیت سے ادھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

یکا یک ہٹو، بچو، بڑھو، جے رام جی کی، رام رام، راشٹر پتی ہاں ہاں، نہیں نہیں کا شور بلند ہوا۔ اور جلوس شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سب لوگ حب قومی کے جوش میں نہایت عقیدت مندانہ انداز سے گا رہے تھے۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا ....

چچا کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔

جب جلوس مجید کے محلّہ کے پاس پہنچا تو سڑک کے کنارے بھیڑ میں مجھے وہی میلی کچیلی لڑکی دکھائی دی۔ وہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جھنڈا اونچا رکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی، وہی گرد آلودہ بال، سہمی ہوئی بے زبان صورت، زرد زرد آنکھیں۔

معاً گلی میں سے ایک کتا نکلا اور مجید کو دیکھ کر بے طرح بھونکنے لگا۔ وہ بھاگ کر بھیڑ میں گھس گیا۔

ایک ہوا کے جھونکے سے اس کوچے کی خاک اڑی اور چچا کی چکنی داڑھی گرد سے اَٹ گئی۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' نومبر 1940 میں شائع ہوا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ 'جگا' میں شامل ہے۔

جگّا

ماجھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات عجیب تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی۔ جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پر رومان ہوتی کہ سسّی پنوں، سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہوجاتے تھے — اور اب کے قرعہ گور نام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہل چل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کے مانند تھی، چینی کی مورت۔ چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پر شباب دوشیزہ کی پرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پرسکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے، ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کردیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گورنام اس سے محبت کرتی

ہے— ایک مرتبہ تو شدگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شدگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا[1] بلا دیا۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شدگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ ''تو نے بکرا کیوں بلایا ہے۔''

شدگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلے پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا— آخر کہاں تک؟ ایک خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹخنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شدگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جان تو بچ گئی۔ مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی۔ چاند جوبن پر تھا۔ گاؤں پر ایک پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں[2] کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا درخت جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بلیوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں۔ جی چاہتا چل دیتے جی چاہتا ٹھہر جاتے۔ اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آ کر رکا۔ اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں

1۔ کسی کی تضحیک کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کے بھق بھق کی آواز نکالنا

2۔ کوڑے کا ڈھیر

چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں۔ مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو۔ جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا۔ گریبان کا تسمہ کھلا ہوا اور اس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی[1]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے۔ اس نے جوتے اتارے تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے[2] کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا جھال کے نیچے کیا۔ اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہوگئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دہانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دلنشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اُولُو[3] سے باہر نکالا اور اُسے جھٹک کر جوتا پہن لیا پھر

---

1. ایک تیز خمدار ہتھیار جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے۔
2. آہنی کڑا جو کہ سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں۔
3. جہاں پانی گرتا ہے۔

اُس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پَر پڑے تھے، کھڑا ہوگیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی' جس پر اپلے رکھے تھے' جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرادیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جاکر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آرہے ہوں — لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اُس نے اُسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا، مگر اُس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اُس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا، مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا
"تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں' یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اُسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا، اُس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا ، مرد نے اُسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا، "تو کون ہے ؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے، اس نے اپنی حنائی اُنگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔" میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔" تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پرآب ہوگئیں۔ بولی" گرنام۔"

" تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

" میری ماں ہے، بے بے[1]، ویر[2]، چاچا[3]، باپو[4] سب ہی رہتے ہیں۔"

---

1 ماں 2 بھائی 3 باپ 4 دادا

'' مجھے اپنے گھر لے چل'' مرد نے اُس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

'' مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اُس نے اپنی دُلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔'' کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟''

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔'' لیکن مجھے تجھ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔''

''کیوں؟'' مرد نے اجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔'' تم ہنستے کیوں نہیں؟''

''ارے یہ بات؟'' یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے، اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[1] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا اس کی مٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا، اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا۔'' واگورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!''

'' واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!''

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔''میں دور سے آرہا ہوں' رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔''

1۔ نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے ششں و پنج میں ڈالے ہوئے تھی، خیر اس نے رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ہر طرح سے خدمت کے...''

پیش تر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا۔ مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی[1] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھُس اور کھلی کی سانی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے۔ ایک طرف خراس[2]، دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، یہ بڑے بڑے اپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔ تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

---

1 ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔ 2 بیلوں کے ذریعہ چلنے والی چکی۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی— اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں[1] کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں، اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں، اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا، گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟''

گرنام حسب معمول اپنے دل فریب طفلانہ انداز سے مسکرائی، اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ ''سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔''

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا، شریہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر بیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کی مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

باگے وچ کیلا ای
نکل کے مل بالو!
ساڈے ونجھنے واویلا ای
نکل کے مل بالو!

---

1 بیر کی مانند ایک پھل۔

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی۔ مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو— میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مارڈالتے ہیں۔ یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آرہا ہو۔

''مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔''

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہوکر کہنے لگی۔ ''تم بہت اچھے ہو— یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہوگے نا؟''

''ہاں۔''

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

''مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔''

''اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟''

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں۔''

گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ ''ہاں تم کالے ہو ذرا۔''

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی، شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

''یہ زیور تم لے لو۔''

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ ''پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟''

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ ''پھر میں تم سے لے لوں گا۔''

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ ''میں ان کو اپلوں میں چھپادوں گی — کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔''

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ ''گرنام تو بھی تو مجھ کو کچھ دو۔''

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ''میرے پاس کیا ہے؟''

''کچھ بھی ہو۔''

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی۔ اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ ''یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔''

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوب صورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا۔ تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اماں کھانس رہی ہے — اب میں جاتی ہوں۔''

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا۔ ''جاؤں کیا؟''

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن، اور چھنا[1] لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔

''روتی کیوں ہو؟''

''تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔''

اجنبی ہنس پڑا۔ ''میں پھر آؤں گا۔''

---

1. بڑا کٹورہ

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ ''کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کرسکتا ہوں؟''

''ہاں۔'' اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والے گنڈاسے کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔''

بوڑھے کا چہرہ فق ہوگیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہوگیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔

''آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔''

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[1] وہ خوف ناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے، اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کرسکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا، اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دہن شعلہ — وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لیے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پل تے - پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے

---

1. جاٹوں کی ذات

چھویاں دے کل ٹٹ[1] گئے... جگیا یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا۔ اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، تے تاراں کھڑک گیاں آپے[2]

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا۔ جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کردیا، اور وہ تارا تھی— گرنام!

گرنام بے چاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ انکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی، اس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلتے بسملوں کا تڑپنا دیکھے، اور اس لذت سے محظوظ ہو جو کہ صیادوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہ زور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھوکر اور کند ہوکر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہوکر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کرکے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہوجاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی، اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیوں کر اس کے قابل بنائے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں

1. پکے پل پر اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ چھویوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔ 2. جب جگے نے لائل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کردی گئی۔

کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں کر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نا معلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرلے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کردیتی تھی اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کردیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کردی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گزر گیا۔

جگا صبح و شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گور دوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کردی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کردی ہے۔ اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا۔ اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا۔ اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیوں کہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا

نہ رہے گی۔

نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیوں کہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی۔ مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروالے، خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی، اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی۔ اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہوگیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرادی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ ''میری تو گردن ٹوٹ گئی۔''

''اس گٹھڑی میں کیا بھرلائی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دوسال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھادے۔

''اُپلے — اور ہوتا کیا؟'' گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ ''آرہی تھی، رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہوگئی۔''

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیوں کہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ ''گرنام!'' یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ ''گرنام! تم کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔''

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی۔ اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور اکھڑ نہ رہی تھی۔ مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلاکر پوچھا۔ ''کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟''

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں بہت پریشان ہوں — میں بہت دن سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''شرم آتی تھی'' گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ ''زیر مونچھ'' مسکرایا۔ ''ارے مجھ سے شرم کیسی؟''

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہوگیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔''

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے...''

یہ کہہ کر وہ روپڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''نہیں گرنام، نہیں۔ جو تم چاہوگی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا... ہاں تو... مگر وہ ہے کون؟''

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی ''تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام...''

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''اس کا نام ہے دلیپ... دلیپ سنگھ۔''

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہوگیا۔

''دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔'' گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں— گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''گھر جاؤ۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''گرنام متانت سے بولی۔''

''تم فوراً واپس چلے جاؤ۔'' اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہوگئی۔ آنکھیں خون آلود ہوکر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی— معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''دلیپ سنگھ؟—''

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی چاند کی چاندنی۔ پل

بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہوکر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو۔ یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا۔ اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ کیوں کہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی خونی پل رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں ،، کرتا۔ اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آرہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران۔ آنکھیں، شربت سے لبریز کٹورے۔ سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے تو اس واقعہ کو وارث کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقت ور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ

وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی۔۔۔ اس نے ذرا بلند آواز میں ''چھنی'' گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو۔۔۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا، اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

''تم کون ہو؟'' دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

''ادھر آؤ۔'' بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا۔۔۔ یکا یک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا ''مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تجھ کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا...... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔''

''بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ تھا۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا۔۔۔ اور قتل تو میں نے بہت کیے ہیں اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں..... اور آج مجھ کو بارہواں قتل کرنا ہے۔''

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا۔ بولا۔ ''میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔''

''تو گرنام سے محبت کرتا ہے۔ جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے

کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا۔۔۔ آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔''

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا۔ ''........اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آجائے۔''

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔''

اجنبی نے گرج کر جواب دیا۔ ''تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے۔ اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آگئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو وہ گدھے کو ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے تھا اس نے اس کے منہ پردے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا، دلیپ جوش میں تھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا.....مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو تر کر رہا تھا ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا۔ اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہوجانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی۔۔۔ مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ ''اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا صین اصلی جگہ پر آ گیا— دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا۔ ''تیرے پاس چھوی ہے؟''

''نہیں۔''

''تلوار ہے؟''

''نہیں۔''

''صفا جنگ؟''

''نہیں۔''

''مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔''

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

''جا'' اجنبی نے پکار کر کہا۔ ''لاٹھی لے آ— میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔''

دلیپ بہادر تھا۔ مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علاحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم قوی ہیکل کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جارہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے

خالی دے کر چلایا۔ ''ایک۔''

دلیپ نے پھر وار کیا جگا اسے بچا کر گرجا۔ ''دو۔''

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگّے نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ ''تین۔'' یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ ''او سنبھل بے چھوکرے اب جگّا وار کرتا ہے۔''

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگّے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگّے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوف ناک آواز نکالی۔ اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا آگے کی طرف اچک اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا، مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی۔ مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا۔ اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا..... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگّے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی

طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد!

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پاکر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے۔ اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی[1] باہر کھڑی تھی۔ اور اسے جلد ہی واپس جانا تھا۔

چندلمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا پھر اس نے نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔''میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔''

سب لوگ حیران تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔

''......اور وہ شخص یہ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

1۔ سانڈنی

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہوگئی۔

گرنام نا معلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہئے تھا۔ مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا۔ ''اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جب کہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے....''

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا۔ ''باپو! ماں!! بے بے!!!— میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا۔ اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔''

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیوں کر ہوگیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گڑھ کر سنادیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا۔ اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار درھم سنگھ وہاں پہنچ گئے۔ اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمار داری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ گرنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ مسحور ہوکر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا۔ اور پھر گویا مطمئن ہوکر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم کتنے اچھے ہو...... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔''

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہوگئی——

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا۔ کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھویاں—— عجب منظر پیش کرتی تھیں—— ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ ''باپو! وہ کون لوگ ہیں؟—— یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔''

نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا—— اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑ بڑایا۔ ''آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لیے جارہا ہے۔''

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' جنوری 1941 میں شائع ہوا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام 'جگا' بھی اسی افسانے کے عنوان پر ہے اور یہ افسانہ اس میں شامل ہے۔

نینا

اختر کے بوٹوں کے تلے لوہے کے نعل جڑے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ کتابیں بغل میں دبائے، بہت آہستہ آہستہ قدم ناپتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ تاکہ دوسرے کمروں تک شور نہ پہنچنے پائے۔

آج پھر اس کو دیر ہو چکی تھی۔

مولانا کلاس میں لکچر دے رہے تھے۔ کہنے کو تو مولانا تھے مگر داڑھی مونچھ صفا، اچکن غائب، چوڑی دار پائجامہ ندارد، بالکل اپ ٹو ڈیٹ...... تیز، قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان...... اس لیے پہلے دو شعر ہم نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ نظیر بلاشبہ اپنے زمانہ سے کہیں آگے تھا، وہ صحیح معنوں میں پہلا ہندوستانی شاعر تھا۔ مگر اس وقت اردو سوائے ہندی، فارسی اور عربی ادب کے کسی اور ادب سے متاثر نہ ہوئی تھی۔ اس لیے نظیر کو بھی ہمیں نظر انداز کرنا پڑے گا—— دور جدید کا سالار، شاعر ایشیا، اقبال تھا۔ نطشے کے افکار، یورپ کی قوم پرستی، اسلام کی تنزلی، رومی کے تصوف......"

اختر چپکے سے کلاس میں داخل ہوا اور سب سے پچھلی سیٹ پر دبک کر بیٹھ گیا۔

ہوا یہ کہ رستہ میں جب وہ چماروں کے محلّہ میں سے گزر رہا تھا تو اس نے وہاں ایک بڑا مجمع دیکھا۔ وہ بھی رک گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت مری پڑی ہے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک مردہ عورت معہ ایک مردہ بچے کے خون

میں لت پت پڑی تھی۔

یہ نوجوان کمہارن ، شباب کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسے جرم کی مرتکب ہوئی کہ آج بے یارو مددگار وہ شارع عام پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے پر مجبور ہوگئی۔ شباب سے زیادہ وہ اپنی سادگی طبع، چندٹکوں کے لالچ اور ایک شریف بابو کی شرافت کا شکار تھی۔ بن بیاہی لڑکی کے پیٹ میں بچے کے آثار دیکھ کر برادری والوں نے اس کو برادری سے نکال دیا— وہ روئی چیخی، چلائی پھر پاگل ہوگئی— اور یہ اس کی مختصر زندگی کا آخری منظر تھا۔

اختر کالج کی طرف چل دیا۔ لوگ بڑ بڑا رہے تھے۔ '' پاپن، کلمونہی، کلنکنی ۔''

کالج بالکل دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ جب اختر کالج کے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو بڑ کی گھنی چھاؤں کے نیچے نینا ایک بکری کے کان پکڑے، ٹھنڈی چاندنی رات کی طرح خاموش کھڑی تھی۔

وہ زرد رنگ کا ایک لہنگا، دھاری دار کرتی پہنے تھی— اختر کو ایک دم اپنے سامنے دیکھ کر وہ شرما گئی۔ اس دل کش اضطراب نے اسے اور بھی حسین بنا دیا— آج رات کو اختر سے ملنے کا وعدہ تھا۔

ہائی اسکول پاس کر کے اختر جب کالج میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کالج میں نینا کی ہی دھوم تھی۔

وہ دھوبن تھی۔ ہم قصوں کہانیوں میں کسی ایسی مالن کا قصہ جس کے عشق میں کوئی شہزادہ دیوانہ ہوجاتا ہے ، پڑھ کر ہنس دیتے ہیں۔ چنڈی داس کارامی کے ساتھ پریم ہمارے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پیدا کردیتا ہے۔ لیکن کاش ہم پہلے ایک نظر نینا کو دیکھ کر فتوے صادر کرتے۔

اس کا اصلی نام '' شہزادی'' تھا۔ مگر نینا شاید اسے اس کی آنکھوں کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔ کٹوراسی آنکھیں، چھلکتے ہوئے دو کٹورے، پلکیں ، بے حد گھنی اور لانبی، اس قدر کہ ان کے بوجھ سے پپوٹے ہمیشہ سرنگوں رہتے، ہونٹوں پر نمی سی، اور نچلا ہونٹ داہنی

جانب سے ذرا سا نیچے کی طرف خم کھایا ہوا، بائیں آنکھ کے نیچے رخسار کے ابھار پر ننھا سا سیاہ تل ، اس کا رنگ سرخ و سپید نہ تھا، بس صندل کی مانند۔۔۔ آنکھیں ایسی کہ ہر وقت رو پڑنے پر آمادہ لیکن آنسو پی لینے پر بھی مجبور ہونٹ ایسے کہ کچھ کہہ دینے کے لیے بے چین، لیکن کچھ نہ کہنے میں بھی مصلحت سمجھی۔

اُس کی ماں کہتی ”ہماری بٹیا کو تو نواب جادی ہونا چاہئے تھا۔“ نینا کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ بہت بلند ارادے رکھتی تھی۔ کلو، منو ، چنو، جیسے دھوبی نوجوانوں کو وہ منہ نہ لگاتی تھی۔

سارا کالج اُس کے عشق کا دم بھرتا تھا۔ دھوبیوں کے گھر کالج کے قریب ہی سے دریا کے کنارے کنارے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کرکٹ کا کھیل ہوتے وقت خواہ مخواہ گیند اُچھل کر نینا کے احاطہ میں جاگرتی تھی، کوئی نوجوان لڑکا جاتا۔ اور دروازے پر کھڑا ہو کر پوچھتا۔ ”کیا میں گیند اٹھا سکتا ہوں؟“ نینا چونک کر چندریا سے سر ڈھانپ ، منہ پھیر لیتی۔ خالی گھنٹوں میں لڑکے ٹولیوں میں کھڑے نینا کے گھر کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے اور کہتے کہ کاش! نینا خود اپنے ہاتھ سے ان کے کپڑے دھونے پر آمادگی ظاہر کرے تو وہ ایک دل فی کپڑا کے حساب سے دھلائی چکانے کو تیار تھے۔

زبانی لاف وگزاف کے علاوہ کسی قسم کی کوئی بھی حرکت کرنے کی کسی لڑکے میں جرأت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ ایک منچلا نوجوان بدتمیزی کرنے میں حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مغرور نینا نے پرنسپل سے شکایت کردی، تند مزاج پرنسپل نے لڑکے کو کالج سے خارج کردیا۔ اس لیے اب نینا لڑکوں کے لیے محض ایک خوشنما خواب بن کر رہ گئی تھی۔

بھلا اختر کیا انسان نہ تھا کہ نینا کو دیکھ کر اس کا دل نہ مچلتا۔ وہ خود حسین تھا گورا چٹا رنگ، روشن آنکھیں، مسیں تک بھیگی نہ تھیں۔ مونچھوں کی جگہ روئیں تھے۔ وہ روئیں جو چھ مہینے کے بچے کے منہ پر بھی ہوتے ہیں۔ پندرہ یا سولہ برس کی عمر ہوگی یعنی قریب قریب نینا کے برابر یا چھ مہینے، سال زیادہ۔ دسویں کا امتحان دینے کے بعد اُس نے

گرمیوں کی چھٹیوں میں کئی قسم کے کوک شاستر، ہدایت نامے چھپ چھپ کر پڑھ ڈالے۔ اس کے بڑے بھائی کے دوست آتے تھے۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سنا کرتا، بے تکلفی میں وہ لوگ نہایت حسین تجربات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کسی اینگلو انڈین مس کو گانٹھنے کے منصوبے، کسی وکیل کی خوب صورت لڑکی پر ڈورے ڈالنے کے پروگرام، کسی پری پیکر ایکٹرس کے متناسب اعضا کا ہیجان انگیز انداز میں ذکر یہ سب باتیں اختر کے دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھیں۔ اُس نے الف لیلیٰ کامل، قصہ چہار درویش، چندر کانتا، دربار حرام پور جیسی کتابیں کئی کئی مرتبہ پڑھ ڈالیں اس کے علاوہ ایک دن اُس نے اپنے بھائی کی میز کی دراز میں ایک البم تصویروں کا بھی دیکھا——

عید اور دوسرے تہواروں پر اس کی ماں سے ملنے کے لیے عورتیں آتیں۔ ان کے ساتھ نوجوان لڑکیاں بھی ہوتیں۔ وہ ان کو چپکے چپکے کواڑ کی دراز میں سے دیکھا کرتا تھا—— لیکن وہ تھا بہت شرمیلا، لڑکیوں سے بات کرنا تو کجا، وہ نوجوان لڑکی کے سامنے جاتے ہی کانپنے لگتا۔ زبان پھول جاتی، دل دھڑکنے لگتا—— یہی حال اس کا اب ہوا۔

وہ لڑکوں کی ان ٹولیوں سے علاحدہ رہتا جو نینا کے گھر کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے۔ وہ اپنی زبان پر نینا کا نام تک نہ لاتا تھا۔ جیسے اُس کو اُس سے کچھ غرض ہی نہیں مگر وہ بلا شبہ نینا کا سب سے بڑا عاشق تھا۔

اختر چھپ چھپ کر نینا کی زیارت کرتا۔ وہ بکریوں کو دریا کے کنارے گھاس چرانے کے لیے لے جاتی تو یہ جھاڑیوں اور کھیتوں میں دبکا اس کو دیکھا کرتا۔ وہ کنویں پر پانی بھرنے جاتی تو یہ بھی کسی نہ کسی پیڑ کی آڑ میں کھڑا تاکا کرتا۔ اور جب کبھی اتفاق سے رستہ میں مڈبھیڑ ہوجاتی تو اختر شرما کر سر جھکا لیتا۔ اور وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ اس کی حسین پیشانی عرق آلود ہوجاتی—— تکبر، سنجیدگی اور وقار کے خمیر سے نینا کی تعمیر ہوئی تھی۔ وہ سربلند، خاموش اور مغرورانہ انداز سے رانیوں کی طرح قدم اٹھاتی ہوئی اس

کے قریب سے گذر جاتی۔ اس کے پاؤں میں پڑے ہوئے پازیب ہر قدم پر نقرئی آواز پیدا کرتے، اور آہستہ آہستہ دور پہنچ کر ان کی آواز گم ہو جاتی — اس وقت اختر سر اٹھاتا۔ بعض اوقات اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔

نیناؔ سے اس کے اس چھوٹے سے عاشق کے دل کا حال چھپا نہ رہ سکا— ان کی پہلی ملاقات میلہ کے موقع پر ہوئی۔

اب تو آہستہ آہستہ میلوں کی جگہ نمائشیں لے رہی ہیں اور تھیٹروں کی جگہ ٹاکی، لیکن چونکہ یہ ایک دھارمک استھان تھا۔ اس لیے یہاں کے میلہ کی نوعیت ہی اور تھی چھ سات دن تک خوب چہل پہل رہتی تھی۔

ہوائی پنگورے، ''میری گو راؤنڈ'' جھولے، چاٹ قلفی ، مٹھائی کچوری، کھلونوں، پھولوں ، اور کتابوں کی دکانیں ، سادھوؤں کی ٹولیاں، دنگل اور کھیل تماشے ، موٹی گردنیں، ٹوٹے ہوئے کان، میلے کھردرے تہبند بیڑیاں، پان، مداری، بندر، ریچھ، بازی گر، رنگ برنگ کے کپڑوں والی عورتیں، تھیٹر، چڑیا گھر، کٹھ پتلیوں کی تماشہ گاہیں، گنوں کا رس اور بھنبھناتی ہوئی مکھیاں۔

اختر میلہ میں گھوم رہا تھا۔ غزلوں کی دو پیسے والی کتاب ہاتھ میں تھی جس کے سرورق پر کجن کی تصویر تھی اور اوپر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''کیوں نہ لوٹیں مزے وصلِ یار کے''

ایک طرف کچھ نٹنیاں ناچ رہی تھیں۔ کبھی لمبا گھونگھٹ نکال، آنچل کی آڑ سے اپنی سرمگیں کٹیلی آنکھوں سے اشارے کرتیں، بالکل نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتیں لجاتیں اور جسم چراتیں، اور کبھی ڈھولک کی ایک نئی ہی تھاپ کے ساتھ پاؤں زور زور سے زمین پر مارنے لگیں، گھنگھروؤں کی آواز بلند ہوتی، اوڑھنیاں ایک دم پیچھے پھینک دیتیں، سرننگے ہوجاتے اوڑھنیاں شانوں پر لٹکنے لگتیں اور وہ طاؤس کی طرح سینہ تانے رقص کرتی ہوئی کبھی تو نسیم سحری کی طرح آگے بڑھتیں اور کبھی انکار کے طور پر سر ہلاتی ہوئی

پیچھے ہٹ جاتیں، کبھی عشق پیچاں کی بیل کی طرح بے جان ہو کر زمین پر گر جانے پر آمادہ ہوجاتیں تو کبھی نیم وحشی غزالوں کی طرح گردن اور سینہ تان لیتیں اور بچے تلے قدموں سے زمین ناپنے لگتیں، گھاگھر ا بھنبیری ہوجاتا، خوشنما پھندنوں والی لانبی چوٹیاں ہوا میں اڑنے لگتیں، عرق آلود پیشانیوں پر پسینہ کی بوندیں دھوپ میں چمکنے لگتیں، سینوں میں ایک تلاطم پیدا ہوجاتا، نازک نتھنے پھڑکنے لگتے۔ دوران رقص میں جب کوئی شخص ان کو پیسہ یا اکنی دکھا دیتا تو وہ بصد ناز پیسہ لینے کے لیے آگے بڑھتیں مردوں کی انگلیوں میں اُن کی حنائی انگلیاں الجھ کر رہ جاتیں اور ناک سیکڑ، کمر جھٹکا نہایت نخرے کے ساتھ ''ہائے'' کر کے رہ جاتیں۔ پھر مہین آواز میں مصنوعی خفگی کے ساتھ منہ بسور کر کہتیں ''کیوں جی ہماری کلائی توڑ ہی ڈاروگے کیا؟'' تب ایک قلانچ بھر کر تالی بجاتی ہوئی پرے بھاگ جاتیں اور کمر پر ہاتھ رکھ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی ناچنے لگتیں— اختر سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے سب سے کم سن نٹنی کو اکنی دکھلائی مگر جونہی وہ اس کے قریب پہنچی تو یہ اکنی وہیں زمین پر پھینک بھاگ کھڑا ہوا— اپنے پیچھے دور تک اسے سارنگی کے ساتھ بلند قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

جس جگہ شیروں کا خیمہ یعنی چڑیاں گھر تھا وہیں پر ایک تھیٹریکل کمپنی بھی تھی۔ شیروں کے جسم کی خاص قسم کی تیز بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ ایک آدمی بھونپو منہ سے لگائے اپنی موٹی لیکن بیٹھی ہوئی آواز میں باہر کھڑا چلاّ رہا تھا۔ زیادہ رونق تھیٹریکل کمپنی میں ہوا کرتی تھی۔ دن کے وقت تو تاش اور جادو کے کھیلوں کے علاوہ گانا بھی ہوتا اور ناچ بھی دکھایا جاتا تھا۔ لیکن رات کے وقت گل بکاؤلی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، غازی کمال پاشا، نل دمینتی، سیتا ہرن وغیرہ کھیل ہوا کرتے تھے۔

بہت بڑا خیمہ تھا۔ باہر تختے جوڑ کر اسٹیج بنایا گیا تھا۔ دروازے کے ایک طرف ٹکٹ فروش بہ وقت فرصت آہنی صندوقچہ کے پاس بیٹھا اس پر اپنی انگلیوں سے طبلہ بجایا کرتا اور دروازہ کی دوسری طرف لڑکے لڑکیوں کے کپڑے پہنے، ہونٹوں اور گالوں پر

سرخی لگائے، کولھوں پر ہاتھ رکھے مٹک مٹک کر رقص کرتے تھے۔ اور ایک مسخرا، لمبا چوڑا چغہ پہنے اُن کے ساتھ مذاق کیا کرتا تھا۔

جب اختر وہاں پہنچا تو خیمہ قریب قریب پر ہو چکا تھا۔ باہر اشتہاری ناچ ہو رہا تھا۔ سینکڑوں لوگ کھڑے ان کو دیکھ رہے تھے۔ رنگین اور طرّہ دار پگڑیوں والے نٹ کھٹ دیہاتی نوجوان، ہاتھوں میں لٹھ لیے چمبیلی کے ہاروں میں لپٹی ہوئی بنسریاں بغلوں میں دبائے، پان چباتے ہوئے بڑے انہماک کے ساتھ ان لڑکوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض ان کو سچ مچ کی لڑکیاں سمجھ کر گھنٹوں تیز دھوپ میں کھڑے ایک خاص آواز میں کھانستے اور کھنکارتے اور کئی کئی طرح سے آنکھیں لڑاتے اور جب کبھی پکوڑا سی ناک والا مسخرا ان ناچنے والے لڑکوں میں سے کسی کے گال کو چھوکر پرے بھاگ جاتا اور تماشائیوں کو دیکھ دیکھ کر اور ان کو اشارے کر کے اپنی انگلیاں یوں چاٹنے لگتا جیسے کہ اُن کو مربہ لگا ہوا ہو، تو وہ دیہاتی بے چین ہو ہو کر پہلو بدلنے لگتے— اتنے میں اختر نے نینا کو دیکھا۔

نینا وہی ایک میلا سا زرد لہنگا اور ایک تنگ کرتی پہنے ہوئے تھی۔ گردن میں چاندی کی ہنسلی، پاؤں میں پازیب کلائیوں میں موٹے کنگن، آنکھوں میں سرما پنڈلیاں نصف کے قریب عریاں، ازار بند کے نیلے پیلے لال پھندنے نیچے لٹک رہے تھے، سر کے بیچوں بیچ مانگ کی دھاری۔ سیاہ اور گھنے بالوں کی لانبی چوٹی۔

آج اختر نے اپنی تقدیر آزمانے کی کوشش کی۔ وہ نینا کے قریب پہنچا۔ نینا مسخرے کی حرکات دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

اختر کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا ”نینا تماشا دیکھو گی؟“

نینا نے مسخرے پر سے نظر ہٹالی۔ وہ اس وقت مٹی کے ایک اونچے ڈھیر پر کھڑی تھی۔ اس نے بلندی سے اختر کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی ذیشان ملکہ اپنی کسی حقیر غلام کی طرف دیکھے۔ ایک لحمہ کے بعد کچھ جواب دیئے بغیر اس نے اس کی طرف

سے نظر ہٹالی اور دور آسمان پر اڑنے والی چیلوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اپنی ایک ٹانگ کو دھیرے دھیرے مسلسل حرکت دیتی رہی ــــ

الخاموشی نیم رضا۔ اختر نے جلدی سے دو ٹکٹ خریدے اور نینا کے پاس جاکر بولا ۔"نینا میں نے ٹکٹ خرید لیے"

نینا نے نہایت متکبرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بلا کچھ کہے سنے آگے چل دی۔ اختر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔"نینا میں نے ٹکٹ خرید لیے ہیں۔"

مگر نینا نے کچھ جواب نہیں دیا وہ چلتی گئی اور تھیٹر گاہ میں داخل ہوگئی۔ٹکٹ چیکر نے اُسے روکنا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی چندری کا آنچل آگیا۔ وہ چلّایا" اری او چھوکری! کہاں گھسی جاتی ہے ٹکٹ نکال۔"

اختر نے بڑھ کر ٹکٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے" یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ رہے ٹکٹ۔"

نینا نے نہایت قہر آلود نگاہوں سے ٹکٹ چیکر کی طرف دیکھا اور سخت نفرت سے جھٹک کر اُس نے دامن چھڑا لیا۔

فرسٹ کلاس کے ٹکٹ اور اختر کا رئیسانہ ٹھاٹھ دیکھ کر وہ کچھ محجوب سا ہو گیا۔ اختر سے بولا" معاف کیجئے مالک مجھ کو معلوم نہیں تھا۔"

یہ تھی ان کی پہلی ملاقات ــــ اختر کی مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔

اس ملاقات کے بعد ان کی دوستی میں اضافہ کالج کے نزدیک ہی ایک نیا ٹاکی ہاؤس کھلنے پر ہوا۔

جب بلڈنگ کے باہر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگ گئیں تو باجے والوں کا شور مس ناڈیا کی قد آدم تصاویر بڑے بڑے اشتہارات یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے لڑکے بچے اکٹھے ہوجاتے ان میں نینا بھی شامل ہوتی تھی۔

شام کے وقت سنیما ہاؤس کے سامنے چھڑکاؤ ہوجاتا، دو ایک لال پگڑیوں والے کانسٹیبل بھی گھومنے لگتے، طوطا گنڈیری والا نہایت خوش الحانی سے برف میں دبی ہوئی اور گلاب میں بسی ہوئی گنڈیریوں کے گانے گاتا، چاٹ اور اُبلے ہوئے چنے، اور ایک پیسے میں شربت کا گلاس بیچنے والوں کا اجتماع ہوتا، گانوں کے چھوٹے چھوٹے رسالے بیچنے والے چھوکرے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختے، دو چار اکھاڑے میں لڑنے والے قصائی لونڈے، کالے نیلے تہبند باندھے اینڈتے ہوئے اِدھر سے اُدھر مٹرگشت کیا کرتے۔

اختر نے ایک گیٹ کیپر کو گانٹھ لیا۔ چار چھ آنے کی رشوت میں وہ اور نینا دونوں کھیل دیکھ آتے۔ نینا سنیما بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ اسی طرح سے دن گزرتے گئے۔ نینا اختر سے مانوس سی ہوگئی۔ مگر اس نے آج تک اعتراف محبت نہ کیا تھا۔ نہ اس کے پندار میں کوئی خاص تبدیلی ہی پیدا ہوئی تھی۔ وہ حسب معمول خاموش رہتی، جو کچھ کہتی نہایت مختصر، لیکن اختر جو کچھ بھی کہتا وہ خاموشی کے ساتھ سن لیتی۔ اس کے محبت کے دعووں کو نہ تو اُس نے کبھی جھٹلانے کی کوشش کی اور نہ اُس کے جواب میں خود اُس نے کسی قسم کی محبت کا دعویٰ کیا۔ مگر اُس کو اختر کی معیت ناپسند نہ تھی۔ آڑو کے درخت تلے، دریا کے کنارے پر، گھر سے دور، وہ بیٹھی گھنٹوں اُس کی باتیں سنا کرتی۔ اس کی یگانگی میں بھی ایک قسم کی بیگانگی کی جھلک تھی جس کی وجہ سے اختر اپنے دل کی حقیر سی خواہش کو بھی پورا کرنے سے جھجکتا تھا۔ کیا یہ نینا کی انتہائی فراخ دلی اور اس کے حق میں خاص رعایت نہیں تھی کہ وہ صرف اختر سے ہی ملتی تھی، اس کے پاس جب تک وہ چاہے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی مبالغہ آمیز محبت کی باتوں کو انتہائی خاموشی اور سکون کے ساتھ سنا کرتی تھی۔ اور ممکن ہے وہ ان پر یقین بھی رکھتی ہو — نینا کی نیم نگاہیاں اختر کی آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہی چلی گئیں۔

گرمیوں کی ایک شام کا ذکر ہے:

اختر دریا کے کنارے، کھیتوں میں آڑو کے درخت تلے بیٹھا نینا کا انتظار کر رہا تھا۔
سورج اُفق کے پاس پہنچ چکا تھا۔ کرنیں پانی کی طرح لہروں پر ناچ رہی تھیں بڑی بڑی کشتیاں ریت کی بوریوں سے لدی ہوئی نہایت سست رفتاری کے ساتھ بہتی چلی جارہی تھیں۔ چند پرندے بڑی تیزی سے ہوا میں چکر لگا رہے تھے۔ موقع پا کر پانی پر جھپٹتے اور کچھ نہ کچھ لے اڑتے۔ دو ڈھائی فرلانگ پر دریا کا لال رنگ کا دوہرا آہنی پل تھا۔ کبھی کوئی انجن شنٹ کرتا ہوا اوپر والے پل پر سے گذر جاتا۔ نیچے کے پل پر موٹروں، لاریوں، چھکڑوں، اور سائیکلوں کا تانتا سا بندھا ہوا تھا، کبھی کبھی اونٹوں کی کوئی لمبی قطار بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ دریا کے کنارے کنارے دور تک سپید سپید کپڑے بچھے ہوئے تھے دھوبیوں کی چھوا چھو کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اورِ گدھے نہایت کاہلی سے سوکھی ہوئی گھاس پر منہ مار رہے تھے۔

نینا آئی۔

اس کے ہاتھ میں ابھی تک وہ بے ڈول سی چھڑی تھی جس سے وہ سارا دن اپنی بکریوں کو ہانکتی رہی تھی۔ وہ رک گئی۔ اس کے پازیبوں کی جھنکار بھی ختم ہوگئی۔

"تم کہاں تھیں نینا! میں تمہارے انتظار میں دو پہر سے بیٹھا ہوا ہوں۔"

نینا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اُس نے اپنے میلے ہاتھوں کو لہنگے سے پوچھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! آج میں نے مہندی لگائی ہے۔"

اسی طرح بہت دیر تک ایک کاہلانہ سی گفتگو ہوتی رہی۔ یوں ہی سنیما کی باتیں کسی کشتی کے ڈوب جانے کا قصہ، پیڑوں اور دریا کے پانی پر رائے زنی۔ نہایت بے جان سی گفتگو، بلا نتیجہ، خصوصاً اختر کو کچھ بھی مزا نہیں آرہا تھا۔ وہ نینا کے حنائی ہاتھوں اور پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج اُس کا لہنگا بھی دھلا ہوا تھا۔ چست کرتی بھی صاف معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں میں کاجل بھی احتیاط سے لگایا گیا تھا۔ بال بھی چکنے تھے۔ نئی رنگی ہوئی اوڑھنی میں ابرک کے ریزے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ اور ابرک کے چند

ذرّے اس کی صندلی پیشانی پر بھی چمک رہے تھے۔

"نینا! کیا تم کپڑے دھونے کے لیے گھاٹ پر نہیں جاتیں۔"

"نہیں" نینا ہونٹوں کو دل کش انداز سے جنبش دیتی ہوئی بولی۔

"کیوں؟"

"میری ماں کہتی ہے، میری بٹیا شاہ جادی ہے......"

اختر نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "تو پھر کیا تو یوں ہی دن بھر بیٹھی کھیاں مارا کرتی ہے؟"

"ہاں جی بیٹھی رہتی ہوں۔ بڑے آئے وہاں سے کام کرنے والے...... میں تو بکریاں چرایا کرتی ہوں۔"

"ہونہہ بڑی آئی بکریاں چرانے والی۔ تو کیا شہزادیاں بکریاں چرایا کرتی ہیں۔"

نینا کے پاس اس عجیب منطق کا کچھ جواب بھی نہ تھا۔ وہ بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ اختر نے روکا وہ شانوں کو زور سے ہلا کر بولی۔

"نہیں نہیں اب میں نہیں ٹھہروں گی۔"

بمشکل تمام اختر نے اس کو منایا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ دور سے بنسری کی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ شتربانوں کی تانیں، بہت فاصلے پر گدھوں کی ڈھینچوں ڈھینچوں — اور ایک تنہا کوّا چونچ کھولے درخت ٹھنڈ پر بیٹھا کھیتوں کے سلسلوں پر نظر دوڑا رہا تھا۔

لیکن سب آوازیں آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی تھیں۔ درو دیوار پر خاموشیاں منڈلانے لگیں — نینا بھی حسب عادت چپ تھی اور اختر کے دل میں حسب معمول جذبات کی طغیانی — نینا دریا سے پرے اُفق میں معدوم ہوجانے والی پگڈنڈی پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ اور اختر نینا کی طرف دیکھ رہا تھا...... آفتاب کی آخری کرن پانی کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی اور اس کا عکس نینا کے سینے پر پڑ رہا تھا۔ لہروں کا مدو جذر

اس کے سینے پر سنیما کے ایک منظر کی طرح نظر آرہا تھا۔ تیزی سے چمکتی ہوئی نورانی لکیریں اس کے سینے پر نمودار ہو کر لہراتی ہوئی اس کی گردن کی طرف بڑھتیں اور ٹھوڑی تک پہنچ کر معدوم ہو جاتیں۔

شام کے اس لطف فرما سکون میں نیناؔ کو سامنے پا کر اختر کے ہاتھ سے دامن صبر جاتا رہا۔

اخترؔ نے نیناؔ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے — آہنی پل پر نہ کوئی موٹر تھا، نہ انجن نہ سائیکل، اور کھیتوں پر یکسر خاموشی طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیچر ہمہ تن گوش پنجوں کے بل کھڑی تھی — کانپتی ہوئی آواز میں اختر بولا ''نیناؔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ بہت ہی زیادہ۔ ہر دم......'

...... نہ معلوم اس نے اور کیا کیا کہہ ڈالا — نیناؔ خاموش رہی۔ اور کائنات پر بھی خاموشی کی حکومت۔ اخترؔ نے اپنے الفاظ خود اپنے کانوں سے سنے۔ وہ ان کی لرزش، ان کی رقت کو محسوس کر کے خود ہی گھبرا اٹھا، اور پریشان ہو کر چپ ہوگیا۔ یہ پراسرار سکون اس کے دل میں ایک عجیب ہیبت سی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک اندھی خواہش یہ تھی کہ یہ سکون ٹوٹ جائے...... اور یہ سکون ٹوٹ گیا۔

آہنی پل پر اسکول کے چند بے فکر چھوکرے کسی اسکاؤٹ گیت کی گت پر سیٹی بجاتے ہوئے چلے جا رہے تھے...... ترچھی ٹوپیاں، چمکتی ہوئی آنکھیں، بانکی چال — سڑک پر پڑے ہوئے چھوٹے پتھروں کو ٹھوکریں لگاتے ہوئے۔

اپنے علاوہ ان چھوکروں کی آوازیں سن کر اخترؔ کے دل کو تسکین سی ہوگئی۔ مگر اس کا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ نیناؔ اب بھی بت بنی بیٹھی تھی۔ اخترؔ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''نیناؔ میں جاتا ہوں۔''

نیناؔ نے اُس کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر کہا ''بیٹھو''۔ یہ اُس نے اس قدر مدھم آواز میں کہا تھا کہ اُس کی آواز اور مکمل خاموشی میں حد فاصل قایم کرنا ناممکن تھا۔ اخترؔ ایک

زرخرید غلام کی طرح وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور نینا کی عمیق آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس کی آنکھیں جذبات سے اس قدر کوری تھیں کہ اختر کو شبہ ہونے لگا کہ "ٹھہرو" کی آواز نینا کے دہن سے نہیں بلکہ اس کے اپنے لبوں سے نکلی تھی۔

اختر نے نینا کے ہاتھ کی طرف دیکھنا شروع کیا جو اس کے ہاتھوں میں ایک نازک کلی کی مانند چھپا ہوا تھا — چند لمحے — اور اختر نے نینا کا ہاتھ جھک کر اپنے ہونٹوں سے چھولیا......

معاً نینا نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ سربلند اور مغرور آنکھیں آگ برسانے لگیں، ہونٹ لرزنے لگے، نتھنے پھڑکنے لگے۔ وہ منہ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مارے غصے کے اُس کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ کر رہ گئیں — نا معلوم اختر پر کیا کیفیت طاری تھی۔ اس نے نینا کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ نینا نے اُس کے بال نوچ لیے چیخ کر بولی ۔"چھوڑو مجھ کو نہیں تو ابھی شور مچا دوں گی۔" اختر نے بلا کچھ جواب دیئے اپنے ہونٹوں سے اُس کے جلتے اور لرزتے ہونٹ بند کر دیئے۔

نینا تڑپنے لگی۔ لیکن اختر کے مضبوط تر بازوؤں کی گرفت تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی گئی۔ نینا مایوس ہوگئی۔ اس نے جدو جہد بند کردی، اختر نے محسوس کیا جیسے وہ کسی لاش کو گلے سے لگائے کھڑا ہو۔ اُس نے اپنے بازو ڈھیلے کر دیئے اور نینا ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے قدموں پر گر پڑی — پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اختر گھبرا کر اس کے پاس ہی بیٹھ کر اُس کو نہایت پیار سے دلاسا دینے لگا۔ "نینا! دیکھو میری طرف دیکھو — تم خفا ہوگئیں؟ بس اتنی سی بات پر؟ بس ذرا سا ہاتھ چوم لینے پر؟ میں نے تم کو اور کہا ہی کیا؟ بتاؤ۔ بولو۔ کیا تم کو پیار کرنے میں برائی ہے؟ اچھی نینا! بولو...... کہو نا!"

نینا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پھر اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ اختر نے اُس کو بہت دلاسہ دیا — دور ہیڈ ماسٹر کے بنگلہ سے ریڈیائی شہنائی کی کوئی گت اڑنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ جس میں دریا کے سرد پانی کی سی نمی تھی۔ درخت جھومنے لگے۔ آڑو کے پیڑ کی پتیاں تالیاں بجانے لگیں۔ نینا روتے روتے مسکرانے لگی...... پھر شرما شرما کر آنچل میں منہ چھپانے لگی۔

بڑے بڑے زرد رنگ کے مینڈک دریا کے کنارے کنارے دور تک بیٹھے چاندنی رات کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اُچھل اُچھل کر چھلانگیں لگاتے اور پانی کی عمق میں غائب ہوجاتے...... اختر اور نینا ان کو دیکھ دیکھ کر دیر تک ہنستے اور باتیں کرتے رہے۔ میٹھی میٹھی، جھجک جھجک کر۔

جب اختر جانے کو تیار ہوا تو نینا کا رخسار اُس کے سینے پر راحت پذیر تھا۔ اختر نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اچھی نینا! اچھی 'شاہ جادی' بتاؤ اب تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟''

نینا نے مسکرا کر اپنی باہیں اُس کی گردن میں حمائل کردیں۔

اختر نینا کے کان کے پاس منہ لاکر بولا ۔ ''دیکھو نینا! کل ...... کل؟ کل نہیں پرسوں، ہاں پرسوں رات کو جب تمہارے گھر میں سب لوگ سوجائیں تو تم یہیں اس پیڑ کے نیچے آجانا— یعنی قریب گیارہ بجے...... سمجھیں — اور یاد رہے سورج نکلنے سے پہلے واپس نہیں جانے دوں گا۔''

نینا شرما کر پیڑ کی آڑ میں ہوگئی۔

اختر نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ '' آؤ گی؟ بولونا! نینا شاہ جادی''

نینا ہاتھ چھڑا، پرے ہٹ کر چاندنی میں کشش و احتراز کا مجسمہ بنی کھڑی رہی ایک لمحہ کے لیے جھکی جھکی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ اختر کے دوبارہ استفسار پر اُس نے اثبات کے طور پر اپنے سر کو جنبش دی اور پھر ایک جست کر کے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر گھر کی طرف ایسا بھاگی کہ اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

سب سے پچھلی بنچ پر بیٹھا ہوا اختر عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ آج صبح وہ اس مردہ عورت کو دیکھ کر آرہا تھا اور آج ہی نینا سے بھی ملنے کا وعدہ تھا۔

اختر کے دماغ میں سینکڑوں خیالات آتے اور چلے جاتے —— اس کو کسی کل چین نہ آتا تھا۔ سارا دن اس کے ذہن میں انتشار سا رہا۔ تصویر کا یہ دوسرا رخ اس کی نظر کے سامنے یک بیک آگیا۔ اس کا صاف و شفاف ضمیر اس قسم کے مکروہ گناہ کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ اخلاق یا اعلیٰ کریکٹر کا کوئی بھی مفہوم اس کے نزدیک متعین نہ تھا، بلکہ اس کے اندر جنسی خواہش سے بھی قوی تر کوئی حس ایسی بھی تھی جو اس کو اس فعل سے پرہیز کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ نینا کو اپنی معصیت کاری کا حیلہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی اس ذہنی تبدیلی کو انتہائی بزدلی سے بھی تعبیر کیا۔ مگر پھر بھی وہ خود کو ایسا فعل کرنے پر آمادہ نہ کرسکا۔

بار بار وہی منظر اپنے تمام گھناؤنے پن کے ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے آجاتا، بھنبھناتی ہوئی کھیاں، بوسیدہ چیتھڑے، مردہ بچہ، پتھرائی ہوئی آنکھیں وحشت انگیز سرد چہرہ، نیم وا تاریک منہ میں سے بہتا ہوا لعاب، شرم ناک حد تک ننگا، نسوانی جسم، زرد ڈھیلا ڈھالا پیٹ —— اختر کو ایسا معلوم ہوا جیسے نینا کا پیٹ پھول کر مٹکے کے برابر ہوگیا ہے۔ وہ خود اس سے کتراتا ہے، اور پھر جیسے دھیرے دھیرے غراتی ہوئی آوازیں کہہ رہی ہوں ''پاپن' کلمونہی، کلنکنی...... وہ اس سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ ابا کی ایک گھرکی اور اُس کا عشق کافور...... بے چاری پھولے ہوئے پیٹ والی نینا کالج سے باہر بڑے لیٹر بکس کے پاس نیم پاگلوں کی طرح بیٹھی اپنی آنکھوں کے چیپڑ کو آنچل سے صاف کرنے میں منہمک رہتی ہے —— اُف اختر کو نینا کی عصمت بار آنکھوں کا خیال آگیا اور اس کے حوصلے اور بھی پست ہوگئے۔ اس ننھے سے زبردست عاشق کا دماغ اس مسئلہ کا حل سوچ نکالنے سے قاصر تھا —— نینا کی پاک محبت اس کو اس فعل سے باز رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ ''کیوں نہ اس خواب آلود آنکھوں والی کنواری کی

حرمت میرے لیے ایک متبرک راز ہو کر رہ جائے'' — لیکن آہ وہ اپنی رسیلی معشوقہ کو کیا منہ دکھا سکے گا؟

آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اور رات کی سیاہی نینا کی آنکھوں میں پناہ گزین تھی — نینا آڑو کے درخت تلے کھڑی تھی۔

آہنی پل ایک بڑے مگرمچھ کی طرح نظر آرہا تھا۔ مکانوں سے دھواں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں پھیلتا جارہا تھا — نینا ہاتھ میں ایک آبخورہ لیے اختر کی منتظر تھی۔ آج وہ اس کے لیے حلوہ بنا کر لائی تھی، اور ایک چمچی، جس سے وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے محبوب کو حلوا کھلانا چاہتی تھی۔

اس کے طوفان خیز جذبات کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اس پر نازاں تھی۔ آج وہ طلوع آفتاب سے پہلے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ خود بخود سمٹنے لگتی تھی۔ کس قدر غرور آفریں تھا اختر کا پیغام۔

اختر ابھی تک نہیں آیا تھا، کہیں وہ انتظار کر کے واپس تو نہیں چلا گیا؟ مگر نہیں سامنے کالج کا بڑا گھنٹہ گھر نظر آرہا تھا۔ اس کے اندر زرد رنگ کی روشنی ہو رہی تھی۔ ٹینس کورٹ کے پاس دریا کی طرف منہ کیے کالج کے ریسٹوران کا کالا منیجر سفید دھوتی باندھے کھڑا تھا۔

نینا اُچک اُچک کر معدوم پگڈنڈی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھاٹ اور مندر پر بالکل خاموشی طاری تھی۔ کوئی حسین سی بانکی صورت ابھی نمودار ہوگی۔ سیاہ اچکن، سر پر مخمل کی ٹوپی کو سرخ و سپید رنگ سے خاص مناسبت تھی...... چھریرہ بدن...... نازک اندام...... بغیر مونچھ کا عاشق ...... تبسم بر لب آتا ہی ہوگا۔ کنپٹی کے پاس ٹوپی سے باہر گہرے بھورے رنگ کے دو تین لچھے بالوں کے ...... نازک سی چھڑی گھماتا ہوا...... چھوٹا سا معصوم عاشق — وہیں مندر کے گوشے میں سے نکلے گا۔ ''نینا شاہ جادی'' اس کو دیکھتے

ہی پیٹھ پھیر لے گی۔ روٹھ جائے گی۔ نہیں بولے گی۔ گدگدانے پر ہنسے گی بھی نہیں۔ بس یوں ہی منہ پھلائے بیٹھی رہے گی۔ وہ کہے گا۔ "دیکھو نیّنا! سنو شاہ جادی! ...... بھلا تم کو پیار کرنا بھی گناہ ہے......" نیّنا دل ہی دل میں زور سے کہے گی "نہیں گناہ نہیں ہے۔" مگر بظاہر بناوٹی غصہ سے کہے گی۔ "تم نے اتنی دیر تک راہ کیوں دکھلائی؟"

اختر آنکھیں جھکالے گا۔ وہ تحکمانہ انداز سے کہے گی۔ "منہ کھولو، آنکھیں بند کرو...... پھر وہ سیپی بھر حلوا اس کے منہ میں ٹھونس دے گی — اور اختر کا ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔

اختر آج اپنی نیّنا کو دیکھے گا۔ اس لیے نیّنا کی تیاریاں مکمل تھیں، مہندی، کاجل، پھولوں کے ہار، دھڑکتا ہوا دل، لرزتا ہوا جسم، نشہ آور لحن...... جوں جوں دیر ہوتی جارہی تھی، نیّنا کے نازک دل کی کیفیتوں پر گمشدگی طاری ہوتی جارہی تھی۔

کتنی ہی دیر تک نیّنا اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے چاندی کے کنگنوں کا معائنہ کرتی رہی، تب وہ اپنے پازیبوں کی جھنکار سنتی رہی — یوں ہی کاہلی اور سستی سے وہ پہاڑ سے لمحات گذارتی رہی۔ مگر اختر نا معلوم کہاں رہ گیا تھا۔

اس کے زعفرانی رخساروں کی زردی اور بھی بڑھ گئی۔

کیا وہ سچ مچ نہ آئے گا۔ کھیتوں کی وحشت آفریں خاموشی میں وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی — آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر۔ الّو ہونکنے لگے اور جھینگروں کے قیامت خیز شور میں نیّنا کی سسکیاں ڈوب کر رہ گئیں۔

وہ وہیں آڑو کے پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگا کر اونگھنے لگی، پھر وہ دونوں ہاتھوں میں تھامے مٹی کا آبخورہ سینہ سے لگائے وہیں سوگئی۔

حسین خوابوں میں وہ قرب یار کی شادکامی سے مسرور ہوتی رہی — گرمیوں کی طویل رات — طلوع آفتاب سے پہلے وہ واپس نہیں جاسکے گی...... اُس کے چھوٹے سے رسیلے اور جانباز عاشق نے یہی تو کہا تھا — مرغ نے بانگ دے دی۔

نیّنا جاگ اٹھی۔ الجھے ہوئے بال — گرد میں اٹے ہوئے کپڑے ہاتھ میں چیونٹیوں سے لبریز آبخورہ — اس کی مژگانِ غم چکاں کے سروں پر آنسوں موتیوں کی مانند لرزنے لگے۔

دوسرے دن اختؔر نے باوجود بزرگوں کی ہر امکانی کوشش کے سینکڑوں بہانوں سے کالج جانے سے انکار کردیا۔ اس لیے تھوڑے دن کے بعد اسے دوسرے شہر میں حصولِ علم کی غرض سے بھیج دیا گیا — اُس نے قسم کھالی کہ وہ کبھی بھی نیّنا کو اپنا منہ دکھانے کی جرأت نہیں کرے گا— ہارے ہوئے بہادر جنگجو کی طرح شکست خوردہ تاجور کی مانند وہ دور نیّنا سے بہت دور چلا گیا۔

شہزادی نیّنا کو جب اختؔر کی صورت کبھی بھی دکھائی نہ دی تو اس نے اپنے ننھے سے دل کی لامحدود خلا کو اپنے چھیل چھبیلے نٹ کھٹ عاشق کی بے اعتنائی سے معمور کر لیا۔ اس نے محبت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیے اس کی شادی بھی ہوئی تو اس کی روح پر بیوگی طاری رہی۔ چاندنی رات کے ایک جانفزا منظر کی طرح اس حسین ''چت چور'' کی یاد اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں محفوظ کرلیا۔

پہلے وہ اپنے عاشق کے لیے'' شاہ جادی'' سے کنیز بنی۔ اب وہ اس کو معبود قرار دے چکی تھی۔ باوجود پرخلوص پرستش اور عقیدت کے نیّنا نے اپنے معبود کا یہ گناہ عظیم عمر بھر معاف نہیں کیا۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' جولائی 1941 میں شائع ہوا۔ پہلے افسانوی مجموعہ 'جگا' میں شامل ہے۔

پردیسن

یاد نہیں رہا کہ کیا تقریب تھی۔

ہمارے ایک واقف کار کے ہاں مہمانوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ایک طرف شامیانہ کے نیچے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سبھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ گانا بجانا ہوتا رہا۔ مہمانوں میں سے ایک لڑکی نے بھجن گایا۔ لوگوں نے گانے کو سراہا۔ میں نے گانے والی کو۔

میں نے پہلی ہی نظر میں شدید محبت کا احساس کرنا چاہا۔ پہلے چھپی نظروں سے معلوم کیا کہ آیا ان کی بھی میری طرف توجہ ہے یا نہیں، پھر جو علانیہ ان کی طرف دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو نگاہوں کا رستہ میں تصادم ہو گیا........

کسی نے کسی سے کہا۔ ''وہ لڑکی جو ابھی ابھی گا رہی تھی بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ انٹرنس پاس ہے اور اب وہ لوگ سیر کے لیے بمبئی جا رہے ہیں۔''

خیر! یہ اتفاقیہ حادثہ تھا۔ جسے میں جلدی ہی بھول گیا۔ بلکہ بھلا دیا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد کالج میں ہڑتال شروع ہوگئی۔

وجہ تو مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکی اور نہ ہی میں نے اس بات کی کوشش کی۔ کیوں کہ مجھے نہ تو طلباء کے حقوق سے دلچسپی تھی۔ نہ ہی اسٹاف کے فرائض کا خیال۔ البتہ ہڑتال کا میں کٹر حامی تھا۔ ہڑتال کرنے میں پورا پورا حصہ لیا گیا۔ آخر جب متواتر

تین چار روز تک کالج میں الو بولتے رہے تو پرنسپل صاحب نے نا معلوم عرصہ کے لیے کالج کے بند کیے جانے کا اعلان کردیا۔ لیکن طلباء کے مطالبات کو پورا کرنے سے لاچاری ظاہر کی۔

یار لوگوں نے کتابیں بالائے طاق رکھ کر بڑے میدان میں گلی ڈنڈا اڑانا شروع کیا۔

ایک روز، جب ہماری چنڈال چوکڑی اکٹھی ہوئی تو سوال یہ پیش کیا گیا کہ آخر خدا کی بھیجی ہوئی ان اسپیشل چھٹیوں کے گزرانے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا تھا۔

یہ سنتے ہی سب لوگ سروں سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر اپنی اپنی رائے پیش کی گئی۔ بہت بحث مباحثہ اور حیل و حجت کے بعد یہ طے پایا کہ مسوری کی سیر کی جائے۔

دہرہ دون سے مسوری تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لیے ہم لوگ جب بھی موقعہ پاتے مسوری پر دھاوا بول دیتے۔

کل تعداد میں ہم پانچ منچلے نوجوان تھے۔ ایک ایک بستر، چند جوڑے کپڑے اور کچھ نقد نرائن لے کر جو چلے تو باوجود سخت بارش اور آندھی کے چار گھنٹہ کے اندر اندر ہم منسوری میں دھرم شالہ کے دروازہ پر تھے۔

ہم نے دیکھا کہ بڑے بڑے شریف زادے اس وقت بڑے ہال میں پڑے اونگھ رہے تھے۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہم کو بھی کمرہ ملنا ناممکن سا تھا۔ میں بذات خود پجاری جی کے پاس گیا، پہلے تو پجاری جی مجھے دیکھ کر بھنائے لیکن جب میں چرنوں میں پرنام کرنے کے بعد مبلغ ایک روپیہ ان کی بھینٹ کیا تو فوراً چہکنے لگے.....

''ارے اوہ یہ کاہے کی تکلیف کرتے ہو (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اس کی کیا ضرورت تھی (روپیہ جیب میں ڈالتے ہوئے)..... اپنا گھر ہے...... پتا جی ماتا جی سب خیریت سے ہیں نا؟........ کمرہ....... اوہ ہاں ہاں کمرہ''.........

ہمارے لیے بہترین کمرہ کا انتظام ہوگیا۔

سورج دیوتا نے طلوع ہوتے ہی پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں کو سنہری رنگ سے رنگ دیا۔

میں نے باہر نکل کر پڑوسیوں کو جانچنا شروع کر دیا۔

اول تو ایک سندھی بابو تھے۔ لمبے تڑنگے، جیسے کھجور پر بندر، ان کی ماتا جی ساتھ تھیں۔ وہ دودھ گرم کرتیں، یہ بدن پر تیل کی مالش کر کے نہاتے، اور پھر ایک پیالہ پی کر سو جاتے— شاید مریض تھے۔

دوم کمرہ کے آگے ایک کمرہ میں ایک سکھ صاحب تشریف فرما تھے۔ شاید پنشن یافتہ پولیس افسر تھے۔ داڑھی مہندی سے سرخ۔ چوڑے چکلے، برجس میں کسے کسائے۔ ایک بھاری بھرکم عورت ساتھ تھی۔ عورت کو دیکھئے تو گویا ان کی اماں اور وہ گویا عورت کے بھی ابا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ نہ وہ خود کسی کی طرف دیکھتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ان کی طرف دیکھے۔ صبح کے وقت سردار صاحب جب ایک گلاس دودھ، دو مکھن کی ٹکیوں اور نصف درجن انڈوں کا ناشتہ فرما کر، ماتھے پر شکن ڈالے، برجس میں سربند کمرے سے باہر نکلتے تو پھولے نہ سماتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یا تو کسی کو پھاڑ ڈالیں گے یا پھر خود ہی پھٹ جائیں گے۔

ان کے ساتھ والے کمرہ میں دو عورتیں رہتی تھیں۔ ایک بوڑھی دوسری جو ان جوان بھی ایسی کہ۔

ننگ پیری ''تھی جوانی اس کی''

وہ عورت جو بزعم خود اندر سبھا کی سبز پری سے کم نہ تھی۔ آنکھوں میں بے تحاشا کاجل لگا کر، گردن ٹیڑھی کر کے جب ٹوئیاں طوطے کی طرح ہماری طرف دیکھتی تو دل ناتواں دھک سے بیٹھ کر رہ جاتا۔

ہمارے کمرہ کے دوسرے دروازہ کے سامنے بھی ایک کمرہ تھا......

جس طرح کہ اسکول کے ماسٹروں، کالج کے ٹیچروں، یونی ورسٹی کے پروفیسروں کا کچھ اعتبار نہیں کہ نہ معلوم کب گھر میں اپنی "اُن" سے جھگڑ کر آئیں اور اس کا کل عتاب بے چارے معصوم طالب علموں پر نازل کردیں، اسی طرح پہاڑی مقامات پر دھوپ اور بارش کی بابت وثوق کے ساتھ کوئی بھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

اگرچہ صبح کے وقت دھوپ تھی مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایسے بادل گھر کر آئے کہ تمام دن بے کار گیا۔ پہلے تو کمرہ میں تاش اور کیرم سے دل بہلاتے رہے اور جب رات کے گیارہ بجے تو ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے ہمیں دھرم شالہ کے اس حصے کی زرخیزی میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ رہا۔

پہلے تو اِدھر اُدھر کے کمروں میں سے عورتیں نکلیں، پھر باتوں اور ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ تب تو تو میں میں ہونے لگی۔ اس کے بعد گویا بلوہ ہوگیا وہ پکڑ دھکڑ اور گھوڑ دوڑ شروع ہوئی جیسے پولو کا میچ ہو رہا ہو— بالآخر یہ شریف زادیاں اپنے اپنے کمروں میں گھس گئیں۔

ہم لوگوں نے سوچا جب کہ یہاں عورتوں کو اس قدر آزادی حاصل ہے تو کیوں نہ ہم بھی لگے ہاتھوں ایک قوالی ہی گالیں۔ پھر کیا تھا۔ سب لوگ ایک حلقہ میں بیٹھ اور تالی کے ساتھ آج ان کے گھر کی محفل ہے بڑے جوبن سے نکلیں گے" گانا شروع کردیا تالیوں کی تال کے ساتھ ایک سماں سا بندھ گیا۔

عین اس ہنگامہ میں بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کی مانند ایک آواز گونجی۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ سردار صاحب بستر میں پڑے پڑے داد دے رہے ہیں کیوں کہ اس طرح سے ان کی نیند میں خلل پیدا ہوتا تھا۔

مجھ کو بھی تاؤ آگیا چونکہ سپہ سالار تو میں ہی تھا۔ لہٰذا فوراً کمبل لپیٹ، "مغلظات کی لبوب کبیر" کا بڑا سا اسٹاک دماغ میں لیے ہوئے اٹھا اور دروازے میں سے..... صرف سر باہر نکال اچھی خاصی رفتار کے ساتھ ان کو سنانا شروع کردیا۔

دروازے میں سے محض سر باہر نکالنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ یہ گویا ایک سیاسی دور اندیشی تھی کہ خدانخواستہ سردار صاحب میری مفرح گالیوں کی تاب نہ لاکر نعرہ جنگ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوجائیں تو اس صورت میں جھٹ سے دروازہ بند کرلینے میں دقت نہ ہو۔

ان کا بھی بستر میں منہ ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی جوابی کارروائی کر رہے ہیں۔ لیکن ایک تو پہلے ہی سے چلا چلا کر ان کا گلا بیٹھ چکا۔ دوسرے میری آواز بھی ماشاء اللہ ایسی گونج دار تھی کہ ان کی آواز دب کر رہ گئی۔

چند لمحوں تک یہی ہنگامہ رہا۔ پھر میں ایک دم کے لیے رکا اس ''حرارت عریزی'' کو قائم رکھنے والی تمہید کے بعد ہم نے ایک ریمارک بھی پاس کردیا۔ ''کیوں جناب اس وقت ہمارے گانے سے آپ اس قدر برہم ہوگئے اور ابھی جو ہوا کی بیٹیاں.....''

دفعتہً سردار صاحب ''کنگ کانگ'' کی طرح اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے۔ ادھر میں بھی بدکا اور پھر فوراً دروازہ بند کرلینے کے لیے سنبھل کر جم گیا۔

لیکن غالبًا سردی کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے سردار صاحب نے جنگ ملتوی کردی اور زیر لب ''باقی پھر'' کہہ کر کروٹ بدلی اور گل ہوگئے۔

دوسرے دن جب سردار صاحب نے دیکھا کہ ہم سب تو پنجابی بھائی ہیں تو —— گویا اس طرح سے اس جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

پھر ہم نے گھومنے کی ٹھانی۔

پہلے کلفڑی بازار پہنچے، پھر کتاب گھر، کتاب صر سے داہنی جانب گھوم کر کمپنی باغ کی سیر کی، جب وہاں سے لوٹ کر کتاب گھر پہنچے تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔

بقول ملا رموزی صاحب مجھ کو در اصل ''میونسپل آفس'' کے اجلاس میں شریک

ہونا تھا۔ کتاب گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ اور مجھ کو فوری آرڈر ملا تھا۔ اس لیے باوجود تھکاوٹ کے آگے روانہ ہونا پڑا۔ لیکن باقی ساتھی وہیں رُک گئے۔

فارغ ہوکر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ ایک طرف تو بچوں کے کھیلنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی، دوسری طرف سیمنٹ کی نشستیں کچھ کھلے آسمان تلے اور کچھ ایک حجرہ نما عمارت کے اندر بنی ہوئی تھیں۔

میں حجرہ میں بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر ستونوں پر کئی دل جلوں نے ایسے ایسے مفرح اور دل پذیر خیالات رقم کر رکھے تھے کہ توبہ ہی بھلی۔ کچھ دیر تک تو انہیں کو پڑھ پڑھ کر تفریح کرتا رہا۔ پھر ساری سیٹ کو خالی پاکر کسلمندانہ انداز سے پاؤں پھیلاکر لیٹ گیا۔ گھاٹیوں میں سے بادل اوپر آرہے تھے۔ ہوا میں نمی تھی اور فرحت۔ ہر طرف دھندسی چھا رہی تھی۔ لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ رکشاؤں، ڈانڈیوں اور گھوڑوں کا شمار ہی نہ تھا۔

یکایک بوندا باندی ہونے لگی۔ کئی عورتیں، مرد اور بچے شور مچاتے ہوئے اندر آگئے۔ اب تو شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ میں بھی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ میرے اٹھنے کی دیر تھی کہ کئی لوگ میری سیٹ پر ٹوٹ پڑے۔ میں پہلو والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ اس پر جو میاں بیوی بیٹھے تھے ان کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ لیکن باوجود حافظہ پر زور ڈالنے کے یاد نہ آسکا کہ کہاں؟

اسی سوچ میں ادھر جو دیکھا تو میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی شریمتی جی...... نے بھی نظر اٹھائی۔

اپنی کیا کہوں؟ ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ لحہ بھر تک میری طرف دیکھتی رہیں گویا کہتی ہیں ''تم؟''

لیکن صاحب اگر میں وہاں تھا تو میرا قصور؟

میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ستون کے قریب جاکر رک

گیا۔ عجیب بات تھی۔ وہ بمبئی کی بجائے ادھر کیسے بھول پڑیں ہماری نظر ان عبارتوں پر پڑی۔ جن کو پہلے بھی پڑھ چکے تھے اپنے نام کو زندہ جاوید کرنے کے لیے میں نے بھی پنسل نکالی اور یہ نیم شاعرانہ عبارت لکھ ماری ۔ میرا محبوب مجھ پر مہربان نہیں..... آہ یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے "اگر وہ مہربان ہوجائے...... تو وہ مسرت بھی ناقابل برداشت ہوگی۔"

یہ عبارت لکھ کر گویا میں نے غالب کی قبر پر لات ماردی۔ اقبال کو منہ چھپانے کے لیے جگہ نہ رہی پنسل جیب میں ڈال کر دیکھتا کیا ہوں کہ" شریمتی جی" بغور میری حرکات کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ جی میں آئی کہ اس بے سر و پا عبارت کو مٹادوں۔ اتنے میں کسی نے آہستہ سے بازو تھام لیا۔

ایک نا محرم صاحب کھڑے تھے جن کو میں پہچان نہ سکا۔ واہ صاحب وا! یہ بھی ایک ہی رہی جناب میں ستیہ بھوشن ہوں۔ یاد نہیں جب ہم دونوں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ انارکلی کی سیریں، راوی میں کشتی کا کھینا سب کچھ بھول گئے۔"

" اخاہ" کا نعرہ لگا کر میں ان سے بغل گیر ہوگیا۔ اور پھر ہم دونوں دیرینہ دوست مزے مزے کی باتیں کرتے ہوئے چل کھڑے ہوئے۔ ریالٹو ٹاکیز کے سامنے پہنچ کر آپ رک گئے" ہنری ہشتم کی پرائیوٹ لائف دیکھنے چلو" میں نے معذرت چاہی اور دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے بغل میں چھتری دبائے آگے روانہ ہوگیا...... راکسی تھیٹر، رنک سنیما ، اور لائبریری کے آگے سے ہوتے ہوئے کیملز بیک روڈ کی سیر کی۔ لیکن ذہن میں شریمتی جی کی صورت بسی ہوئی تھی۔ اتنے میں بارش ہونے لگی۔ بھاگم بھاگ لائبریری کے برآمدہ میں پناہ لی۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ایک بچہ کہہ رہا تھا" بی بی ! میری چھتری تو بہت چھوٹی سی ہے نہیں تو ہم دونوں اسی کے نیچے چلے جاتے۔"

" ہاں" جواب ملا۔

''دیکھونا! اس آدمی کی چھتری کتنی بڑی ہے — اس سے مانگ لونا!

اب میں چوکنا ہوگیا۔ کیوں کہ اشارہ میری ہی طرف تھا۔ مجھے بھولے بچے کی بات پسند آئی۔ آگے بڑھ کر میں نے نہایت شریفانہ انداز سے کہا ''محترمہ! اگر آپ چاہیں تو میں چھتری پیش کرسکتا ہوں۔''

محترمہ نے میری جانب دیکھا۔ یا خدا! یہ تو ''وہی'' ہیں۔ اُن کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ بس چھتری لے کر روانہ ہوگئیں۔

بارش کے بند ہوجانے پر میں بنگالی مٹھائی والے کی دوکان میں گھس گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ آج دو مرتبہ ان کے درشن ہوگئے۔ دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ اب بات چیت کرنے کی کوئی صورت پیدا ہوجاتی تو بہتر تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے ان کی جائے رہائش کا پتہ لگانا لازمی تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں میں نے مٹھائی والے کے دام دیئے اور اپنے کمرہ میں آکر سر منہ لپیٹ کر پڑ رہا۔ میرے ساتھی مجھے اُکساتے تو میں شانوں کو حرکت دے کر خاموشی اختیار کر لیتا۔

''میں مریض عشق ہوں میری دوا پردے میں ہو''

رات خدا خدا کر کے کٹی۔ صبح ہوئی دوستوں نے جگایا۔ ''بھئی ہم ذرا باہر سے ہو آئیں تم اندر سے دروازہ بند کرلو۔''

میں نے اندر سے زنجیر چڑھا دی۔ پھر لیٹ گیا۔ کیوں کہ نو بجے سے پہلے اٹھنا میرے لیے حرام تھا۔

ابھی آنکھ بھی نہ لگنے پائی تھی کہ دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا کیک پیسٹری والا ہوگا۔ چلّا کر بولا ''نہیں مانگتا''۔

خیال تھا کہ سو فیصدی ''انگریز مارکہ'' انکار سن کر وہ چلا جائے گا۔ لیکن دستک جاری رہی۔ اُٹھنا پڑا دروازہ زور کے ساتھ کھولا اور نہایت خشمگیں نظروں سے دستک دینے والے کو دیکھا۔ لیکن سبحان اللہ! یہ تو ''آپ'' تھیں دونوں ہاتھوں میں دودھ کی پتیلی

تھی۔

ان کی حیرت کی بھی انتہا نہ تھی۔ ''آپ یہاں''؟

''جی ہاں'' میں نے مسکرا کر جواب دیا'' آپ بھی تو یہیں پر ہیں۔''

چندے سکوت کے بعد کہنے لگیں'' یہ دودھ گرم کرنا تھا کیا آپ کے ہاں آگ ہے''

''بہت'' میں نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے پتیلی لے لی۔ وہ تو چلی گئیں۔ میں کھڑا ٹھنڈی انگیٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی نہ صرف جالی ٹوٹی ہوئی تھی بلکہ اس کی ٹانگیں تک سلامت نہ تھیں۔

آخر کار بہت جد وجہد کے بعد میں اس'' بے ستون انگیٹھی'' میں آگ جلا کر'' جوئے شیر'' لانے میں خدا خدا کر کے کامیاب ہو ہی گیا۔

تمام دن بارش ہوتی رہی۔

میں دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ تو ہمارے پڑوسی ہی نکلے۔ یہ خوب رہا۔

شام کے وقت ہمارے پڑوسی سینما دیکھنے چلے گئے ہمارے ساتھی بھی'' ٹھنگو ٹوکم'' دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نے انواع و اقسام کے بہانے بنا کر انہیں ٹال دیا...... پیالہ ہاتھ میں تھا اور میں گھونٹ در گھونٹ چائے پیتا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی میکسم گورکی کا افسانہ'' چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ'' پڑھتا جارہا تھا۔

عموماً وہاں ایک ہنگامہ سا مچا رہتا تھا۔ چونکہ اس وقت سب لوگ جاچکے تھے اس لیے رات بہت دل فریب اور پرسکون معلوم ہوتی تھی۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے کائنات عالم پر ایک بے ہوشی سی طاری ہو...... ستار کے تار کی صدا خاموش فضا میں ابھری اور پھر ڈوب سی گئی۔ تب یوں آواز آئی جیسے کوئی آنکھوں میں آنسو بھر کر بہت دھیرے سے کسی کے کان میں اس کی لاپروائیوں کی شکایتیں کر رہا ہو۔

'' ساجن!''

'' ساجن ! کیسا ہے چت چور''

آواز اس قدر مدھم تھی کہ الفاظ مبہم سے ہو کر رہ گئے۔ پھر کائنات نے انگڑائی لینا شروع کی۔

'' جب سے نین ملائے' مڑ کر۔

آیا نہ اس اُور۔

آیا نہ اس اُور ساجن!

ساجن! کیسا ہے چت چور..........''

میں نے کتاب بند کر لی۔

'' کلپت کلپت سانجھ ہوت ہے۔

تڑپت تڑپت بھور۔

تڑپت تڑپت بھور ساجن!

ساجن! کیسا ہے چت چور۔''

اب تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹ پہن کر قدم بڑھایا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے گہرے کھڈ تھے، تاریک۔ دور ننگا پربت کی برف پوش چوٹیاں تھیں' سفید۔ اور ان چوٹیوں پر سے چاند جھانک رہا تھا، زرد۔

'' پھولوں کی رات آئی تجھ بن۔

سونی سیجا مور۔

سونی سیجا مور ساجن!

ساجن' کیسا ہے چت چور''

کاش یہ منظر اور یہ نغمے دائمی ہو جاتے۔ تمام دنیا ایک گیت بن کر رہ گئی لیکن عارضی...... گیت نے کائنات کو چونکا دینے کی بجائے اور بھی مدہوش کر دیا۔

کسی نے دروازہ پر دستک دی۔

میں چونکا۔ دروازہ کھولا۔

ان کا لباس تھا: ریشمی شلوار' ہلکے نیلے رنگ کی قمیص' سر پر سیاہ اوڑھنی، بالوں کی لٹیں پریشان، پیشانی روپہلی —— مدہوش سرمگیں آنکھیں پورے طور پر کھلنے سے قاصر۔

وہ مجھے چھتری واپس کرنے کے لیے تشریف آور ہوئی تھیں۔

"یہ گیت آپ ہی گا رہی تھیں؟"

"جی ہاں! —— آپ کو پسند آیا"

"آپ تو مجسم گیت ہیں۔"

"تو گویا آپ شاعر بھی ہیں....."

"نیم شاعر کہئے تو شاید زیادہ موزوں ہو"

"نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان۔ نیم شاعر —— تو کیا"

اس پر ہم دونوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ جیسے ڈھول کے ساتھ وائلن بج رہی ہو —— آپ سینما دیکھنے نہیں گئیں؟"

"آپ بھی تو نہیں گئے۔"

"گویا آپ میری خاطر نہیں گئیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ میری خاطر نہیں گئے۔"

یہ دوسری چوٹ تھی۔

"کیوں جی! آپ کا دل تو لگ گیا ہوگا یہاں"

"ہاں" انہوں نے نہایت دل کش ادا کے ساتھ دونوں ہاتھ باندھ کر جمائی کے لیے اوپر اٹھائے اور پھر مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ "لیکن............"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ جانتے تھے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ لیکن ہم اس کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔

''کیا مطلب؟''

تبسم برلب، کنکھیوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔'' کیا یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر اس چاندنی رات میں گھاٹیوں کا نظارہ ہو سکے؟''

'' آیئے لائبریری میں بیٹھ جایئے''

میں دروازہ بند کر کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے پوچھا'' آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

اب وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دیں۔'' میں آپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دوں تو برا نہ مانیئے گا'' کیوں کہ میری گرگابی سیمنٹ پر پھسلتی ہے۔''

'' مجھے آپ کی گرگابی کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔''

اب ہم لائبریری کے دروازہ پر پہنچے۔ باہر بورڈ پر لائبریری کے بند ہونے اور کھلنے کے اوقات نیز تمام قواعد و ضوابط نہایت تفصیل کے ساتھ درج تھے اور کئی باتیں مثلاً لائبریری کے اندر تھوکنا، شور مچانا اور کوئی اخبار یا کتاب کمرے سے باہر لے جاکر پڑھنا قطعی منع تھا۔ لیکن اندر سوائے روزانہ اخباروں کے سال سال بھر کے پرچے یا'' تہذیب'' (رسالہ) کے ۱۹۲۷ء کے چند پرچوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دن کو بچے بڑی میز پر بیٹھے تاش سے ''بیگم پکڑ'' کھیلا کرتے تھے'' یا رات کے وقت ایک دبلی پتلی بلی چوہوں اور چھچھوندروں کا تعاقب کیا کرتی۔

ہم دونوں بنچ پر جا بیٹھے انہوں نے کانپ کر کہا'' یہاں تو سردی بہت ہے'' میں نے کوٹ اُتار کر ان کے اوپر ڈال دیا۔ تب ہم دونوں مونگ پھلی کھانے لگے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں ایک نوجوان سرمست حسینہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھا ہوا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔ یکا یک فلمی محبت نے جوش مارا اور میں نے نہایت ادب کے ساتھ، سر کو خم دے کر اور تبسم برلب پیدا کر کے سوال کیا'' کیا میں جناب یا جنابہ کا اسم مبارک پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

میری بدلی ہوئی آواز اور انداز کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بے باکی سے قہقہہ لگا کر انگلی ہلاتی ہوئی بولیں "نہیں نہیں، آپ ایسی جرأت ہرگز نہیں کر سکتے۔"

میں کھسیانا سا ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

میں چاند کی چاندنی میں پہاڑوں کے سلسلوں، اور اُفق میں جھلملانے والے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ قریب آ گئیں اور میرا ہاتھ تھام کر بولیں "اچھا تو آپ نے کالج میں "جناب یا جنابہ" کے علاوہ اور کیا کچھ سیکھا ہے"؟

میں بھی جھینپنے والا نہ تھا۔ فوراً جواب دیا "اور دست شناسی سیکھی ہے"

"دست درازی تو نہیں؟"

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

اب میں نے بھی انگلیوں پر حساب لگایا، برچھک، تلا، بدھ وغیرہ کہہ کر علی ماس، ون، ٹو، تھری پاس کا دم دے کر فوراً جواب دیا، "آپ ایک مرتبہ بہت سخت بیمار ہو گئی تھیں۔"

"یہ تو سب کی زندگی میں ہوتا ہے۔"

"اچھا دیکھئے اس مرتبہ آپ نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا اور آپ پاس ہو گئی ہیں۔"

"ٹھہریئے" انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا "بھلا آپ کو یہ حال کہاں سے معلوم ہوا۔"

"ذرا صبر کیجئے" یہ کہہ کر میں نے ان کا ہاتھ پھر سے تھام لیا "اور سنئے آپ شہر ممبئی کی سیر کا بھی ارادہ رکھتی تھیں۔"

اب وہ سب کچھ بھانپ چکی تھیں۔

وہ دل فریب انداز میں مسکرا رہی تھیں "نجومی جی! کچھ اور"؟

"اور؟" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اور ایک آپ کے دل کی بات بتلاتا

ہوں۔"

وہ ہمہ تن گوش تھیں۔

" آپ کو کسی جیو کی چنتا ہے"

یہ سنتے ہی انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔" ہم آپ کو ہاتھ نہ دکھلائیں گے"

" روٹھ گئیں کیا؟"

اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں۔ خوب شغل رہا۔

معاً ان کی نظر اپنی طلائی رسٹ واچ پر پڑی" اوہو اب تو وہ آتے ہی ہوں گے" اپنے دروازہ کے آگے پہنچ کر میں نے ایک کاغذ ان کی مٹھی میں دے دیا" یہ کیا ؟"

" میرا پتہ" یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔ باہر سے کوئل کی طرح آواز آئی

" گڈ نائیٹ"

" گڈ نائیٹ"

میں تکیہ کو گلے سے لگا کر سو گیا۔

دوسرے دن حسب معمول ساڑھے نو بجے سو کر اٹھا۔ سلیپر پہن کر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا باہر نکلا اِدھر اُدھر دیکھا۔

سردار صاحب ، مسز سردار صاحب — وہ موٹی کاجل والی ...... نل پر گئے۔ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ بچے ان کے دو پٹوں کے ساتھ ناک رگڑ رہے تھے۔ ہاں کمرہ سنسان۔ لائبریری، خالی...... دل کو اُلجھن سی ہونے لگی۔ شریمتی جی کہاں چلی گئیں۔

تب ان کے کمرے کے پاس کھانستے رہے۔ آہستہ آہستہ گنگناتے رہے۔

" تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا۔ ہاں۔ ہاں...... آں

تمہیں نے مجھ کو آں آں آں........... پرے یم"

اب تو میرا دل ڈوبنے لگا کسی نے دروازہ میں سے جھانکا تک نہیں۔ پھر ہمت

کر کے دروازہ تک پہنچے۔ اندر جھانکا۔ آہستہ سے دستک دی، پھر جھانکا تب دھکیل کر دروازہ کھول دیا—

پنجرا خالی تھا۔

پھر کیا تھا دل میں ایک وحشت سی پیدا ہوگئی۔ اسی حالت میں دوڑتے ہوئے رکشا کے اڈہ پر پہنچے۔ دو روپیہ قلی کے ہاتھ پر رکھے "چلو فوراً چلو"

" قلی بھی گڑبڑا گئے۔ اور بغیر منزل مقصود پوچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔

"حضور کہاں؟"

سنی دیو— پوڈیم— جلد پہنچنا مانگتا۔"

وہ رکشا کو لے کر اڑے۔

ہوٹل، بنک، ڈاک خانہ، سبزی کی دوکانیں، سب نکل گئے۔ لندور بازار ختم ہوگیا۔"

میں چیخا" اور جلدی— جالدی۔"

خوب صورت گھاٹیوں۔ سرسبز پہاڑیوں، اور نیچے وادی میں منڈلانے والی چیلوں کی طرف میرا دھیان نہ تھا۔ میں آگے دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک کہ نظر پہنچ سکتی تھی۔

پکچر پیلس، راکسی تھیٹر، بنگالی مٹھائیوں کی دوکانیں، جوہریوں اور فوٹو گرافوں کے شو روم ...... سب کچھ پیچھے کی جانب اڑا جا رہا تھا۔

ریالٹو سنیما کے قریب یکا یک ہماری نظر شریمتی جی پر پڑی۔

" روکو" میں نے چلا کر کہا۔

لیکن آگے ڈھلوان تھی۔ رکشا تیزی میں تھی یک لخت رک جانے سے قلی گر کر سڑک پر لوٹ گئے۔ رکشا پہاڑ سے ٹکرا گئی۔ سامنے کا تختہ بھی ٹوٹ گیا اور میں سر کے بل اس زور سے گرا کہ پہاڑ آسمان میں پرواز کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے......

مگر میں جلدی سے سنبھل کر اس رستہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ جو بڑی سڑک سے

علاحدہ ہو کر نیچے لاریوں کے اڈہ کی طرف جاتا تھا۔ ''ان'' کے والدین تو جا چکے تھے لیکن وہ ابھی آ ہی رہی تھیں۔

وہ میرے قریب پہنچ گئیں۔ مگر چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ میں خاموش اور وہ بھی ٹھٹک کر رہ گئیں۔ بس یہ حالت تھی۔

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے ان سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

چند لمحوں تک یہی حالت رہی۔

پھر وہ آہستہ سے بولیں '' سنئے آپ ہیں پردیسی میں ہوں پردیسن۔ آپ کے لیے میری جدائی ناقابل برداشت تھی...... اس لیے میں آپ کو مل گئی۔ آپ کے لیے میری قربت بھی ناقابل برداشت تھی...... اس لیے میں جدا ہوئی۔ اور بس...... اچھا (دونوں ہاتھ جوڑ کر) نمستے !!''

دور ہوا میں لہراتی ہوئی ان کی سیاہ اوڑھنی میں چمکنے والے ابرک کے ٹکڑے ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

یہ افسانہ پہلے افسانوی مجموعہ 'جگا' 1944 میں شامل ہے۔

ماتا ہری

یورپ کے شہروں میں (کچھ عرصہ پیش تر) پیرس کو دنیا کے آمروں میں ہٹلر کو، یونی ورسٹی کے سرکردہ اصحاب میں وائس چانسلر کو اور انسان کے جسم میں ناک کو جو اہمیت فرداً فرداً حاصل ہے، وہی اہمیت ہمارے ہوسٹل کو، یونی ورسٹی سے وابستہ دوسرے ہوسٹلوں پر یک مشت حاصل ہے۔

اعضائے رئیسہ (جن کی افزائش قوت کے لیے ماء اللحم خاص الخاص تیار کیے جاتے ہیں) میں جو رتبہ کہ دل کا ہے ہوسٹل کے دوسرے کمروں میں میرے کمرہ کا بھی وہی رتبہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

میرے کمرے کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ اس کھڑکی میں سے یونی ورسٹی کا کلاک ٹاور صاف نظر آتا ہے۔ یونی ورسٹی کا بڑا پھاٹک تو بالکل قریب ہی ہے۔ جب بوقت صبح جغرافیہ پڑھنے والی لڑکیاں (اتنی حسین لڑکیاں اور اس قدر خشک مضمون) ادھر سے گذرتی ہیں تو ان کی زیارت جام صبوحی کا کام دیتی ہے۔ وہ نشہ پیدا ہوتا ہے کہ جسے وارڈر کی دھمکیاں یا (خدانخواستہ) کسی پروفیسر کی موت یا جرمانے کی سزائیں وغیرہ جیسی ترشیاں بھی نہیں اُتار سکتیں۔

تقریباً ایک ہفتہ پیش تر کا ذکر ہے۔

گرمیوں کی دوپہر (راتیں بھی گرمیوں کی ہیں، مگر دن بس قیامت سمجھئے) ہاتھ

میں خس کی تربہ تر پنکھیا، اور میری نظر سامنے مس لیلا ڈیسائی کی تصویر پر...... مالی حالت بہت نازک — بلکہ جاں بلب — گھر سے روپیہ ہی نہ آیا تھا۔

دھوپ چلچلاتی ہوئی پڑ رہی تھی۔ کوے بھی خاموش تھے، دور مشترکہ کمرہ سے کیرم کھیلنے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں، میں سونا چاہتا تھا، مگر بائیں پہلو والے کمرہ سے گانے کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ ایک صاحب بزعم خود نہایت خوش الحانی کے ساتھ ایک ہی شعر کو بار بار گا رہے تھے۔

بس یہی نا! تڑپ کے کاٹی رات — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

بس یہی نا! تڑپ کے کاٹی رات — تم نہ ....

"حضرت!" میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا" سحر ہوئی یا نہ ہوئی مگر آپ نے ہم پر نیند حرام ضرور کر دی" خیر وہ بے چارے خاموش ہو گئے۔

لیکن صاحب اس بات کا کیا علاج کہ داہنے پہلو والے کمرہ میں سردار شیر سنگھ باگڑیاں لالہ بینی پرشاد کے ساتھ (آپ پڑھ کر ہنسیں گے) شطرنج کھیل رہے تھے۔ نا معلوم پنجاب کے سبھی باشندے ایسے ہوتے ہیں یا پنجاب والوں نے شیر سنگھ باگڑیاں کو ہی، سہ آتشہ، بنا کر دھکیل دیا تھا، جہاں تک فہم اور ذہانت کا تعلق ہے یہ بات ظاہر تھی کہ لالہ بینی پرشاد ان کو شکست فاش دے دیں گے، مگر گاہے بہ گاہے جب سردار باگڑیاں اپنی کرخت آواز میں غرا کر کہتے" شہ" تو ہم لیٹے لیٹے چونک پڑتے تھے۔

غرض یہ خشک ماحول، اور اس پر طرہ یہ کہ میرا بینک دیوالیہ گویا ایک تو کریلہ اور پھر نیم چڑھا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور پوٹیٹو چاپ نے اندر جھانک کر دیکھا۔ تن و توش کے لحاظ سے تو یہ خطاب محض انہیں کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے عجیب انسان ہیں۔ کلہ پر کلہ چڑھا ہوا۔ سینہ پر سینہ، ٹانگ پر ٹانگ، غرض ہر چیز ریز ٹو دی پاور ٹور (Raise to the power ture) اگر کوئی چیز باریک ہے۔ تو ان کی آواز چیخ کر بولے" کیوں مین! ماتا ہری دیکھنے چلو گے؟"

میں نے کسل مندانہ انداز سے ٹانگیں پھیلا کر کہا "جیب کو رفو کی حاجت ہے۔"

یہ سن کر بدکے، اپنی جیب پر ہاتھ رکھ کر "زیرلب" کھانسے، مری ہوئی آواز میں کہنے لگے "اچھا بھئی! اکس کیوزمی (مجھے معاف کیجئے، مطلب یہ کہ مجھے اجازت دیجئے) پھر ملاقات ہوگی۔"

آہ! دنیا کی ناپائیداری، ہم سروں کی چشم پوشی — اور پھر خرچ کی پریشانی اور بدحالی — میں نے سگرٹ سلگایا اور ماتا ہری کی بابت سوچنے لگا۔

ماتا ہری غالباً کسی مندر کی دیوداسی تھی، جس کی بابت معلوم نہ تھا کہ کس قوم سے تعلق رکھتی ہے، 1917ء کی جنگ کے دوران اس عورت نے مخبر کی حیثیت سے زبردست خدمات انجام دی تھیں۔ اس کا بے پناہ حسن اس کا معاون ثابت ہوا، مشہور عالم ایکٹرس گاربو نے ماتا ہری کا پارٹ ادا کیا تھا، اس کے علاوہ رامن نوارد اور لائنسل بیری مور نے بھی حصہ لیا تھا۔ پکچر واقعی قابل دید تھی............

اک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا، کھل کر بند ہوا، اور پھر کھل گیا۔

میں نے گھوم کر دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی' معلوم تھا، کہ یہ حرکت سوائے شریر اکبر کے کسی اور کی نہیں ہوسکتی، اکبر پر تو ہم جان دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے ہم کو عشق ہے—' اندر داخل ہوتے ہی وہ ایک زانو فرش پر ٹیک، ہاتھ پھیلا' پکار کر یوں گویا ہوا—

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

میں نے سگریٹ کا گل جھاڑا اور لمبا کش لے کر پوچھا، "کیوں خیریت تو ہے۔"

"سب خیریت — مگر یار تمہاری صورت کیا ہوئی۔ ہونٹ بھینچے ہوئے پیشانی پر بل، پورے ہلاکو خاں بنے بیٹھے ہو۔" (گاکر)

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   ہائے ماجرا کیا ہے !!!

میاں کی صورت دیکھ کر اور یہ شعر سن کر ہنسی آگئی۔ ہوسٹل میں "غیر سنجیدہ" مشاعرہ ہوا کرتا ہے تو ان مشاعروں میں ہوسٹل کی "سیاسیات" پر منظوم تبصرہ کیا جاتا

ہے۔ اور عموماً اکبر سب میں بازی مار لیتا ہے۔ میں نے پوچھا دو دن کی چھٹیوں میں گھر جا کر کیا کرو گے۔''

'' ہم ہوم سکنس محسوس کر رہے ہیں۔ سات بجے گاڑی پر سوار۔ نو بجے گھر پر، دو دن قورمہ و پلاؤ اڑے۔ تیسرے دن پھر حاضر — چھوڑو بھائی جو ہوگا سو ہوگا ہی۔ ہم نے ایک اینگلو انڈین غزل کہی ہے۔ ہے تو نامکمل پھر بھی سننے کے قابل، اچھا کلیجہ تھام لو۔

رین اِز فالنگ جھما جھم	(بارش جھما جھم ہو رہی ہے)
پاؤں پھسلا گر گیا ہم	
بومبے ٹرین سے لیڈی کیم	(بمبئی میل سے ایک خاتون آئی)
میں نے پوچھا وٹ از یور نیم	(......تمہارا نام کیا ہے؟)
او مائی لیڈی کم کم	(او پیاری آؤ آجاؤ)
مائی ہارٹ یو ہیو ون	(تم نے میرا دل جیت لیا ہے)

اس کے بعد کا حصہ اس نے میرے کان میں سنا دیا۔

''اچھا لو بھائی! — چلے ہم، بازار میں شاپنگ کرنا ہے، سسٹر کے لیے کچھ چیزیں خریدیں گے۔ تم تو غالباً ماتا ہری دیکھنے جاؤ گے۔ مگر ذرا خیال رہے، سیاہ شیروانی پہن کر جانا۔ واللہ اس میں تمہارا حسن خوب کھلتا ہے۔''

''ہم تو نہیں جائیں گے۔''

'' بگڑ گئے؟''

'' — جا ہی نہیں سکتے۔''

'' سمجھا۔'' اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور پھر جیب سے ایک روپیہ نکال میری طرف پھینکتے ہوئے بولا '' لو میاں، ہو تو تم نا خلف مگر اماں! (سینہ پر ہاتھ رکھ کر) ہم بھی تمہارے لیے سب کچھ لٹا دینے پر کمر بستہ ہیں — اچھا

براور! اب چلیے، بہت کام پڑا ہے۔ لاؤ ہاتھ ملا لیں، چلو رہنے دو۔ آ کر ملا لیں گے۔"

دروازہ سے باہر نکلتے وقت اس نے اپنا سر پیچھے نکالا، شرارت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے، آنکھوں کی پتلیاں گھما اور کمر کو ہلا کر فرمایا۔

الوداع او قافلہ والو! مجھ کو اکیلا چھوڑ دو
میری قسمت میں لکھی ہیں دشت کی رعنائیاں............
............نہ توبہ ویرانیاں۔

ایک روپیہ نقد مل چکا تھا، مبلغ نو آنہ کا رعایتی ٹکٹ، سات آنہ میں کرایہ یکہ آمد و رفت، لیمن، سگریٹ، پان وغیرہ

میں سیٹی بجاتا ہوا اٹھا، پانی کا پیالہ سیفٹی ریزر، صابن، آئینہ وغیرہ لے کر بیٹھا ہی تھا، کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔

مسی لگائے اور پان چبائے ہوئے، ہاتھ میں مختصر قسم کا زنانہ رومال اور پھر پائینچے اٹھائے، "مس ذلو" اٹھلاتے اور قدم قدم پر فتنہ جگاتے ہوئے تشریف آور ہوئے۔

میں نے اٹھ کر پذیرائی کی۔

"زہے نصیب! مس ذلو کہئے............"

"دیکھو کہے دیتے ہیں، ہم ذلو ولو کہلانے کے عادی نہیں، لو قسم اگر پھر تمہارے کمرہ کا رخ بھی کریں تو ——"

میں نے پکار کر کہا "خدا را رحم۔ آپ کے آنے کا زخم ہی کاری تھا۔ اب یہ رخصت تو بس ستم بالائے ستم ہے۔"

"توبہ! توبہ !! یہ سب چلن تم نے نسیم سے سیکھے ہیں...... باہر پوسٹ مین منی آرڈر لایا ہے اور آپ ہیں کہ......"

میں جھپٹ کر باہر نکلا، واقعی پورے پینسٹھ روپے کا منی آرڈر تھا۔ میرا چرمی بٹوا پھول کر رہ گیا۔ "سبحان اللہ! مس ذلو! جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔"

مس ذلو اس بات پر جل کر، باوجود بلانے پکارنے کے رخصت ہوگئے۔

فوراً فارغ البال'' ہو، منہ ہاتھ دھو کر، کپڑے پہن، سج دھج کر میں تیار ہوگیا۔

'' میں بغیر چھت والے یکہ پر تیموں کی مانند بیٹھا۔ رعایتی ٹکٹ لے کر جھپ سے ہال کے اندر ایک نشست پر قابض ہوگیا۔ پکچر شروع ہونے میں چالیس منٹ باقی تھے۔ مگر چونکہ مشہور کھیل تھا اور بھیڑ بھاڑ کا امکان بھی اس لیے میں نے از راہ دور اندیشی ابھی سے اپنی جگہ پر قبضہ جما لیا تھا، ورنہ بعد میں اوّل تو جگہ ہی نہ ملتی اور اگر ملتی بھی تو بہت آگے جا کر، پردہ کے قریب۔

اللہ! اللہ!! کیسا ہنگامہ تھا، برقی پنکھوں کی ہوائیں۔ دو شیزاؤں کی زلفوں کی گرفت سے آزاد ہو کر، ادھر اُدھر آوارہ پھرنے والی خوشبوئیں۔ سگاروں کی سڑاند، فرنگی اور نیم فرنگی نازک اندام عورتوں کے نقرئی قہقہے، چہل پہل، تھینک یو، ایم سوری کی ہلکی ہلکی آوازیں، زرق برق ملبوسات، نوجوان لڑکیوں کی فتنہ رفتاریاں، ستم شعاریاں اور برق پاشیاں —

ہمارا ہوسٹل بس پل ہی پڑا تھا۔ خدا جانے اس دن کیا بات تھی کہ ہمارے ہوسٹل اور یونی ورسٹی کی چیدہ چیدہ ہستیاں ایک ہی ہال میں یکجا ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ ہمارے پروفیسر کوا (Prof. Crow) اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر گھوم رہے ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے، عجیب با رسوخ آدمی ہیں، یونی ورسٹی میں مخلوط طریقۂ نسواں تعلیم کے رائج کرنے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔ طلباء دل سے خواہاں ہیں کہ آپ کی شادی خانہ آبادی ہو جائے اور اس کے بعد سعادت مند طلباء ان کے ہونے والے بچوں خصوصاً لڑکیوں کی درازیٔ حیات کے لیے دعا کرتے رہیں۔

طلباء کی خوب ریل پیل ہو رہی ہے۔ ابھی ابھی یونی ورسٹی کھلی ہے، سب نوجوان تازہ دم ہیں۔ ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جو کئی کئی برس سے کامیابی کو پائے حقارت سے ٹھکرا رہے ہیں، حصولِ علم میں ان کی بے چارگی ثابت ہی سہی مگر دیگر

امور میں ان کی قابلیت مسلمہ ہے، منہ مت کھلوائیے (ادب شرط ہے) بس اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ گھر کے بھیدی ہیں۔ نا معلوم کب لنکا ڈھادیں، اس لیے سبھی لوگ ان سے خائف رہتے ہیں، خواہ کلاس روم ہو یا لائبریری خواہ فیس وصول کرنے والے کلرک کی کھڑکی ہو یا کسی ڈیپارٹمنٹ کا دفتر، خواہ کھیل کا میدان ہو، یا چناؤ کا ہنگامہ، خواہ صنفِ نازک کی یونی ورسٹی کے خلاف شکایات کا مقدمہ ہو یا یونی ورسٹی کو کسی لیڈر کی موت کے غم (؟) میں ہڑتال کرنے پر مجبور کرنے کے لیے جلسہ — ہر جگہ ان کا بول بالا ہے۔
اور پھر سالِ اوّل کے نو وارد نرم نرم چھوکرے بھی ہیں جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگیں۔ جنھوں نے ماضی قریب میں ٹائی لگانا سیکھا ہے۔ اور جو ابھی شرماتے اور لجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ لیکن گلیوں میں بھیک مانگنے والے فقیروں کے ساتھ اس بنا پر الجھتے اور جھگڑتے ہیں کہ وہ لوگ ''یونی ورسٹی کے طلبا'' سے گفتگو کرنے کے آداب سے واقف نہیں، ان میں سیمیں بدن طالبات کی بھی کمی نہیں جو کہتی ہیں خواہ نمونیا کے عارضہ سے مرنے والی لڑکیوں کی تعداد یہاں تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے کہ یونی ورسٹی میں مخلوط طریقۂ تعلیم کا سلسلہ ہی بند ہوجائے۔ مگر وہ کڑا کے کی سردیوں میں بھی نیم عریاں لباس پہنیں گی ضرور۔

آ ہا ہا! شتر بھائی چلے آرہے ہیں، آپ بالکل صوفی منش بالغ ہیں۔ ''المجاز قنطرۃ الحقیقہ'' میں تہ دل سے یقین کیا ایمان رکھنے والے، ہماری ہوسٹل کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ مولانا محمد اکرام متخلص بہ ''غنیمت'' کی شہرہ آفاق مثنوی ''نیرنگِ عشق'' عجیب رقّت انگیز آواز میں پڑھ کر سنایا کرتے ہیں، علاوہ ازیں، سرمد، جامی، خواجہ حافظ ظہیر فاریابی، مولانا افضل الدین خاقانی کے خاص تفکرات کا نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔

پنڈت جی بھی حاضر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کے تقدس پر تب تک شبہ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ جب تک کہ آپ کے بدن پر گاڑھے کا کرتہ، دھوتی اور پیشانی

پر صندل کا ٹیکہ موجود ہے۔ عاشق مزاج بہارؔی کا کلام گنگناتے ہیں۔ مگر چھپ چھپ کر، مہاتما گاندھی کی تصنیف ''برہچریہ پر میرے تجربات'' اعلانیہ ان کی میز پر پڑی رہتی ہے۔

اگرچہ ماتا ہری جیسی فلموں میں ''خاص قسم'' کے کسی رقص کی شہرت سن کر، کرتے دھوتی (یعنی جامہ) سے باہر ہوجاتے ہیں، اور کچھ عرصہ کے لیے اس کتاب کے مطالعہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، مگر شو کے ختم ہوتے ہی، اس کے چند اوراق کا پاٹھ کر کے توبہ کر لیتے ہیں۔

بھلا ایسے موقع پر مولانا کیوں کر چوک سکتے تھے۔ ہاتھ میں ایک الفربہ ''تنبیہ الغافلین'' بغل میں قصہ طوطا و مینا، چہرہ پر نوخیز داڑھی (آگ بجھ گئی۔ دھواں اٹھ رہا ہے) — ہال کے اندر اپنے مخصوص انداز میں چلتے ہوئے آتے ہیں۔ اپنے اس تعجب کو دور کیجئے کہ مولانا بایں ریش کوتاہ، کیوں کر ایسے فلموں کو دیکھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ بلکہ بتلائے کہ ان کی سراسیمگی کا مداوا کیا ہوسکتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اس طرح کی فلموں کو بلا آیت الکرسی کے ورد کیے کیوں کر دیکھ لیتے ہیں۔

''اکالی جنگلات'' کی بھیانک وادیوں سے فرا رشدہ، سردار شیر سنگھ باگڑیاں، مقیم حال شہر ہذا، اس وقتِ ایک کرسی پر بمشکل تمام ڈھیر ہو رہے ہیں۔

مسٹر ماموںؔ سبک رفتاری کے ساتھ تشریف آور ہوتے ہیں، ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہال اور بھی زیادہ منور ہوجاتا ہے، فردوسِ گمشدہ اور فردوس بازیافتہ کا مصنف یعنی مشہور شاعر ملٹنؔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ''کالج کی لیڈی'' کہلاتا تھا — ہوٹل کے طلبا آپ کو ابھی اسی قسم کے کسی خطاب سے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں۔ لیکن سردست طلباء کو آپ سے ایک نہایت لطیف شکایت ہے۔ اس قدر لطیف کہ نہ تو لوگ اسے ان کے رو بہ رو پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ خود سنی سنائی باتوں کی توضیح کر سکتے ہیں۔ وہ ''شکوہ'' کہ جس کا ''جواب شکوہ'' ابھی وجود میں نہیں آیا یہ ہے کہ اگر مسٹر ماموںؔ کے پاس

دو ہیٹ ہیں تو وہ کسی نے بطور تحفہ بھیج دیئے تھے، اگر کوئی پتلون ہے تو وہ کسی نے Forget me not (مجھے بھولیے گا نہیں) کہہ کر حاضر خدمت کردی تھی، اگر کوئی کتاب ہے تو وہ بھی کسی نیک بخت کی" نیک خواہشات کے ساتھ پیش کردہ — بھلا ان مسخروں سے کوئی پوچھے کہ آخر یہ بھی کوئی شکایت ہے؟—

فلم شروع ہونے ہی والا تھا کہ ایک اینگلو انڈین دوشیزہ اندر داخل ہوئی۔ حسن کی تعریف میں شعرا اور مصنفین زورِ قلم ختم کر چکے ہیں اور پھر اس پر بھی اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ اس امر کا اعتراف کر لیں گے، کہ اپنے الفاظ کی کم مائیگی پر وہ خود محجوب ہیں۔ لہٰذا میں پہلے ہی سے ہتھیار ڈالے دیتا ہوں۔

از راہ تعارف اتنا کہہ دینے میں چنداں حرج نہ ہوگا کہ اس کی چشم شہلا کا ہر وار غلط انداز بھی اک تیر بے خطا بر نشانہ ثابت ہوتا تھا۔ صباحت ملاحت پر غالب تھی۔ نازک نتھنے تنگ اور پھڑکتے ہوئے۔ وہ ملکوتی جمال کا ایک مجسمہ تھی۔ وہ آئی، اور آتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ ہال پر ہو چکا تھا۔

وہ کچھ سراسیمہ سی ہوگئی، بیسیوں آنکھیں اُسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ ایک پریشان ہرنی کی مانند انتہائی معصومانہ انداز کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حیرت اور حجاب گلابی رخساروں پر لانبی لانبی پلکوں کا سایہ۔

میں نے چاہا کہ اٹھ کر اپنی سیٹ پیش کر دوں۔ مگر حوصلہ پست ہوا جاتا تھا۔ نا معلوم وہ میری پیشکش کو ٹھکرا دے۔ یا نا معلوم دیکھنے والے کیا سوچنے لگیں۔ بیسیوں خیالات کا ہجوم تھا اور میں دم بخود بیٹھا تھا۔ خدا جنت نصیب کرے اقبال مرحوم کو ان کا شعر بر وقت یاد آگیا۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

میں نے فی الفور کرسی خالی کردی اور انہوں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد ہماری

دعوت قبول کر لی۔

میں نے باہر آ کر سگرٹ سلگایا۔ اب صرف بہت آگے جگہ ملنے کا امکان تھا۔ میں نے سوچا کہ پکچر شروع ہو جانے پر، تاریکی میں، آگے جا کر بیٹھ جاؤں گا۔

ادھر تیسری گھنٹی بجی اور اُدھر میں واقف کاروں کی نظروں سے بچتا ہوا بہت آگے جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ابھی دو منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی میرے ساتھ کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میرے اعصاب میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ تاہم سنبھل کر دریافت کیا۔ ''آپ نے وہ سیٹ خالی کر دی؟''

نیم فرنگی عورتیں بعض اوقات ہندوستانی اور فرنگی عورتوں سے بھی بازی لے جاتی ہیں۔ یہ حسین دوشیزہ اس کا بہترین نمونہ تھی۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کی لانبی اور گھنی پلکیں بھی جھک گئیں۔ رخساروں کی سرخی بڑھ گئی۔ اس کے نازک لبوں میں جنبش پیدا ہوئی '' میں تو جگہ نہ پا کر پریشان ہو گئی۔ اسی لیے میں آپ کی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ اِدھر اُدھر کوئی جگہ ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن جب میں نے دیکھا آپ کو اس قدر آگے بیٹھنے پر مجبور ہونا پڑا ہے تو پھر میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کی تنہائی کی کوفت کو دور کرنے میں حتی الامکان سعی کروں۔''

ظرافت اور مزاح برطرف ــــ یہ جائے عبرت ہے ہماری یونی ورسٹی کی لڑکیوں کے لیے ــــ وہ گھر سے بن ٹھن کر نکلتی ہیں، اگر کوئی شریف آدمی ان کے ''میک اپ'' کو یا ان کے بھڑک دار لباس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ کر، ان کے ذوق کی ایک خاموش داد دینا چاہتا ہے تو ان کی حسین اور نازک پیشانیاں تیوریوں کی وجہ سے بدنما ہو جاتی ہیں۔ آپ کسی لڑکی کے ساتھ ذرا جھک کر اور مسکرا کر بات کرنا چاہیں تو اوّل تو حوا کی وہ انوکھی بیٹی کچھ جواب ہی نہ دے گی۔ اور اگر کچھ فرمائے گی تو آپ کے چہرہ کی طرف ہرگز نہ دیکھے گی۔ ذرا بھی مسکرانے کی کوشش ہرگز نہ کرے گی۔ بلکہ ایک متکبرانہ انداز

کے ساتھ سیدھی چلی جائے گی۔ آپ اس کے جیک کی طرح دم ہلاتے اور دانت دکھلاتے ہوئے پیچھے بھاگتے چلے جایئے۔ آپ ان میں سے کسی کی گری ہوئی پنسل یا رومال اٹھا کر دے دیجئے تو وہ ایک مرتبہ بھی آپ کا شکریہ ادا نہ کرے گی۔ ان کے نزدیک آپ اوّل درجہ کے بدمعاش، بدطینت، آوارہ، اوردل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ اور آپ سے بات کرنے میں وہ اپنی ہتک سمجھتی ہے۔

اس حسین دوشیزہ کا یہ فعل اس کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی کا ایک ناقابل رد ثبوت تھا۔

اگرچہ وہ بہت زیادہ شرمیلی تھی، تاہم میرا ہر لفظ ہمہ تن گوش ہو کر سنتی اور میری ہر بات کا جواب دیتی تھی۔ پس میں اِدھر اُدھر کی باتیں۔ چھوٹے چھوٹے لطیفے، گپ شپ، فلموں، ایکٹروں اور ایکٹرسوں پر ہلکی تنقیدیں، دبی دبی مسکراہٹیں، ہماری نظروں کی گستاخیاں، اور وہ پری مجسم شرم و حیا، گویا ایک طرح سے سر تسلیم خم، واقعی کمبخت اکبر درست کہتا تھا۔ ''اس شیروانی میں تمہارا حسن خوب کھلتا ہے''

تماشہ کے دوران میں فلم کے بعض پہلوؤں پر اس نے نہایت مدبرانہ رائے کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ متاثر وہ تب ہوئی جب ماتا ہری نے ایک افسر کے ساتھ جس سے وہ تہِ دل سے محبت کرتی تھی، رات بسر کی، ماتا ہری کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ اس کی حقیت ایک مخبر سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بات اپنے عاشق سے چھپا نہ سکتی تھی۔ اس کا ننھا دل اس بات کی تاب نہ لا سکا اور وہ بغیر اپنے عاشق کے علم کے ایک تحریر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس تحریر کا مفہوم غالباً کچھ اس طرح سے تھا۔

''میرا دل چور چور ہو رہا ہے   تم نہیں جانتے، آہ! کہ میں کون ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ میری نازک اندام حسینہ کی آنکھیں ڈبڈبائی سی جا رہی ہیں۔ مجھ پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ میں نے اسے اپنا رومال پیش کر دیا۔

اس نے پہلے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا۔

پھر بہت زور کے ساتھ رومال میں ناک خشک کی اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے رومال لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

دس منٹ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا میں نے بیرے کو بلایا، وِمٹو کے دو گلاس منگوائے پھر ہم دونوں چاکلیٹ کھاتے رہے، تھوڑی دیر بعد وہ خندہ زن ہو گئی۔

برسات کی تاریک اور خنک رات میں یکایک چاند نکل آیا اور اس کی تابنا کیوں سے فضا منور ہو گئی۔

کھیل ختم ہوا تو ہم باہر چلے آئے۔

پنڈت جی کو توبہ کی جلدی تھی۔ ایک فراٹے کے ساتھ ہمارے قریب سے نکل گئے۔

مولانا ہاتھ میں الفربہ تنبیہ الغافلین تھامے، اب تک آیۃ الکرسی کا ورد کر رہے تھے جب تک کہ پکچر پیلس کی حدود کے اندر تھے بلاؤں کا خطرہ لاحق تھا۔

شتر بھائی (پان کی گلوری کلّے میں دبائے) جگالی کرتے ہوئے باہر نکلے۔

ہم دونوں پکچر پیلس کے پیچھے بار کے قریب کھڑے تھے۔

اُس نے نہایت بانکپن اور خوش ادائی کے ساتھ ایک خوش رنگ لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہی آپ کا پتہ ہے؟''

اُس ستم گر نے مسکرا کر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر، اپنے سر کو اثبات کے طور پر ہلکی سی جنبش دی۔ اس کی کالی ناگن سی زلفیں اس کے رخ روشن پر اور دمکتی ہوئی پیشانی پر پریشان ہو گئیں۔ اس کی یہ طفلانہ ادا میرے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ میں مسحور ہو کر آگے بڑھا۔ مگر وہ دھیرے سے پیچھے کی طرف سرک گئی اور لجا کر بولی۔ ''کوئی دیکھ لے گا۔''

پھر اپنی سائیکل پر سوار ہو کر، کچھ شوخی سے اُس نے مجھ کو الوداع کہا۔ اس وقت اس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موڑ

پر جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں نے بے تابی کے ساتھ لفافہ کھولا، خط نکالا، لکھا تھا۔

"میرا دل چور چور ہو رہا ہے — تم نہیں جانتے آہ! کہ میں کون ہوں۔"

— میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ جیب میں سے وہ چرمی بٹوا جس میں پینسٹھ روپیہ کے نوٹ تھے، غائب ہو چکا تھا۔

یہ افسانہ پہلے افسانوی مجموعہ 'جگا' میں شامل ہے۔

حوّا کی پوتی کا افسانۂ محبت

(اپنے پیش رو رومان نگاروں کی یاد میں)

باوا آدم کو جنت سے نکلے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔

دنیا کو وجود میں آئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، دریا، جنگل، پرندے، درندے، اور انسان سب کی تخلیق ہوچکی تھی۔ زمین وسیع تھی۔ اس وقت آسمان بھی مادرِ مہربان کی طرح زمین والوں پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے تھا۔

فلسفی ماہر اقتصادیات، سیاست دان ، نبی اور اوتار سے دنیا بے گانہ تھی۔ سونا کانوں میں، اور اناج زمین کے سینہ میں مدفون تھا۔ اگر کوئی ان کو دیکھ بھی پاتا تو اس کی خواہش نہ کرتا۔ زمین کے ٹکڑے نہ ہوئے تھے، کوئی شہر، کوئی گاؤں نہ تھا۔ اور نہ کوئی ملک تھا اور نہ محبِ وطن۔ زندگی بہت عجیب شے تھی۔ ہر کسی کے لیے لیٹنے کے لیے جگہ موجود تھی، ہر کسی کے کھانے کے لیے خوراک میسر تھی۔

ہر جان دار چیز کو زندگی کا بہت ہی پیارا احساس تھا، توپ ، بندوق، ٹینک کی آواز سننے کے لیے ابھی لاکھوں برس درکار تھے۔ بادل تک نہ گرجتے۔ بجلی بھی نہ چمکتی تھی، پرشور آبشار تک نہ تھے۔ آسمان سے صرف شبنم گرا کرتی تھی، صرف تاروں کو جھملانے کی اجازت تھی، صرف چھوٹے چھوٹے چشموں کو بہنے کی کھلی چھٹی تھی۔ دریا

تک اپنی لہروں کو اچھال نہ سکتے تھے۔ وہ خاموشی اور وقار کے ساتھ بہہ سکتے تھے۔ تیز و تند آندھیوں کو ایک قدم بھی بڑھانے کی اجازت نہ تھی صرف لطیف جھونکے ہی چل سکتے تھے اور وہ کسی نازک سے نازک پھول کو بھی تکلیف دہ حد تک ہلا نہ سکتے تھے۔ تیز خوشبو، اور تیز رنگ مفقود تھے۔ زندگی کا احساس اس قدر پر مسرت تھا کہ ہر شے رنگ اور بو میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔

زندگی انوکھی تھی۔ شگفتگی اور تازگی ایسے بکھری ہوئی تھی۔ جیسے آج کل گرد و غبار۔ جاندار عجب تجسس نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ ہر وقت ایک دوسرے کے قریب جانے کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔ وہ چلتے تھے تو لڑکھڑا کر۔ کیوں کہ ابھی چلنا کسی نے بھی نہ سیکھا تھا۔ شبنم آسمان سے گرتے وقت رستہ بھول جاتی تھی۔ اس لیے نازک اور رنگین پروں والے پری زاد بچے شبنم کی مٹھیاں بھر بھر کر پھولوں اور پتوں پر بکھیر دیتے تھے۔ ہرنیاں خاموشی سے ان کو یہ کام کرتے دیکھا کرتی تھیں۔

سورج اپنی تمام چمک دمک کے ساتھ منظر عام پر نہ آسکتا تھا۔ وہ روشنی ایسی ہی ہوتی تھی۔ جیسے آج کل ہولی کے دنوں فضا گلال۔ ایسی خواب ناک روشنی میں ہوا کی تین سالہ پوتی اُجلے اُجلے خرگوشوں کے جھرمٹ میں ہنستی کھیلتی نکلی۔ یہ غول کچھ ایسا دل کش تھا کہ گلہریاں درختوں سے اُتر اُتر کھیل میں شامل ہونے لگیں۔ اور سرخ سرخ چونچوں والے بہت ہی چھوٹے چھوٹے طوطے ہوا کی پوتی کے گھنے بالوں میں گھس گھس کر آپس میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ جب وہ اپنی گردن میں گدگدی محسوس کر کے بے تکلفانہ کھل کھلا کر ہنستی تو جنگل کے باوقار درخت جو اپنی کونپلیں بادلوں میں چھپائے تھے جھک جھک کر اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگتے۔

جب شام ہوئی تو ہوا کی پوتی کو اپنی ماں یاد آئی۔ اور وہ رونے لگی۔ تھکاوٹ کے مارے جھکے ہوئے پھول چونک اٹھے۔ معصوم خرگوش اور گلہریاں خاموش ہو کر، اُس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھنے لگے۔ جب وہ رونے سے بھی اکتا گئی تو وہ سوگئی۔ سب سے زیادہ اجلے خرگوش نے اس کے سر کو اپنی پیٹھ پر رکھ لیا۔ گلہریوں نے اس کے بالوں

کی لٹیں رات بھر زمین سے اوپر اٹھائے رکھیں، طوطوں نے اکٹھے ہو کر اس کے جسم کو پروں سے ڈھانپ لیا۔

وہ سو کر اٹھی اور کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

ماں کو وہ جلد ہی بھول گئی۔ کھیل کود میں وقت گذارنے لگی۔ جھیل میں نہاتی، پھل کھاتی، اور پرندوں کے رسیلے گیت سنتی۔

وہ ندی کے کنارے بڑی سی چٹان پر پیٹ کے بل لیٹ جاتی۔ رنگ برنگ کی مچھلیوں کے دھوپ میں چمکنے کا تماشہ دیکھتی۔ پانی میں بہتے ہوئے پتوں پر بیٹھے ہوئے ٹڈوں کو بلاتی، چھپکلی کے مکھی کے تعاقب میں ناپ ناپ کر قدم اٹھانے سے اس کو بڑی دلچسپی تھی۔ مینڈکوں کی تاک میں بیٹھے ہوئے مکار سانپ اسے اچھے نہ لگتے تھے۔

ہرنیوں کے بچے، خرگوش، گلہریاں، طوطے، کوئلیں، سب اس کی رفاقت کا دم بھرتے اور کھیل کھیلنے میں اس کے ساتھی تھے۔

اس طرح بڑھتے بڑھتے وہ جوان ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے، بال گھنے اور لانبے، جسم سڈول، مضبوط اور تنا ہوا۔

شبنم، دھوپ، برف پوش چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ہوا، اور پھولوں کی وافر خوشبو نے مل جل کو اس کی جلد رنگت اور نزاکت کو ترتیب دینے میں حصہ لیا تھا۔

ایک بہت بھاری درخت اس نے اپنی رہائش کے لیے انتخاب کیا۔ اس نے پرندوں کی طرح درخت کی مضبوط شاخوں پر ایک گھونسلہ بنایا۔ جدّت یہ پیدا کی اس پر ایک چھت بھی ڈال لی۔ درخت کی کھوہ میں ایک بوڑھا موٹا الّو اس کا سب سے نزدیکی پڑوسی تھا۔

ایک مرتبہ حوّا کی پوتی درخت سے اتر کر گھومنے کے لیے چلنے لگی تو معاً اس کو

ایک عجیب آواز سی آئی۔ وہ دبک کر چھپ گئی۔ پھر جھاڑیوں میں کسی کے دوڑنے کا شور بلند ہوا۔ اس کے بعد ایک عجیب جانور نمودار ہوا۔ اس کی صورت ایسی ہی تھی جیسی کہ وہ خود۔ فرق تھا تو یہ وہ قد میں اس سے لانبا، اور ویسے بھاری بھرکم تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑے، سینہ فراخ، جبڑا مضبوط اور ٹھوڑی چوڑی تھی۔

اس کے دیکھتے دیکھتے وہ جانور ایک قلانچ مار کر درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کی شاخوں پر کودتا پھرا۔ اس کے گھونسلے میں گھس کر اس کے رکھے ہوئے پھل کھا گیا۔ پھر چھت پر چڑھ گیا۔ اس کے بوجھ سے چھت نیچے آگری۔ اور وہ اچھلتا کودتا غائب ہوگیا۔

اس کے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ بدکردار کی گردن توڑ دیتی لیکن وہ لاچار تھی۔ اس کو اس سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ خیر! درخت پر چڑھ کر اس نے گھونسلے کی چھت درست کی۔

دوسرے دن پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ اگرچہ اب کے اس کی چھت کو نہ چھیڑا گیا تھا۔ لیکن گھونسلے میں رکھے ہوئے پھولوں کا صفایا ہوگیا۔ وہ اس کی حرکتیں چھپ کر دیکھتی رہی۔

اس کے بعد تو یہ رووز کا معمول ہوگیا۔ حوا کی پوتی کے دل میں اس اجنبی کے لیے کشش پیدا ہوگئی۔ ایک جذبۂ یگانگی محسوس ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی منتظر رہنے لگی۔

وہ روز سویرے اٹھتی۔ درختوں سے تازہ پھل توڑ کر لاتی اور ان کو اپنے گھونسلے میں رکھ کر خود پرے چھپ کر بیٹھ جاتی۔ وہ اجنبی حسب معمول آتا اور پھل کھا کر چلا جاتا۔ جب تک وہ وہاں بیٹھا رہتا۔ یہ اُس کو دیکھتی رہتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس کو دیکھتی ہی رہے۔

یہاں تک کہ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اس کے سامنے جائے۔ مگر نہ معلوم کیا جذبہ تھا کہ جس کے ماتحت وہ اس کے سامنے جا نہ سکتی تھی۔ اس کی یہ خواہش شدید سے

شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ اس کے سامنے جائے مگر اس نامعلوم جذبہ پر جس کی وجہ سے وہ اس کے سامنے جانے سے جھجکتی تھی، قابو نہ پا سکی...... بالآخر یہ کشمکش اس قدر بڑھ گئی کہ اُس کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کے دماغ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے اور سینہ پھٹ جائے گا۔

ایک دن تو اس نے تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ اس کے سامنے جائے گی ضرور۔ اُس دن وہ بہت ہی سویرے اٹھی۔ ندی پر جا کر اپنے جسم کو مل مل نہائی۔ پھر جھیل کی پرسکون سطح آب میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ اُس نے دو تین پھول اپنے بالوں میں لگا لیے۔ کچھ پھولوں کا ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لیا۔ اور چند کلیاں اُس نے رس بھرے پھلوں کے ساتھ گھونسلے میں رکھ دیں۔

اس کا ہمسایہ الو پاؤں کی آہٹ سن کر چونکتا مگر سورج کی روشنی میں کچھ دیکھ نہ سکتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اُس کی پڑوسن آج اتنی مصروف کیوں ہے۔

سینہ تھام کر حوا کی پوتی اجنبی کا انتظار کرنے لگی۔

بارہ سنگھوں کے غول کے غول عجب وقار کے ساتھ آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ چند ایک ننھے پری زاد جو رات کو پھولوں پر شبنم بکھیرنے آتے تھے، پھولوں کی خوشبو سے بے ہوش ہو کر پودوں کی پتیوں میں الجھے پڑے تھے۔

پتہ کھڑکتا اور حوا کی پوتی سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ مگر اجنبی ابھی تک نہ آیا تھا۔

ہرنیاں اپنے بچوں کو بھیڑیوں سے خبردار رہنے کی تاکید کر کے چلی گئیں۔ مگر وہ نہ آیا۔ خرگوش پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو کر اشاروں سے اسے بلاتے رہے۔ وہ نیچے نہ گئی مگر وہ پھر بھی نہ آیا۔

دوپہر ہوگئی۔ الو ایک بڑی جمائی لے کر سو گیا۔

وہ بے چاری اکتا کر، اداس سی ہو کر نیچے اُتر آئی۔ اور درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بالوں میں الجھے ہوئے پھول مرجھا کر خشک

ہو گئے۔ مگر وہ اجنبی نا معلوم کہاں رہ گیا تھا۔

یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ گلہریاں اپنی گچھے دار دموں میں لپٹی ہوئی خراٹے بھرنے لگیں۔ ہرنیاں اپنے ننھوں کے پاس واپس آ گئیں۔ وہ نہ آیا پر نہ آیا۔

ہوا کی پوتی بھوکی پیاسی اس کی منتظر رہی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل مایوس ہو گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ کہاں تو رات کی تاریکی سے ڈر کر وہ اپنے گھونسلے میں چھپ جایا کرتی تھی۔ اور کہاں آج وہ بالکل نڈر، کھوئی کھوئی سی بے دھڑک چلی جا رہی تھی۔

ندی کے کنارے پہنچ کر وہ ایک اونچی چٹان پر چڑھ گئی۔ دو زانو ہو کر اس نے ہاتھ چٹان پر ٹیک دیئے اور کل کل کر کے بہنے والے کالے پانی پر نظریں جما دیں۔ چاند کبھی کسی بادل کے بڑے ٹکڑے کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی بڑی آب و تاب کے ساتھ باہر نکل آتا۔

نا معلوم کتنی دیر تک وہ وہاں بیٹھی رہی۔ چاند بدلی کے پیچھے جا چکا تھا۔ سارے جنگل پر ایک پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ صرف جھینگروں کے بولنے کی آواز فضا کو اور بھی زیادہ پر اسرار بنا رہی تھی۔

ایک تاریک سایہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر سایہ نے جست لگائی اور ہوا کی پوتی کی گردن کو جا دبوچا۔ وہ دل دوز چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

چاند بدلی کے پیچھے سے نکل آیا۔

روشنی میں ہوا کی پوتی نے دیکھا کہ جس اجنبی کی وہ صبح سے منتظر تھی۔ اُس کے لانبے ناخن اس کی گردن میں پیوست ہو چکے تھے۔

شکاری اپنے شکار کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ہوا کی پوتی بے ہوش ہو کر چٹان پر گر پڑی۔

ساری رات وہ پڑی رہی۔ اس کی گردن سے خون بہتا رہا۔ رات بھر اجنبی بہت

ہی بے چین رہا۔ وہ اپنے منہ کی ہوا سے اس کو گرم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

رات ختم ہونے کو تھی۔ ہوا کی پوتی کی آنکھ کھلی۔ اُس نے اجنبی کی آنکھوں میں آنسو اور اس کی حرکات میں بے چینی دیکھی۔ اُس نے محبت سے بازو پھیلا دیئے۔ اجنبی نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ وہ اس قدر زیادہ نقاہت محسوس کر رہی تھی کہ وہ اپنے بازو بھی اچھی طرح سے نہ اٹھا سکی۔

اُدھر صبح کا ستارہ طلوع ہوا، ادھر ہوا کی پوتی کے لب سفید اور پاؤں سرد پڑ چکے تھے۔

اس دن سے بادل کڑکنے اور بجلی چمکنے لگی۔ آندھیاں چلنے لگیں۔ پُرشور نالے بہنے لگے۔ سمندر موجیں اچھالنے لگی۔ زمین لرزنے لگی۔

اس ندی کی بڑی بوڑھی مچھلیاں اپنے ننھوں کو یہ کہانی سنایا کرتی تھیں۔ اور کہا کرتی کہ وہ نوجوان اجنبی اکثر آتا اور گھنٹوں چپ چاپ اس چٹان پر بیٹھ کر کچھ سوچا کرتا۔

چاند کا بیان ہے کہ یہ دنیا کی سب سے پہلی داستان محبت ہے اور یہ اس کی آنکھوں دیکھی بات ہے۔

یہ افسانہ، افسانوی مجموعہ 'جگا' میں شامل ہے۔

شہناز

آگے برساتی ندی تھی ایک میل چوڑی —

کوچوان نے بگھی روک لی۔ گھوڑے تھرتھرائے اور سر گھما گھما کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔ کوچوان نے کچھ کہنے سے پہلے' جھک کر بگھی کے اندر کی طرف جھانکا مگر دونوں عورتیں سو رہی تھیں...... ایک کی عمر ہوگی تقریباً پینتالیس برس۔ چہرہ، جوانی کے عالم میں آ کر خوب صورت نہیں تو بدصورت بھی نہ ہوا ہوگا۔ اب وہ دادی تو نہ معلوم ہوتی لیکن ایک خوش مزاج ماں ضرور نظر آتی تھی۔ اس کے ہمراہ اس کی بوڑھی خادمہ تھی، کہنے کو خادمہ لیکن عورت اس کی گود میں پلی تھی۔

موسلا دھار بارش میں کوچوان کو اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔ دروازے کے قریب آ کر چلّایا۔ ''بیگم صاحب......''

دونوں نیند میں مدہوش...... بڑھاپے کی نیند!

''بیگم !!''

بڑھیا نے جماہی لی۔

''آگے ندی ہے...... پانی چڑھا ہوا ہے۔''

دوسری عورت کی آنکھ بھی کھل گئی۔ کوچوان کے ابروؤں سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔

"بیگم ایسے میں پار جانا مشکل ہے۔"

بڑھیا نے گردن بڑھا کر ندی کا پانی دیکھنا چاہا، لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دیا۔

"پانی اتر رہا ہے۔ دن ہونے تک کافی اُتر جائے گا۔"

عورت نے بجلی کی چمک میں گھڑی دیکھی۔ تین بجے تھے۔ آخر وہ پناہ کس جگہ لے سکتے تھے؟ گاڑی گھماؤ۔

گاڑی گھمالی گئی اور وہ ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

جگہ سنسان تھی شہر کی سول لائنز سے بھی باہر ایک اکیلی کوٹھی نظر آتی تھی لیکن بے جان پہچان کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے دو تین جانور سڑک کاٹ کر بھاگے۔ گھوڑے بدکے۔ چابک کھانے پر بھی بجائے آگے بڑھنے کے الٹے قدموں چلنے لگے۔ ایک دفعہ تو اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش بھی کی۔ بگھی ایک گھنی باڑ میں گھس گئی۔

"کیا ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"حجور گھوڑے بدک گئے ہیں آگے نہیں بڑھتے۔"

"ہائے اللہ!...... وہ عورت روہانسی ہو کر چیخی۔

گھوڑوں نے پھر ہنہنا کر زور مارا بگھی باڑ کے اندر ہی گھستی چلی گئی۔ عورتیں گھبرا کر نیچے اتر آئیں۔ گرم گرم کمبلوں میں سے یک لخت بارش میں "چھتری! چھتری!!"

خادمہ نے چھتری اس کے سر پر تان دی۔

"ہو ہو کون ہے؟" ایک لمبے تڑنگ آدمی نے پھاٹک میں سے لالٹین آگے کرتے ہوئے گردن بڑھائی...... پھر وہ لٹھ لیے ہوئے آگے بڑھا۔ "کون ہو بھائی کیا معاملہ ہے؟"

"کچھ نہیں بھیا گھوڑے بدک گئے ہیں۔ جنانہ ساتھ ہے۔"

"ارے بیٹا پار جانا تھا۔ ندی میں پانی ہے۔ گھوڑے بگڑے ہوئے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے۔" خادمہ نے تائید کی۔

نووارد جو صورت سے دربان معلوم ہوتا تھا پہلے منہ کھولے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کو اصل معاملے کی اہمیت کا احساس ہوا۔

''بھئی اگر کہو تو ہم اندر چلے آئیں گھڑی کی گھڑی بارش تھمے تو چل دیں۔''

دربان اپنا کدّو سا سر انکار کے طور پر ہلانے کو ہی تھا کہ خوش پوش عورت نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔ ''بھائی ہم شریف لوگ ہیں۔ کوئی چور چکار نہیں...... اگر تم اجازت دو تو......''

عورت سمجھدار تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کے اشخاص کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔

''سریپ تو آپ بے سک ہیں...... پھرنا کیسے کہیں؟'' اس نے پھاٹک کھول دیا۔

عورتیں تو کوٹھی کی طرف بڑھیں اور وہ دونوں گھوڑوں کو آگے پیچھے سے ہانکنے لگے۔ بہ ہزار دقت بگھی سائبان کے نیچے پہنچی۔

برآمدے میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں عورتیں ٹھنڈے ٹھنڈے گدوں پر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئیں۔ دربان نے بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہوگئی۔

عمارت سرخ رنگ کی تھی۔ دیواروں پر بیلیں اور کائی جمی ہوئی تھی۔ جگہ بہت وسیع تھی ایک اونچی اور گھنی باڑ کوٹھی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

دربان ابھی تک متجسس نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش پوش عورت کے کپڑوں اور اس کی صورت سے بہت متاثر ہوا۔ عورت کی شکل سے متانت اور شرافت ٹپکتی تھی۔ رنگ سرخی مائل، جسم کچھ بھاری سا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز اور طرزِ گفتگو میں ایک خاص وقار پایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دربان کو قطعاً یقین ہوگیا کہ وہ ''سریپ'' ہیں...... اور وہ وہاں سے کھسک گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوا۔ ''آپ لوگ اندر چلیے مالک نے بلایا ہے۔''

''اندر......؟'' خوش پوش عورت سوچ میں پڑ گئی۔ ''کیا اندر عورتیں ہیں؟''

''جی نہیں عورت یہاں ایک بھی نہیں۔''

''تو پھر ہم اسی جگہ ٹھیک ہیں۔ کوئی ہرج نہیں ہم آرام سے ہیں۔''

''مگر مالک بولتے ہیں آپ لوگوں کو اندر بٹھلایا جائے۔''

''کون ہیں تمہارے مالک؟''

''............''

''اچھا تو بوڑھے ہیں اکیلے رہتے ہیں؟ کوئی بچہ کوئی عورت وغیرہ کوئی بھی نہیں۔''

''کوئی بھی نہیں۔''

عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا۔

''بہت سریپ ہیں ہمارے مالک، آپ کی طرح سریپ۔''

عورت کو دربان کی اس بات سے دھوکے کی بو نہیں آئی۔ مگر دونوں عورتیں نامعلوم خوف کا احساس کرتی ہوئی اندر جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

برآمدے میں اوپر کی طرف وسیع سیڑھیاں تھیں۔ دربان ان پر چڑھنے لگا۔ آگے ایک بہت بلند دروازہ تھا۔ دربان نے دروازے کے تختوں کو باری باری کھولا اور خوش رنگ پردوں کو ہٹادیا۔

پہلا کمرہ بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے دروازے، عام دروازوں کے برابر کھڑکیاں، اونچی چھت، فرش پردری، غالیچے، کوچ، خوش رنگ بھاری پردے، دیواروں پر قیمتی تصاویر، عمدہ فرنیچر۔

دربان کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھتی گئیں۔ بڑے کمرے کے بعد ایک تنگ لیکن طویل کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ روشنی بھی مدھم تھی۔ اس کے بعد جو دروازہ کھلا تو آنکھیں چندھا گئیں۔

تیسرا کمرہ چھوٹا مگر سجا ہوا تھا۔ سجاوٹ میں بھی سادگی اور عمدہ ذوق نظر آتا تھا۔ ایک طرف ایک بھاری میز تھی، اس پر کاغذات، کتابیں، انسائیکلو پیڈیا، ڈکشنریاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ الماریوں میں بے شمار کتابیں۔ صاحب خانہ علم و ادب کا شوقین معلوم ہوتا تھا۔ ایک طرف بڑا تخت جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور کونوں پر دو گاؤ تکیے۔

عورتیں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ دربان رخصت ہوگیا۔

بغل کے دروازے کا پردہ اٹھا۔ ایک پچاس پچپن سال کا بوڑھا تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک ہوئی۔

"آپ کو ہماری وجہ سے یقیناً بڑی تکلیف ہوئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو جگایا جائے۔ نوکر نے ہماری رضا مندی کے بغیر آپ کو جگا دیا۔" عورت نے معذرت چاہی۔

مطلقاً نہیں، میں آج کل چار پانچ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سو سکتا۔ یوں سمجھئے میں دس بجے کے قریب سوجاتا ہوں۔ تین بجے سے پہلے یا اس کے لگ بھگ جاگ اٹھتا ہوں...... البتہ اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو انتظام ہوسکتا ہے۔"

"شکریہ ہم سوئیں گے نہیں۔" عورت نے اپنے سامان کا خیال کرتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ ابھی تک اس کو کھٹکا تھا۔ پالم پور سے آگے میرے ایک عزیز ہیں انہیں ملنے کے لیے جارہے تھے۔ ابھی ابھی گاڑی سے اُترے تھے، خیال تھا صبح تک پہنچ جائیں گے، راستے میں آپ کی ندی حائل ہوگئی۔"

بوڑھا ہنسا۔ "جی ان برساتی ندیوں کا کچھ اعتبار نہیں...... یہاں سے قریب بائیس میل مغرب کی طرف موتی چور جنگل ہے۔ ایک مرتبہ ہم وہاں شکار کھیلنے کے لیے گئے موسم برسات کا تھا۔ واپسی پر ایک برساتی ندی میں سے ہوکر گزرے۔ شام کا وقت تھا،

ندی میں پانی معمولی تھا۔ طے پایا کہ رات ندی کے کسی ٹیلے پر بسر کی جائے۔ ایک چٹان پر چڑھ گئے۔ مطلع صاف تھا۔ چھ سات گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو دیکھتے کیا ہیں کہ ہر طرف پانی ہی پانی...... لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا...... ہم کو تو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پانی چٹان کے اوپر سے ہوکر نہ گزر جائے۔ لیکن بچ گئے...... برساتی ندیاں جلد ہی اتر جاتی ہیں۔ اگر صبح تک پانی نہ اُترا تو آپ پل پر سے چلے جایئے گا۔ پانچ چھ میل کا چکر تو ضرور پڑے گا۔"

"آپ کو شکار کا شوق ہے؟" عورت نے بات کا رُخ بدلا۔

"شوق؟ شوق تو بہت تھے۔"

خادمہ آتش دان کے پاس جادراز ہوئی آرام کرسی پر۔ کمرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ عورت نے بوڑھے کی طرف غور سے دیکھا۔ میانہ قد، چہرہ پر گہرے نقوش، چھوٹی چھوٹی داڑھی، زردی مائل سفید بال، لب و لہجہ میں متانت، نشست و برخاست سے مہذب۔ جسم کے ڈھانچہ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانہ میں اچھا خاصہ مضبوط شخص ہوگا۔

"میرا خیال ہے آپ کے کپڑے بھیگ گئے ہوں گے۔"

"قطعاً نہیں، ہم گاڑی کے اندر تھے، چھاجوں پانی برس گیا۔ لیکن ہم محفوظ رہے، گاڑی سے اترتے وقت دوچار چھینٹے ممکن ہے پڑ گئے ہوں۔ سوان کا کچھ مضائقہ نہیں۔"

بوڑھے نے سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ آپ کی والدہ ہیں۔"

"نہیں خادمہ ہیں لیکن میں ان کو اماں ہی کہتی ہوں، جب میں چھوٹی سی تھی اس وقت یہ جوان تھیں۔ میں ان کے ہاتھوں میں ہی بڑی ہوئی۔"

کچھ دیر سکوت رہا۔

"عجب اتفاق کی بات ہے۔ چار برس سے میرے ہاں کوئی شخص بطور مہمان کے نہ آیا تھا......"

"آپ کا کوئی عزیز نہیں ہے؟"

''نزدیکی کوئی بھی نہیں...... دور کی رشتہ داریاں آپ جانتی ہیں......''

''آپ اس جگہ بالکل تنہا رہتے ہیں؟''

''بالکل۔''

''آپ علم و ادب کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرے شوق محدود نہیں تھے، اب تو میں کمزور ہو چکا ہوں۔ اس لیے وہی شوق باقی رہ گئے ہیں جن میں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ موسیقی سے مجھ کو لگاؤ ہے۔ میں جوانی میں بنسری اور ستار بجالیا کرتا تھا۔ شکار کا مجھ کو خاصہ شوق تھا۔ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اگرچہ میں نے شعر کبھی کہے نہیں، ادب سے بھی شغف رکھتا ہوں، فلسفہ میرا محبوب مضمون ہے، مصوری سے مجھ کو عشق ہے میں اپنے واٹر کلر اور آئلز کے کام دکھاؤں گا۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں گی۔''

''شکریہ! کیا سامنے کی تصویر وین گف کی ہے؟''

''جی ہاں! تو گویا آپ بھی ان چیزوں سے دلچسپی رکھتی ہیں؟''

عورت مسکرائی، مسکرانے میں اس کی آنکھوں کے گوشوں کی مدھم جھریاں گہری ہوگئیں۔ ''بس دلچسپی ہی رکھتی ہوں...... دلچسپی رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں تو مجھ کو ادب سے بھی ہمیشہ سے لگاؤ رہا ہے۔ لکھا وکھا کبھی نہیں، پڑھنے کا شوق البتہ ہے۔''

''سچ پوچھیے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دو بوڑھی عورتیں، خیر آپ اتنی بوڑھی نہ سہی، اور ایک بوڑھا کیوں کر وقت گزار سکتے ہیں...... لیکن یہ معلوم کر کے کہ آپ ادب اور آرٹ سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجھ کو بے حد خوشی ہوئی......''

''ذرہ نوازی ہے آپ کی، آرٹ اور ادب تو بڑی چیزیں ہیں۔ میں کس شمار میں ہوں بھلا۔''

بوڑھے کے لبوں پر پسندیدگی کی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''وین گف میرا محبوب مصور ہے۔ مجھ کو اس کی شوریدہ سری بہت مرغوب ہے جتنا زور اس کے کاموں میں ہے شاید

ہی کسی اور کے ہاں ہو۔ یہ سامنے کی تصویر اس کی مشہور تصویروں میں سے ہے، آسانی کے لیے ہم اس کو تین حصوں میں تقسیم کیے لیتے ہیں۔ آسمان پہاڑ اور آگے والے کھیت۔ تصویر میں ایک چیز آپ کو غالب نظر آئے گی۔ ایک ابتری سی، بے چینی سی، شوریدہ سری سی، آسمان کو دیکھیے، بادلوں کے سلسلے کیسے اُچکے پڑتے ہیں، کس قدر جان دار معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے حرکت کر رہے ہوں۔ یہی کیفیت پہاڑوں کی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا پتھر گھومتا بھاگتا نظر آتا ہے، چٹانیں جیسے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی ہوں۔ کتنی تیز رفتاری کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر میدان میں اُگی ہوئی فصل پر نظر ڈالیے۔ جیسے پودے ہوا کے ایک ہی تند جھونکے کے ساتھ آسمان کی طرف اڑ جائیں گے اور وہ پیڑ جیسے آگ کی چتا، اور پتے شعلے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی تصویروں کی اس پریشانی، اس بے چینی، اس حرکت، اس زور کا میں دلدادہ ہوں یہ سب کچھ اس کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کم بخت نے برش نہیں تلوار چلائی ہے۔ جیسے رنگوں کو ایک چکر دے دیا گیا ہو اور جیسے ابد تک وہ گھومتے ہی چلے جائیں گے۔''

عورت نے بوڑھے میزبان کی حرکات اور اس کے لہجہ میں جوانوں کے سے جوش کا احساس کیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ کمرے کی ست فضا میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔

''میں سمجھتی ہوں کہ یہ آپ کے جذبات کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ورنہ آپ اس قدر یگانگت کا احساس نہ کرتے...... آپ خود بھی بڑے جوشیلے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی اس کی ہنسی کشش سے خالی نہ تھی۔

بوڑھے نے گھنی بھنوؤں کے نیچے سے اپنی پلکوں کو اٹھایا، اس کے چوڑے جبڑے کو حرکت ہوئی، اس کی ٹھوڑی آگے کو بڑھی۔ منہ کھلا پھر وہ منہ سے ایک ہلکی سی چٹاخ کی آواز نکال کر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کو ایک ذہین اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے والی عورت سے واسطہ پڑا ہے۔

''بہتر ہو اگر ہم کافی منگالیں...... آپ کافی پسند فرمائیں گی یا چائے۔''

''جو آپ پسند فرمائیں۔''

''تو کافی رہے...... بڑی بی تو اونگھنے لگیں۔''

نوکر کو بلا کر کافی کے لیے کہا گیا۔ مہمان عورت کے دل سے بے گانگی کا احساس دور ہونے لگا۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میز بان نے کہنا شروع کیا۔''آپ درست سمجھیں میرا جوش جسمانی کم تھا ذہنی بہت زیادہ۔ میرا دماغ تو ایک کوہِ آتش فشاں سے کم نہ تھا۔ ایک ایسا درد، ایک ایسی جستجو، ایک ایسی کرید لگی رہتی تھی۔ جس کی میں تشریح نہیں کرسکتا تھا۔ میں تنہائی پسند تھا۔ مجھ کو ایک آدھ دوست کی صحبت پسند تھی۔ میرا ایک ہی دوست تھا، مہندر۔ مہندر ان دنوں کیمبرج اسکول میں پڑھتا تھا، ہمارے اسکول کی عمارت بالکل سفید تھی۔ شہر سے دور، ایک چوڑی برساتی ندی کے کنارے پر دور پہاڑ پر بسے ہوئے شہر کی زرد زرد عمارتیں نظر آتی تھیں۔ کالی راتوں کو جب اس پہاڑی شہر پر برقی روشنیاں جگمگاتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے وادی کے سب جگنو روٹھ کر پہاڑ پر جا اکٹھے ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی کسی پہاڑ کی برف پوش سر بلند چوٹی ایسے دکھائی دیتی جیسے کوئی شہزادی سفید تاج سر پر رکھے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں دیکھ رہی ہو۔ یوں تو پہاڑ بالکل قریب نظر آتے تھے۔ لیکن جوں جوں ہم ان کی طرف بڑھتے وہ پیچھے ہٹتے جاتے۔ ہم کو ان دنوں قدیم یونان و روما کے بہادروں کے قصے پڑھائے جاتے تھے۔ اس لیے ہم پر ایسے مناظر دیکھنے سے ایک رومانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ندی پار سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ میں عموماً سرخ سویٹر، نیکر اور فل بوٹ پہنا کرتا تھا۔ کسی خنک شام کو راستے میں جینی ہماری ہم جماعت جسے میں پیار سے سائیکی کہا کرتا تھا، سفیدے کے درختوں تلے گھومتی اور لیچیاں کھاتی دکھائی دے جاتی تھی —— اسے میرا سرخ رنگ کا سوئیٹر بہت پسند تھا۔ جینی کو دیکھتے ہی میں اس کے بٹن جان بوجھ کر کھول دیتا اور اس کے قریب

جا کر کہتا اچھی سائیکی! ہمارے بٹن تو لگادو ذرا جینی اپنی چمکیلی آنکھیں مٹکا کر ہنستی، اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے بٹن لگا دیتی اور کہتی۔ ''تم...... مجھ کو یقین ہے بڑے ہوکر جیسن (Jason) بنوگے، اور میں اکڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب کبھی کوئی بڑا سا چمگادڑ اپنے پر پھیلائے ہمارے سروں سے گزر جاتا تو ہم سوچتے ممکن ہے یہ پری آس ہی ہو، اب شاید میڈوسا کا سرکاٹ کر اڑا جارہا ہے۔ جنگل کی جھاڑیوں میں گھومتے وقت خیال آتا۔ ممکن ہے، اپالو اپنا رتھ چھوڑ کر یہیں کسی جگہ آن بیٹھا ہو، حسن اور موسیقی کا دیوتا، دفنی کا ناکام عاشق، اسے دیکھ پائیں تو شکایت کریں کہ تمہاری داستانِ عشق والا سبق بہت مشکل ہے...... اور وہ آہ سرد بھر کر خاموش ہوجائے— بھلا اس کے لیے وہ سبق کب آسان تھا، ہم چشمے کے قریب بیٹھ جاتے— ہوا زیادہ خنک ہوجاتی، درخت سائیں سائیں کرنے لگتے، دور چائے کے باغیچوں سے گیدڑوں کی ہوا ہو، ہوا ہو کی صدائیں بلند ہوتیں۔ پہاڑوں کی اوٹ سے چاند نکل آتا۔ اور اس کا عکس پانی میں دکھائی دینے لگتا...... اسے بھی نارسس کی طرح پانی میں اپنا چہرہ دیکھنے کا بہت چاؤ تھا۔ مگر یہ شوق تھا برا— نارسس بہت ہی حسین لڑکا تھا، شفق گوں گال، گہری چمکیلی آنکھیں، میلے سونے کے سے بال۔ اس نے ایک مرتبہ اپنا عکس پانی میں دیکھ لیا اور اس صورت پر فریفتہ ہوگیا، وہ بلاناغہ گھنٹوں پانی میں اپنا عکس دیکھا کرتا، آخر یہ جنون رنگ لایا، وہ وہیں مرگیا۔ تڑپ تڑپ کر اور...... وہ آسکر وائلڈ کے الفاظ یاد کیجیے۔ جب نارسس مرگیا تو وادی کے حسین پھولوں کے دلوں پر غم و اندوہ کی گھٹائیں چھاگئیں، وہ اس چشمے سے پانی مانگنے لگے تاکہ وہ اس کے ماتم میں آنسو بہا سکیں— آہ، چشمہ نے جواب دیا، اگر میرے پانی کے قطرے آنسو ہی ہوتے تو بھی نارسس کو رونے کے لیے ناکافی تھے— مجھے خود اس سے عشق تھا۔ تم بھلا اس سے محبت کیے بغیر کیوں کر رہ سکتے تھے۔ پھولوں نے کہا اتنا حسین تھا وہ— کیا وہ واقعی حسین تھا؟'' چشمہ نے پوچھا۔ اس بات سے تمہاری نسبت اور کون زیادہ آگاہ ہوسکتا ہے، پھول بولے کیوں کہ بلاناغہ پیٹ کے بل لیٹ کر وہ

تمہاری سطح پر اپنا عکس دیکھا کرتا تھا...... اگر میں اس سے محبت کرتا تھا۔" چشمہ نے جواب دیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ جب وہ مجھ پر جھکتا تھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے ہی حسن کی جھلک نظر آجایا کرتی تھی۔"

مہمان عورت بڑے انہاک سے میزبان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آتش دان میں آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بارش کے شور میں بوڑھے میزبان نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "آہ وہ وادی گیاہ وگل وہ فرحت انگیز اور عطر بیز ہوائیں جہاں بہار ایسے آتی تھی جیسے دیوی وینس دبے پاؤں، تبسم برلب، بھیگی راتوں کو جوپیٹر کی خواب گاہ میں جا گھستی تھی، دیکھتے دیکھتے برف پگھل جاتی، پہاڑیاں اور ٹیلے مخملی لباس میں کھڑے نظر آتے، رنگ برنگ کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ آن جمع ہوتے، ذرے ذرے میں حسن و شباب انگڑائیاں لینے لگتا، دن کے وقت سورج چمکتا، خاموش راتوں میں چاند اپنی آب و تاب دکھاتا۔ کتنا قیامت خیز! کس قدر حسین!! حسن آنکھ جھپکتے میں نیست و نابود ہوجانے والا قہر ہے۔ یہ ایک خاموش فریب ہے...... آہ اب از سرِ نو قہر سہنے کی تمنا دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اب پھر فریب کھانے کو جی مچلتا ہے......"

بات ختم کرلینے کے بعد بھی میزبان کا منہ کھلا رہا۔ جیسے ابھی وہ کچھ کہنے کو ہے لیکن پھر سرکو حرکت دے کر چپ ہوگیا۔ عورت چند لمحوں تک اس کی آواز کی مترنم گونج سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر عورت نے کافی کی پیالی بڑھادی۔

"شکریہ۔"

"یہ تھا آپ کا بچپن۔"

میزبان خاموش رہا۔ لیکن بُشرے سے ظاہر تھا کہ اس نے سوال سنا ہے مگر وہ اثبات میں جواب نہ دیناچاہتا تھا۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تو اسے بہت کچھ کہنا تھا۔

"کیا بیتے ہوئے زمانے کی حسرت ابھی تک دل میں ہے؟"

میزبان ہنسا۔ ''آپ کے سوالات اور میرے جوابات سے ظاہر ہوتا ہے جیسے آپ مجھ سے انٹرویو کرنے آئی ہیں— آپ میری مہمان ہیں میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے دل کے بہلانے کا سامان کروں۔ آپ اپنی زندگی کے حالات اس طرح بتانے پر شاید ہی راضی ہوں۔ لیکن آپ تعلیم یافتہ ہیں، یہی سبب ہے کہ ہم اتنے تھوڑے عرصہ میں دو بے تکلف دوستوں کی طرح تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔''

''میں واقعی بہت محظوظ ہو رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر عورت اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ میزبان بھی اس مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

کافی پینے کے بعد دونوں آرام کرسیاں گھسیٹ کر آتش دان کے نزدیک ہو بیٹھے۔ بارش کی بوچھاڑ کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جل رہی تھیں کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم اصل موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ اپنی بابت کچھ بتا رہے تھے۔''

''جی وہ بات میں ختم کر چکا—''

''میں آپ کے بچپن کے حالات کو باب التمہید سمجھی تھی۔''

''تمہید؟ ہا ہاہا— جی نہیں بہت دنوں بعد گفتگو کا موقع ملا تھا اس لیے آج ہی غبار نکال لیا۔''

''میرے خیال میں اسے رومانی بچپن کے بعد زندگی کے تلخ حقائق نے آپ کے رومان انگیز نظریہ حیات کو تو ملیا میٹ کر دیا ہوگا۔''

کچھ سوچنے کے بعد بوڑھے نے جواب دیا۔ ''سچ پوچھیے تو زندگی کے وہ حقائق جن کو عام طور پر حقائق سمجھا جاتا ہے، ان سے میں اتنا متاثر نہیں ہوا۔ زندگی میں تنگ دستی بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔ مگر مجھ پر اس کا کبھی گہرا اثر نہیں ہوا۔ میں بے کار بھی رہا۔ بھوکا پیاسا بھی رہا، لیکن یہ ایسی فروعی چیزیں تھیں۔ جن سے میں زیادہ اثر نہ لیتا

تھا...... میں سمجھتا تھا کہ جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے میں جب چاہوں روپیہ کما سکتا ہوں۔ اگرچہ میں اس شے کا زندگی کی عام ضروریات کے علاوہ حاصل کرنا لازمی نہیں سمجھتا تھا...... اس کا سبب کوئی مہاتما پن نہ تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ میری دلچسپی ہی ان باتوں میں نہ تھی۔ لیکن میں نے زندگی کا کچھ حصہ روپیہ کمانے پر بھی صرف کیا...... کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی۔"

"آخر وہ کیا شے تھی جس کی طرف آپ کا ذہن ایسا منتقل ہوا کہ دوسری باتوں کی سدھ بدھ نہ رہی۔"

بوڑھے نے تامل کیا۔ اس کی گھنی بھنوؤں کے درمیان پیشانی پر سلوٹیں نمایاں ہوگئیں۔ "آپ اس قسم کے سوالات کر رہی ہیں جن کے جواب کے لیے میں تیار نہ تھا۔ مختصراً یہ کہ ایک احساس تنہائی تھا جس نے میرا ذہن سوچ بچار کی طرف منتقل کردیا۔ اور یہ احساسِ تنہائی اس لیے نہیں تھا کہ دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ بلکہ اس لیے کہ میرا جذبہ محبت اس قدر شدید تھا کہ اس میدان میں میرا کوئی بھی حریف نہ تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ میرے خیالات نئے یا دوسروں سے مختلف تھے۔ اس لیے میرا کسی سے سمجھوتہ نہ ہوسکا...... دراصل میں آپ کو سمجھا نہ سکوں گا بس اتنا سمجھ لیجئے کہ میں بالکل تنہا رہا۔ کسی ایسی شئے کا منتظر رہا جس کو میں خود نہ جانتا تھا نہ بیان کرسکتا تھا اور نہ اس کو پا ہی سکا، نہ کسی شخص نے مجھ میں ایسی خوبی ہی دیکھی کہ وہ مجھ کو غیر معمولی اہمیت دے......"

"آپ مایوس ہوگئے ہوں گے، آپ کو کوئی نہ ملا جسے آپ اپنا بنا سکتے۔"

"میں نے کسی سے نہیں کہا کہ وہ میرا بنے...... اور نہ کسی نے از خود اس بات کی ضرورت ہی محسوس کی۔"

"زندگی آپ کے لیے تاریک ہوگئی ہوگی۔"

"یہ بات نہیں ہوئی۔ میری طبیعت میں ایک ضد یا اجڈ پن تھا۔ جس نے مجھ کو زندہ رکھا۔ درحقیقت میری زندگی میں محبت کی کمی ہی رہی۔ زندگی میں محبت کی کمی رہ جانا

ایک پرانی کہانی ہے۔ بہتوں کی زندگی میں ایسا ہوجاتا ہے لیکن میں نے ایک تو بڑی نفرت کے ساتھ تنہا رہنا منظور کرلیا۔ دوسرے اس کا احساس کم ہوجانے کے باوجود اس کے اثرات کم و بیش موجود ہیں...... سب سے زیادہ مایوس کن پہلو اس امر کا یہ تھا کہ میں نے شکست کا اعتراف کبھی نہ کیا اور نہ کبھی اپنے درد کا اظہار ہونے دیا۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کائنات میں میرا وجود یا عدم وجود کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ میری انفرادی زندگی کا مسئلہ بنی نوع انسان کے مسائل میں کچھ بھی اہمیت دیئے جانے کے قابل ہے۔ یہ تو میرے نجی معاملات ہیں، قطعاً میری ذاتی الجھن، جسے آپ کرید کرید کر دریافت کر رہی ہیں۔"

عورت دونوں جڑے ہوئے ہاتھوں پر رخسار ٹکائے کھوئی کھوئی نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھتی رہی۔ "زندگی......"

"ہاں انسانی زندگی کی بابت بھی جو کچھ رائے میں نے قائم کی ہے۔ اس پر میرے ذاتی حالات کا اثر ہے۔ مجھ کو زندگی کے کھوکھلے پن کا سخت احساس ہے۔ میں جانتا ہوں یہ خالص مشرقی خیال ہے لیکن زندہ رہنے کے جواز میں کون سی دلیل ہے جو پیش کی جاسکتی ہے۔ یعنی اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ دراصل زندگی صرف ایک ہی ہے اور کچھ بھی فنا نہیں ہوتا......::

عورت نے تامل کیا۔ "اب بات کا رخ بدل چکا ہے۔ اور شاید اس سے آگے میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں...... لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا آپ خیر و شر پر یقین رکھتے ہیں؟ کیا آپ انسان کی بہبودی پر ایمان رکھتے ہیں۔"

"خیر و شر بجائے خود ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے دائمی اقدار کا قائم کرنا مشکل ہوگا۔ "انسان کی بہبود" ایک بہت ہی مبہم سی بات ہے۔ آخر کہاں ہوگی، انسان یا انسانیت کی بہبود...... لیکن اگر ہم کو زندہ رہنا ہی ہے یعنی اگر ہم زندہ رہنے پر بلا کسی خاص وجہ کے مجبور یا مصر ہی ہیں تو یقیناً ہم کو سوچنا پڑے گا کہ زندہ رہنے کا سر دست

بہترین طریقہ کون سا ہوسکتا ہے؟ اگر یہ بات تشریح طلب ہو تو اور وضاحت کردوں۔

''شکریہ! میں چاہتی ہوں گفتگو ہلکی قسم کی ہو، یہ مسائل تو حل ہونے سے رہے کیوں نہ ہم آرٹ کے موضوع پر ہی گفتگو کریں۔''

بادل خوب گرجنے لگے۔ بجلی تو ایسی کڑکی جیسے کسی جگہ گری ہو۔

'آرٹ کی صلاحیت—— قدرتی طور پر مجھ میں تھی۔ لیکن میں دوسری باتوں سے تنگ آ کر اس طرف متوجہ ہوا۔ میں نے آرٹ کو زندگی کے مسائل کے لیے وقف کردیا۔ اور زندگی کے مسائل کی بابت آپ سن چکی ہیں کہ میرے خیالات کیا ہیں...... تخلیق کرنے میں یقیناً آرٹسٹ کو کچھ پناہ ملتی ہے۔''

عورت سوچنے لگی کہ بات گھوم گھام کر پھر زندگی کے مشکل ترین مسائل کی دلدل میں پھنس جاتی ہے۔ وہ آتش گیر سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو کچوکے دینے لگے۔ بوڑھی خادمہ کی بھی آنکھ کھل گئی اور آگ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھی۔

''اس عمر میں آپ کے احساسات اور بھی شدید ہوگئے ہوں گے۔ آپ کے بال بچے کیا ہوئے!''

بوڑھے نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔ ''بچے! بچے کیسے؟ میں نے شادی ہی کب کی تھی۔ باقی احساسات کے شدید ہونے کی بابت بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ دنیا کسی کی رعایت نہیں کرتی۔''

اس کے بعد بہت دیر تک سکوت طاری رہا صرف بارش کی آواز آتی رہی۔ مہمان اور میزبان دونوں کے سر جھک گئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوگئے۔ بوڑھی خادمہ کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ وہ ان کی خشک باتوں سے قطعی بے نیاز نظر آتی تھی۔

''کیا کبھی کسی عورت سے آپ کے تعلقات پیدا نہیں ہوئے؟'' عورت نے آگ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

میزبان آتش دان کو گھورتا رہا—— تعلقات تو ضرور پیدا ہوئے، ایک دوسرے

کے بہت قریب جانے کا موقع بھی ملا۔ لیکن...... لیکن کسی سے بھی مجھ کو یگانگت کا احساس نہ ہوا۔"

"کسی سے بھی نہیں؟"

بوڑھے میزبان نے ہاتھ ملتے ہوئے کچھ تامل کے بعد مہمان کی طرف دیکھا۔

"سوائے ایک کے......"

"ایک؟"

"جی ہاں ایک۔ لیکن میں نے اس کو دیکھا کبھی نہیں۔ بس قرب کا احساس ہوکر ہی رہ گیا۔ آپ شاید ایک ناکام داستانِ محبت سننے کی توقع رکھتی ہوں لیکن وہ بات نہیں ہے۔"

عورت پھر ایک مرتبہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ "وہ کون تھی؟"

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتا— اس کا نام تھا......"

عورت آگے کو جھک گئی۔

بوڑھے نے فرش پر نظریں گاڑ کر کہا۔ "اس کا نام تھا شہناز۔"

عورت نے دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا اور ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

"مجھ کو اس کی دو چٹھیاں موصول ہوئیں...... اس نے کسی نمائش میں میرے ہاتھ کی بنی تصویریں دیکھیں اور اس کو اس قدر پسند آئیں کہ وہ مجھ کو چٹھی لکھنے پر مجبور ہوگئی، امید ہے کہ برانہیں مانیں گے جواب جلد از جلد دیں وغیرہ۔"

"آپ نے کیا جواب دیا؟"

میں نے...... آپ جانتی ہیں عورتوں سے تعلقات نبھانے کے آداب سے نابلد محض ہوں۔ خیر اس چٹھی کا جواب تو میں نے دے دیا۔ پہلے تو میں نے لکھا کہ "شہناز" اس کا فرضی نام تھا۔ چاہیے کہ وہ اپنا اصل نام اور حالات لکھے۔ پھر میں نے اپنی جدید تصویروں پر اس کی رائے طلب کی، اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ اس کو میرا پتا کہاں

سے ملا۔ آخر میں میں نے لکھا کہ عورتوں سے خط و کتابت کرنے کے آرٹ سے واقف نہیں، آپ کسی بات کا برا نہ مانیں۔"

عورت کی دلچسپی بڑھی۔ "اس نے کیا جواب دیا؟"

اس نے جواب بہت عرصہ کے بعد دیا...... یعنی وہی حوا کی پرانی عادت...... اس نے لکھا...... ذرا ٹھہریئے۔ شاید اصل چٹھی ہی یہیں کہیں مل جائے۔"

بوڑھا اٹھا۔ بڑی میز کی درازیں باہر کھینچ کھینچ کر ٹٹولیں اور ایک قدرے بڑا سا بوسیدہ لفافہ اٹھا لایا۔ "یہ رہی سنیئے۔ جواب غیر معمولی تاخیر سے دے رہی ہوں آپ تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے۔ بخار اور کھانسی نے اتنا طول کھینچا کہ خدا کی پناہ۔ نقاہت بے حد ہوگئی ہے۔ آپ کی ناراضی کا خیال نہ ہوتا تو ابھی خط لکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

"آپ میرے متعلق کیا جاننا چاہتے ہیں؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ جو سوالات کریں گے ان کا صحیح جواب دوں گی۔ نام تو میرا واقعی شہناز نہیں لیکن آپ مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ آپ کے پتے کے متعلق یہ عرض ہے کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے......

مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری جرأت کا برا نہیں مانا......" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد میری تصویر پر تنقید ہے آخری سطور یہ ہیں۔ میں نے وضاحت سے اپنے خیالات ظاہر کردیئے ہیں۔ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

آپ کے خط کی آخری سطور کے متعلق یہ عرض ہے کہ مجھے آپ کے خط سے بڑی مسرت ہوئی، ناگوار کیوں گزرنے لگی کوئی بات۔

"آخر میں غیر معمولی تاخیر کی پھر سے معافی چاہتی ہوں...... آپ کے جواب کا بے حد انتظار رہے گا براہِ کرم دیر نہ فرمائیں۔

منتظر "شہناز"

عورت نے آنکھیں جھپکائیں۔ ''آپ نے کیا جواب دیا۔''

بوڑھا کچھ دیر تک اس کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''ان کو اب تک جواب کا بے حد انتظار ہے۔''

عورت کرسی کے پیچھے کی طرف جھک گئی۔ ''آپ نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا؟''

''ذرا الفاظ پر غور فرمائیے — مثلاً آپ تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے احمق کہیں کی! میری بلا انتظار کرے۔ اس کے بعد اپنی نقاہت اور بیماری کا رونا اور پھر آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا......'' احمق کو دیکھ بھلا مجھ کو ناراض ہونے کا کیا حق تھا؟ پھر اپنی ذات کو اتنی اہمیت دے دی کہ شریف زادیوں کی طرح سیدھی بات نہ لکھ دی کیا نام ہے، کون ہیں، کیا کام کرتی ہیں، کیا شغل ہے، بس دوراز کار بکواس چہ معنی؟''

عورت نے سفارش کے لہجہ میں کہا۔ ''آخر عورت ذات تھی، ممکن ہے کچھ مصلحت مدنظر ہو۔''

''عورت ذات؟ ممکن ہے وہ کوئی چڑیل ہو، ممکن ہے ایک سرے سے عورت کا وجود ہی نہ ہو یوں ہی کوئی حضرت دل بہلا رہے ہوں — آپ ذرا چٹھی کے الفاظ پر غور فرمائیں۔''

''ممکن ہے وہ شریف زادی ہو، آرٹ کی دل دادہ۔ آپ کی دوست — خیر کبھی اس کی یاد تو آتی ہوگی۔''

بوڑھے نے ماتھے پر تیوریاں ڈالیں۔ ''یاد؟ کبھی نہیں میں اس کو ہمیشہ کے لیے بھول گیا بلکہ نفرت کرنے لگا۔

اس بات پر عورت گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ''ارے آپ سوچنے کیا لگیں......
بوڑھا قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

بادل ہلکے ہوگئے۔ بارش قریب قریب ختم گئی۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا۔

پندرہ بیس منٹ کے وقفہ کے بعد بوڑھا واپس آیا۔ ''اب آپ لوگ ناشتہ کرلیں میں نے نوکر کو ناشتہ لانے کے لیے کہہ دیا ہے۔''

مہمان عورت بولی۔ ''اب آپ اجازت ہی دیں تو بہتر ہوگا۔''

ناشتہ پر بھی ادھر اُدھر کی مزے دار باتیں ہوتی رہیں۔ نوکر نے آکر پوچھا کہ کوچوان کہتا ہے کہ گاڑی تیار کی جائے؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔

''آیئے! اتنے میں آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھاؤں۔''

وہ تینوں اسٹوڈیو میں پہنچے۔ ایک وسیع کمرہ تھا اور بے شمار تصویریں واٹر اور آئل کلر میں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ عورت ان کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئی۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ پھر بھی دل نہ بھرا۔ جب وہ جانے کو تیار ہوئی تو بوڑھے نے کہا۔ ''ذرا ٹھہریئے میں کوٹ پہن آؤں پھر نیچے چلیں گے۔''

اس کے چلے جانے بعد دونوں عورتیں پھر تصویروں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ ایک طرف بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ خادمہ نے اس کی چٹخنی کھول دی۔ عورت نے منع بھی کیا لیکن دروازہ کھل جانے پر اندر جھانک لینے میں اس نے کچھ حرج نہ سمجھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اِدھر اُدھر معمولی سامان بکھرا ہوا تھا۔ کاغذات رنگوں کی پیالیاں، پیانے وغیرہ۔ وہ دروازہ بند کرنے ہی کو تھی کہ کمرے میں ایک طرف کو ایک خوشنما پردہ نظر آیا۔ خادمہ کے ساتھ وہ آگے بڑھی اور پردہ ہٹادیا۔ پردے کے پیچھے ایک نہایت حسین دوشیزہ کی قد آدم تصویر بڑے اہتمام کے ساتھ ایک سنہری چوکھٹے میں جڑی رکھی تھی۔ لڑکی اس قدر حسین تھی کہ عورت دم بخود رہ گئی۔ وہ حیران تھی کہ بوڑھے آرٹسٹ نے یہ تصویر ان کو کیوں نہ دکھائی۔ یہی تو اس کا شاہکار تھا، یہ تصویر مکمل کرلینے کے بعد یقیناً بوڑھے نے اور تصویریں بنانا ترک کردی ہوں گی۔ خادمہ تک تصویر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ نیچے چند مدھم حروف نظر آرہے تھے۔ عورت نے آگے بڑھ کر غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔ لکھا تھا ایک لفظ ''شہناز''۔

''شہناز'' عورت کے ہونٹ لرزے۔ بارش میں بھیگی ہوئی گلاب کی دو تازہ کلیاں چوکھٹے کے آگے رکھی تھیں۔

اتنے میں بوڑھے کی آواز آئی۔ ''ہاہاہا...... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ سے صدیوں......'' اس کی آواز بند ہوگئی، وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا...... جلدی سے دروازے کے اندر داخل ہوا اور دیکھا کہ عورت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ''شہناز'' کی تصویر پر پردہ گرانے کی کوشش میں ہے...... بوڑھا اپنا ایک بازو کوٹ کی آستین میں ڈال چکا تھا اور دوسرا بازو...... وہ ہلا ہی نہ سکا......

عورتیں بگھی میں بیٹھ گئیں۔

مہمان عورت نے دوسری مرتبہ ملتجیانہ لہجہ میں بوڑھے میزبان سے پوچھا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟''

بوڑھا خاموش رہا۔ وہ سائبان پر چڑھی ہوئی گھنی بیل کے پتوں سے ٹپکنے والے پانی کے قطروں کی طرف دیکھ رہا تھا...... پھر اس نے کھوکھلی نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھا۔ بے کیف آواز میں آہستہ سے بولا۔ ''شکریہ!......'' اس کا منہ کھلا رہا۔ نچلا جبڑا ذرا سا آگے کو بڑھا جیسے وہ کچھ کہنے کو ہے۔ مگر پھر وہ سر کو جنبش دے کر خاموش ہوگیا۔

پیٹھ موڑ کر، بوڑھا سیڑھیوں پر بھاری قدموں سے چڑھنے لگا۔ اس کے سر کے زردی مائل سفید بال چمک رہے تھے۔ وہ ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے ایک بہت بڑا ٹوٹا ہوا جہاز جس کے بادبان پھٹ چکے ہوں...... ان وسیع سیڑھیوں پر، چوڑے اور بلند دروازے کے مقابل وہ کس قدر چھوٹا اور حقیر نظر آتا تھا......

ایک ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ بگھی چل پڑی اور گھوڑوں کے سموں تلے بجری اڑنے لگی۔

عورت کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں...... پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ یک لخت اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا......

خادمہ اس کے لرزتے ہوئے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

---

[1] یہ افسانہ 'ادبی دنیا' جولائی 1944 میں پہلی بار شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ "تار و پود" میں شامل ہے۔

گرنتھی

"ست نام" یہ الفاظ حسبِ معمول گرنتھی جی کے منہ سے نکلے اور اُن کے قدم رُک گئے۔ لیکن ان کے گھیرے کا لٹکتا ہوا آزار بند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔

"گرنتھی جی! تم کو سو مرتبہ کہا ہے کہ یوں دندناتے ہوئے اندر نہ بڑھے آیا کرو۔ ذرا پرے کھڑے رہا کرو۔ کسی وقت آدمی نا معلوم کیسی حالت میں ہوتا ہے......"

نل کے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی پنڈلی پر شلوار کا پائنچا کھسکا کر ڈھانپ لی۔ اور ایڑیاں رگڑنے لگی۔ گرنتھی کب کا پیچھے ہٹ چکا تھا۔ عورت نے مفت میں رامائن چھیڑ دی۔ اس کا منہ اُوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ منہ اُوپر اٹھائے رکھنے کی بھی اُسے عادت سی ہوگئی تھی۔ اس کی داڑھی بہت گھنی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے گردن کے قریب بال پسینہ سے تر رہتے۔ گردن کا وہ حصہ اس کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ غیر شعوری طور پر منہ اُوپر رکھنے سے ہوا کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا اور اس کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔

وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھا سادا ضرور تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل احمق ہی تھا...... وہ جانتا تھا، آج اس عورت نے وہ بات کیوں کہی 'پنڈلی' آخر پنڈلی میں کیا رکھا ہے۔ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو "یہ سو مرتبہ" کی بھی خوب رہی۔ حالانکہ یہ بات اس کو پہلی مرتبہ کہی گئی تھی۔ وہ ہرگز اس طرح دندناتا ہوا اندر داخل نہ ہو اگر باہر کھڑا رہنے پر اس کی مدھم آواز سن لی جائے۔ اس کی آواز اچھی خاصی تھی لیکن زور سے

آواز دینے پر اس کو ٹوکا گیا تھا۔ '' یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اس قدر حلق پھاڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔'' اگر وہ کھڑا ان کی من پسند آواز میں بڑے ترنم کے ساتھ صبح سے شام تک '' ست نام ست نام'' کہتا رہے تو کوئی اُس کی آواز نہ سن پائے اور نہ اُس کو روٹی دے۔ گوردوارے کے مسافر بھی ایک مصیبت تھے۔ نہ وہ روز روز آویں نہ اس کو روٹیاں مانگنی پڑیں۔ اپنے واسطے تو وہ کبھی بھی روٹیاں مانگنے نہ آئے...... ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے والی کی صورت تو دیکھو۔ یہ تو خیر! اس آفت کی پرکالہ صورت بھی قابل دید تھی۔ جس نے اس پر بدنیتی کا الزام تھوپ رکھا تھا۔ سب سے احمقانہ بات جو اس کی بابت کہی جاسکتی تھی یہ تھی کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بُری نیت سے دیکھا۔ لیکن وہی الزام اس پر لگا کر وہ طومار باندھا گیا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ اتنے میں فتح سنگھ چوکیدار صحن میں داخل ہوا۔

عورت نے بے تکلفی سے پوچھا۔ '' وہ سردار جی گھر پر نہیں؟ وہ آئیں تو کہنا کہ رات کو کنویں پر آجائیں۔'' لسّی کا کٹورا پیش کیے جانے پر وہ اسے ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ گرنتھی کے کندھے سے کندھا بھڑا کر باہر نکل گیا...... عورت کی پیشانی ناہموار ہوگئی۔

گرنتھی ان سب باتوں کا مطلب سمجھتا تھا...... آج اس کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی تھی۔

اس رات گاؤں کے بڑے کنویں پر گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے۔ گرنتھی پر جرح کی گئی اور اگر کوئی بات اس کے حق میں نکل آتی جو جھلاتے...... سب لوگ اس سے خفا تھے۔ کسی کی اصلی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کے گھر والوں کو پرشاد ہمیشہ کم دیا کرتا تھا۔ کسی کے بچّوں کو اس نے گوردوارے کی پھلواڑی اجاڑنے سے منع کیا تھا۔ کسی کے گھر میں جاکر کچھ کام کرنے سے اس کی بیوی نے انکار کردیا تھا لیکن اس پر الزام یہ تھا کہ لاجو ایک دن گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لیے گئی تو اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ــــ لاجو کو گاؤں کے تین سگے بھائی کہیں سے بھگا لائے تھے۔ وہ برائے نام

پردہ داری کے ساتھ تینوں کی بیوی تھی۔ وہ تینوں بے کار تھے جو داؤں لگتا کر گذرتے۔ ایک بھائی نے پنساری کی دوکان کھول رکھی تھی۔ کبھی جلیبیاں نکال لیتے۔ کبھی ایک تانگہ تیار کر لیتے۔ موقع پڑنے پر اچھے پیانے پر چوریاں بھی کرتے، کبھی کسی راہگیر کی گھوڑی چھین لاتے — ''کیوں لاجو! کیا یہ بات درست ہے کہ گرنتھی نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟''

لاجو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کیوں کہ گرنتھی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو گلے لگانے کی کوشش کی۔

''گرنتھی جی تم کو کچھ کہنا ہے؟''

''میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا''

لاجو چمک کر کچھ کہنے کو تھی کہ اُس کو روک دیا گیا۔ ''تو گرنتھی جی آج تم نے لاجو کا ہاتھ پکڑا، کل کسی اور کا آنچل کھینچو گے۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں۔''

''میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا......''

''تم نے کام تو وہ کیا ہے کہ تم کو...... خیر کل شنکرات کا کام بھگتا کر پرسوں یہاں سے چلے جاؤ۔''

گرنتھی واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا— نیند نہ آتی تھی۔

ایک عرصہ تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارے میں گرنتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایک طرف تو تاریخی عمارت' دوسری طرف نئی عمارت بن رہی تھی۔ چک 35 اور چک 36 کا یہ مشترکہ گوردوارہ تھا۔ یہ گاؤں چونکہ ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب تھے۔ اس لیے علاحدہ علاحدہ گوردوارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چڑھاوا بھی زیادہ چڑھتا تھا۔

تھوڑی دیر تک اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ وہ اداس تھی۔ لیکن اس کو اپنے خاوند پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند پر جو الزام دھرایا گیا تھا وہ سراسر

بے بنیاد تھا۔ وہ دونوں اس آفت کا اصل سبب بھی جانتے تھے۔ لیکن لاچار تھے۔ اگر اس جگہ رہنے کا مطلب یہ تھا کہ بات بات میں بے عزتی برداشت کی جائے، اس کی بیوی دوسروں کے گھروں میں جاکر نہ صرف کام کرے بلکہ اُن کی خوشامد بھی کرے تو اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ اس غلامی کو خیر باد کہہ کر اپنے گاؤں کو چلے جائیں...... لیکن آئندہ وہ کیا کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

گرمیوں کی چاندنی رات میں وہ کھلے آسمان تلے چار پائی پر لیٹا صحیح معنوں میں تارے گن رہا تھا۔ اس نے تاروں کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ورنہ تاروں کی دنیا بھی کس قدر خوب صورت اور انوکھی تھی۔ کتنی دور تک پھیلے ہوئے بے شمار تارے اور بادلوں کی صورت کے وہ تارے جن کی بابت کہا جاتا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح اسی راستہ سے ہو کر جاتی تھی۔ نامعلوم وہ راستہ کیسا ہوگا؟ کیسی جگہ ہوگی؟ درخت ہوں گے یا ریت کے ٹیلے جب روح تھک جاتی ہوگی تو اس کو دم لینے کی اجازت ملتی ہوگی یا نہیں۔ یہ راستہ آخر کار کہاں ختم ہوتا ہوگا؟

اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی۔ دہی بلونے کی آواز اس بات کا یقینی ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔

وہ اٹھا کلہاڑی پکڑ کر ببول کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ ایک نازک سی شاخ کاٹ کر اس نے تین داتونیں بنائیں۔ اپنے لیے اپنی بیوی کے لیے۔

اور اپنی نو سالہ بچی کے لیے۔ ایک جھاڑن کاندھے پر ڈالے، وہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسّی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پُرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں سے گوبر ملی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی۔ چبوترے کے دونوں طرف گارے کی بے ڈول سی

ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ ان پر درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چرکھڑی کی لکڑی گھسی ہوئی تھی۔ پاس ہی دوسری چرکھڑی اس میں دانت جمائے کھڑی تھی۔ پچھلی چرکھڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کو پیچھے کی جانب گھومنے سے روکتا تھا۔ جب بیل کو جوت دیا گیا اور چرکھڑیاں گھومنے لگیں تو کتا کٹ کٹ بولنے لگا۔ کنویں والا بڑا چرکھڑا بھی گھوما، رسّیوں سے بندھی ہوئی ٹنڈیں[1] پانی کی طرف لپکیں جو ٹنڈیں رات کی بھری بیٹھی تھیں۔ اُنہوں نے پانی انڈیل دیا۔ جھال میں سے پانی کی دھارا تیزی سے نکلی۔ کنواں عجیب سروں میں رُوں رُوں کی آواز نکالنے لگا۔ کبھی ایسا جان پڑتا جیسے گا رہا ہو۔ کبھی رونے کی سی آواز نکلنے لگتی۔ کبھی اس میں سے دل سوز چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی...... تاریکی میں یہ عجیب و غریب آوازیں، چھوٹی بڑی گھومتی ہوئی چرکھڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور رینگ رہا ہو۔

شور و غل سے فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار کتے بھی بھونکنے لگے۔

گرنتھی نے جھال کی طرف تختہ لگا کر پانی روک لیا۔ تاکہ یہ ٹونٹیوں کی طرف چلا جائے۔ جب کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تو پانی کا رخ جھال کی طرف کردیا جاتا۔ چار دیواری پر بیٹھ کر اس نے داتنوں کی ۔ داتون کی کوچی سے دانت اور مسوڑے صاف کیے، پھر داتون بیچوں بیچ پھاڑ کر اسے کمان کی صورت گھمایا اور زبان پر رگڑا۔ منہ میں اُنگلی پھیر پھیر کر وہ کھانستا اور تھوکتا رہا۔

کنویں پر جھکے ہوئے شہتوت کے پیڑ پر پرندے پر پھڑپھڑانے لگے۔

داتون پھینک کر اُس نے کپڑے اُتارے ٹونٹی کے منہ سے لکڑی ہٹا دی۔ منہ اور داڑھی دھو کر واہگورو واہگورو کا ورد کرتا پانی کی دھارا کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ کل وہ اس جگہ کو چھوڑ کر جارہا تھا۔ اس وقت یہ بات کس قدر ناقابل یقین تھی۔

---

1 ٹنڈ- مٹی کا آبخورا

کچھ نچوڑ کر اس نے بغل میں دبایا۔ پانی سے لبریز بالٹی اٹھا کر وہ گوردوارے کے اندر چلا گیا۔ بڑے صحن میں اس کی بیوی جھاڑو دے رہی تھی۔ کپڑا جھٹک کر رسّی پر ڈالنے کے بعد اُس نے فرش پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

آج سنگرات تھی۔

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھایا گیا۔ گرنتھ صاحب پر سلک کے رومال ڈال دیئے گئے۔ چوری[1] بھی صاف کر کے قریب رکھ دی گئی۔ پھر وہ اندر سے ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے ساز اٹھا لایا۔ اُس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو ان کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گورو گھر کا کام تھا۔ یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی۔ کسی پر کیا احسان تھا۔ اپنی ہی آخرت کا سوال تھا...... اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ان کا جانا منسوخ ہو جائے۔

لڑکی آج اچھے اچھے کپڑے پہنے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنی پیاری بچی تھی۔

دھوپ نکل آئی۔ اُس کی بیوی چہرے پر چھنڈی[2] مل کر گھڑی کی گھڑی دھوپ میں جا بیٹھی۔ گرنتھی نے بڑے بڑے مٹکوں میں پانی بھرنا شروع کیا تاکہ سنگت کو پیاس لگے تو پانی کی دقت نہ ہو۔ گوردوارے کا بوڑھا بیل کمزور ہو چکا تھا۔ کام کم کرتا اور آرام زیادہ۔ یہ تو ہو نہ سکتا تھا کہ سنگت کو پانی پلانے کے لیے وہ بیل کو شام تک کنویں کے آگے جوتے رکھے۔

سنکھ ہاتھ میں لیے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھرکم تنا پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا۔ ارد

---

1. مکھیاں جھلنے کے استعمال میں آتی ہے۔

2. چھاچھ کپڑے میں چھاننے کے بعد جو تلچھٹ سی رہ جاتی ہے اس کو چھنڈی کہتے ہیں۔

گرد گوردوارے کے وہ کھیت تھے جن میں اس نے خود ہل چلایا تھا، بیج بویا تھا۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا۔ نلائی کی تھی۔ ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔ وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا قریب ہی بڑکا ایک بوڑھا درخت تھا جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی۔ گوروؤں کے زمانے میں ایک نہایت پاک باز شخص اس گوردوارے میں سیوا کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گورو کے چرنوں میں بتا دی۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہوگیا...... لیکن اس کی محنت میں فرق نہ آیا۔ اس کا دل اسی جوش اور خلوص سے لبریز تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں وہ کھیتوں کی نلائی کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی کے اندر اس کے الجھے ہوئے بال پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے ٹنڈ میں پانی بھر کر رسّی کا بکنا باندھ کر اُسے بڑ کے درخت کی ٹہنی سے لٹکا رکھا تھا۔ جب اُس نے ٹنڈ کو چھوا تو وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے برف ۔کس قدر ٹھنڈا پانی ہے، اس نے دل میں کہا گورو صاحب سچے' پادشاہ اسی طرف کو آنے والے ہیں کیوں نہ پانی انہیں کے لیے رہنے دوں۔ وہ اس میں سے پانی پی لیں گے تو باقی پانی سے میں اپنی پیاس بجھالوں گا...... بے شک گورو صاحب دورہ کرتے ہوئے اس طرف کو آنے والے تھے۔ لیکن اس کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس وقت وہ اطمینان سے دربار میں بیٹھے سنگتوں کو درشن دے رہے تھے۔ یکا یک گورو صاحب اٹھ بیٹھے اور فی الفور کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ سب حیران کہ آخر اس میں بھید کیا ہے۔ یہ بیٹھے بٹھائے ایک دم اتنی عجلت کیوں؟ گورو صاحب سچے پادشاہ نے فرمایا، میرا ایک سکھ منتظر ہے وہ پیاسا ہے۔ جب تک میں وہاں جاکر پانی نہ پیوں گا وہ پیاسا ہی رہے گا...... گورو صاحب گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ جاتے ہی پانی مانگا۔ بوڑھے سکھ نے وہ ٹنڈا آگے بڑھا دی...... وہ کس قدر خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گرنتھی درخت کے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے سنکھ منہ سے لگایا تو دل میں سوچنے لگا۔ گورو صاحب دلوں کا حال جانتے ہیں۔ وہ میری بے گناہی سے واقف ہیں۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ اُس کو یقین تھا کہ ضرور کوئی ایسی صورت نکل آئے گی۔

سنکھ پورنے کے بعد وہ دیر تک گاؤں کی طرف دیکھتا رہا، جیسے وہ بھی کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ کتنی تیز دھوپ ہوگئی تھی اور لوگ ابھی گھر سے بھی نہ نکلے تھے۔ مٹیالے مٹیالے مکان۔ مکانوں کے بیچ میں سے سر اٹھائے ہوئے سرسبز درخت ...... کچی سڑک سے آگے ڈھلوان پر بھنگیوں کے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ دو تین بچھڑے ادھر اُدھر قلانچیں بھرتے پھرتے تھے۔

وہ گوردوارے کے چھوٹے سے باغ میں گیا۔ انگور کی بیلیں آڑی ترچھی لکڑیوں سے گر پڑتی تھیں۔ ایک کونے میں سے اُس نے الجھی ہوئی رسّیاں اٹھائیں، بیلوں کو لکڑیوں کے ساتھ لگا لگا کر رسّیوں کے ٹکڑوں سے، کچھ ڈھیل دے دے کر باندھنے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں اپنے کام میں ماہر تھیں۔ قریب ہی ہرے دھنئے اور مرچوں کی کیاری تھی۔ وہ اس کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیچ بیچ میں کھٹ میٹھی بوٹی کے چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے۔ اُس نے احتیاط سے اُن کو اکھاڑنا شروع کیا۔ بچے ان بوٹیوں کو شوق سے کھاتے تھے۔ انار کے پیڑ خاموش سادھی میں بیٹھے ہوئے، درویشوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ہوا بند تھی۔ پیڑوں کی پتیاں تک نہ ہلتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے پرماتما سے ان کی لو لگی ہوئی ہو۔ باغ کا کتنا حصہ بے کار پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ وہ جھاڑیوں اور مدار کے خود رو پیڑوں سے وہ حصہ صاف کر کے وہاں سبزیاں لگائے۔ مٹر، ٹماٹر، گوبھی......

ہر پیڑ اور پودے کو دیکھتا ہوا وہ باہر نکلا۔ پھر اسی تنے پر کھڑے ہو کر اس نے دوسری مرتبہ سنکھ بجایا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مرد تو خیر کھیتوں پر کام کر رہے تھے۔

لیکن عورتیں کمروں میں گھسی پڑی تھیں۔ بیوی سے کہنے لگا۔ "دو مرتبہ سنگھ پور چکا ہوں کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ کم از کم عورتوں کو آ جانا چاہیے۔"

اُس کی بیوی چپ رہی۔ عورتوں کی بابت وہ جانتی تھی۔ اوّل تو ہر عورت کے چار چار پانچ پانچ بچے تھے۔ ان کو نہلانا دھلانا۔ پھر ہر عورت کو بناؤ سنگھار بھی کرنا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اپنے گہنوں اور کپڑوں کی نمائش کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کی باتیں یہیں کی جاتی تھیں۔ کئی پے چیدہ مسائل یہیں بیٹھ کر سلجھائے جاتے تھے۔

چھوٹی بچّی نے خوشی میں ڈھولکی دھپ دھپانی شروع کی۔ گرنتھی چمبیلی کے پودوں کے گرد اینٹوں کے اکھڑے ہوئے جنگلوں کی مرمت کرنے لگا۔ کہیں کوئی اینٹ گری پڑی تھی۔ کہیں کوئی ٹہنی اینٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ کسی جگہ پودے اس قدر پھیل گئے تھے کہ جنگلے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

لوہے کے ڈول بھر بھر کے اُس نے پھولوں کو پانی دینا شروع کیا۔ بے چارے گیندے کے پھول تو نرے یتیم ہی تھے۔ کوئی ان کی خبر گیری نہ کرتا تھا۔ بے چارے خشک اور سخت زمین میں ہی نشو و نما پاتے۔ کوڑا کرکٹ بھی انہیں پر پھینک دیا جاتا۔ اس کے باوجود جب پھول آتے تو ہر طرف پیلا ہی پیلا نظر آتا۔ پھولوں کے ہار گوندھے جاتے، بچے جھولیاں بھر بھر کر گھروں کو لے جاتے۔ کچھ گرنتھ صاحب کے سامنے چڑھا دیئے جاتے۔ بڑی درگت ہوتی بچاروں کی۔ وہ جب کبھی گیندے کے کسی کھلے ہوئے پھول کی طرف دیکھتا تو اس کو اس کے یتیم ہونے کا خیال آنے لگتا۔ جیسے کہ وہ خود یتیم تھا۔ وہ پودے کے قریب بیٹھ جاتا۔ پھول ہوا میں اِدھر اُدھر جھومنے لگتا۔ وہ پھول کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے لیتا۔ جیسے وہ کسی بچے کا چہرہ ہو۔ اس کو ایک بات یاد آ جاتی، ایک مرتبہ (غالبًا) گوروارجن دیو جی کے لبادہ کی جھپٹ میں آ کر پھول کی ایک پنکھڑی خاک پر گر پڑی تو گورو صاحب کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے — یہ سوچتے سوچتے نا معلوم جذبہ کے زیر اثر گرنتھی پر رقّت سی طاری ہو جاتی۔ وہ کتنی کتنی دیر تک دم سادھے

بیٹھا رہتا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی عقل موٹی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک نا قابلِ فہم کیفیت میں ڈوب جاتا۔

بھٹی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کر دیا۔ لکڑیاں اور موٹے موٹے اُپلے بھی ایک طرف ڈھیر کر دیئے اور سنکھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ دھوپ چلچلا رہی تھی۔ آنکھیں دھوپ میں تپی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کرسکتی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جمادی۔ شاید کوئی صورت نظر آ جائے۔ اس کو فکر تھی کام ختم کرنے کی۔

چند ایک نیلے پیلے دوپٹے ہوا میں لہرائے۔ کچھ نو عمر لڑکے اور لڑکیاں اٹھکیلیاں کرتے دکھائی دینے لگے۔ رنگ برنگ کے رومالوں سے ڈھکی ہوئی تھالیاں ہتھیلیوں پر رکھے زاہد صورت بوڑھی عورتیں پیچھے پیچھے چلی آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں گاؤں کے لوگ چینونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گوردوارے کی طرف بڑھے۔

گرنتھی نے ہاتھ پاؤں دھو کر پگڑی کو درست کیا۔ گلے میں زرد رنگ کا طویل سا کپڑا ڈالے واہگورو واہگورو کہتا گورد گرنتھ صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

گرنتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چار دیواری کے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں۔ جنہوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھڑی سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پیسے، بتاشے، پھول، تھالیوں میں والیں، چاول، آٹا وغیرہ رکھ وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں۔ لڑکوں میں بعض نے ہارمونیم پکڑ لیا۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا۔ دوسرا اپنی اُنگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ و سپیدہ

سُروں کو بے تحاشہ دبانے لگا۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی۔ دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے۔ چھینے بھی چھنا چھن بولنے لگے۔ اِدھر عورتیں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں ہر پابندی سے آزاد دور تک سنی جاسکتی تھیں۔ کچھ لڑکوں نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ نئی عمارت کے اینٹوں کے چلّے لگے ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اینٹوں کی ریل گاڑی بنائی۔ ایک لمبی قطار میں اینٹ کے پیچھے اینٹ کچھ کچھ فاصلے پر رکھ دی گئی۔ پھر ایک کو جو ٹھوکر لگائی تو ساری اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ لڑکے اُچھل اُچھل کر شور مچانے لگے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں کھل گئیں۔ اُنہوں نے از سرِ نو باندھنے کی بجائے پگڑیوں کو بغلوں میں دبایا اور باغ کے دورے پر نکل گئے۔ آج وہ نڈر ہو رہے تھے۔ وہ اپنی ماؤں کے ہمراہ تھے۔ گرنتھی کا اوّل تو آج کچھ خوف بھی نہ تھا، دوسرے وہ اس وقت آنکھیں بند کیے گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

اب مردوں کی آمد شروع ہوئی۔ موٹے کھدّر کے تہبند باندھے، گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے، سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پیتل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی داڑھیوں کو خوب چکنا کیے ہوئے آئے اور ماتھا ٹیک ٹیک کر وہ اِدھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے جن کے تہبند رنگ دار تھے۔ تہبند کے پچھلے حصے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے۔ بعض جو شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ پگڑیوں کے شملے خوب اکڑے ہوئے۔ ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنہوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا۔ جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اُس کی شان دار کلغی۔

مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوئی۔ چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے ایک ایک الائچی اور لونگ منہ میں ڈال کر ساز بجانے شروع کیے، ہارمونیم کے ساتھ تال پر ڈھولکی بجنے لگی۔ چمٹے والے نے جھوم جھوم کر چمٹا بجانا شروع کیا۔ ادھر

چھینے بھی ٹکرائے، ہارمونیم والے نے منہ کھول کر ایک طویل ''ہو'' کی آواز نکالنے کے بعد گایا۔

اتھے بیٹھ کسے نہیں رہنا میلہ[1] دو دن دا

اتنا کہہ کر وہ مسلسل منہ ہلانے لگا۔ ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ۔

جب ایک مرتبہ کارروائی شروع ہوگئی تو سرکردہ اصحاب نے آپس میں کانا پھوسی شروع کردی۔ کئی مسائل زیر بحث تھے۔

شبد کیرتن کے بعد سری گورو گرنتھ صاحب کی پوتر بانی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی۔ اس کے بعد گرنتھی چوکی پر سے اُترا اور ارداس (دعا) کے لیے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی۔ بس لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ گرنتھی نے آنکھیں بند کرلیں اور ارداس شروع کردی۔

''پرتھم بھگوتی سمر کے گورونانک لئی دھیائے۔ پھر انگد گورتے امرداس رامد اسے ہوسہائے......''

اس طرح دسوں گوروؤں کے نام دہرائے گئے۔ اور پھر۔

''پنج پیارے، چار صاحب زادے (صاحب اجیت سنگھ جی، صاحب جھجھار سنگھ جی۔ صاحب جور اور سنگھ جی، صاحب فتح سنگھ جی) چالیس مکتے، شہیدوں، مریدوں، صدق رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان دھر کے خالصہ جی، بولو جی واہگورو......''

گرنتھی کے واہگورو کہنے پر حاضرین اس کے'' واہگورو، واہگورو کہتے، ادھر حاضرین کی آواز گونجتی ادھر ایک بڑے طبل پر چوب پڑتی اور طبل کی آواز حاضرین کی آواز کے ساتھ گھل مل کر دیر تک لرزتی رہتی اور دلوں پر ایک ہیبت سی طاری ہوجاتی...... '' جن لوگوں نے دھرم کے لیے جانیں قربان کیں، چرکھڑیوں پر چڑھے (بدن کے) جوڑ جوڑ

---

[1] دنیا کا یہ میلہ عارضی ہے۔ کوئی شخص بھی یہاں دائمی طور پر بیٹھا نہیں رہے گا۔

جُدا کروائے، جن کی کھالیں کھینچ لی گئیں۔ جنہوں نے کھوپریاں اُتروائیں، لیکن اپنا دھرم نہیں چھوڑا جنہوں نے سکھی صدق اپنے سر کے پوتر کیسوں (بالوں) اور اپنے آخری سانسوں تک نبھایا ان سکھوں (شیروں) اور سنگھنیوں (شیرنیوں) کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولو جی واہگورو......''

''واہگورو! واہگورو!!''

......'' جن گورسکھوں نے گوردواروں کے سدھار کی خاطر، سری ننکانہ صاحب جی میں اور سری ترن تارن صاحب کے سلسلے میں اپنے جسموں پر تکالیف برداشت کیں۔ جیتے جی تیل میں ڈال کر جلا دیئے گئے۔ دہکتی بھٹیوں میں جھونک دیئے گئے، اور وہ (اس طرح) شہید ہو گئے۔ ان گورو کی صورت رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔''

''واہگورو! واہگورو!!''

......'' جن ماؤں، بیبیوں نے اپنے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر اپنی جھولیوں میں ڈلوا لیے، اُن کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو۔''

''واہگورو! واہگورو!!''

طویل دعا کے آخر میں ''...... (اے گورو صاحب) ہم کو نفسانی خواہشات، غصہ، لالچ، محبت اور غرور سے بچائیے۔ آپ کے حضور امرت ویلے کی ارداس۔ اگر بھول چوک میں کوئی لفظ کم و بیش ہو گیا ہو تو اس کے لیے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ سب کے کام سنواریئے۔ گورونانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سب کا بھلا۔''

سب نے جھک کر پیشانیاں فرش پر ٹیک دیں۔ گرنتھی نے دل ہی دل میں کہا۔ ''واہگورو سچے پادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں۔'' پھر کھڑے ہو کر'' جو بولے سونہال ست سری اکال'' کے تین نعرے لگائے گئے۔ اس کے بعد کڑاہ پرشاد (حلوا) بانٹا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ پرشاد ہاتھوں میں چھپائے یا کٹوریوں میں لیے رخصت ہو گئے۔ چند سربر

آوردہ اشخاص بیٹھے رہے۔ جب تنہائی ہوگئی تو انہوں نے گرنتھی سے کہا کہ اگر پرشاد باقی ہوتو لایا جائے۔ گرنتھی نے پرشاد ان کو بانٹ دیا۔ چہروں کو اپنے چکنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے اُنہوں نے بہی کھاتہ سنبھالا۔ پون گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد سب حساب صاف ہوا۔ گرنتھی سے کہہ دیا گیا کہ دوسرے دن رُخصت ہونے سے پہلے وہ چابیاں سردار بگا سنگھ نمبردار کو دے جائے۔

ان کے چلے جانے کے بعد گرنتھی کی سب اُمیدیں ختم ہوگئیں۔ اس کی بیوی نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ گرنتھی کے دل میں اب تک کچھ خلش سی تھی۔ وہ اضطراب میں ادھر اُدھر گھومنے لگا۔

اپنے دونوں ہاتھ پُشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑا ہو کر اُس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک دو جگہ سے سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اُکھڑ گئی تھیں۔ کائی جمی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں کوئی نہ نہاتا تھا۔ نا معلوم اس میں کب سے برسات کا پانی جمع تھا۔ ببول کے پیلے پیلے پھولوں کی تہ سی جمی ہوئی برگد کے بڑے بڑے زرد رنگ کے پتے پاش پاش ہو جانے والے جہاز کے شکستہ تختوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اس کے قریب پُرانی سمادھ تھی جس کی دیواروں پر سے جا بجا چونا اُکھڑا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر پرانے زمانے کی رنگ دار تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ سے رنگ اُکھڑے ہوئے ضرور تھے۔ لیکن جہاں کہیں بھی موجود تھے۔ کس قدر چمک دار اور دل کش نظر آتے تھے، خاص کر گورو نانک صاحب کی تصویر ۔ درخت کی چھاؤں تلے بابا نانک جی بیٹھے تھے۔ ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانہ۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا۔ جس میں ایک سرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے رہا تھا اسی حجرے میں ساتویں گورو صاحب پر ماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے تین چار برس پہلے کی بات تھی کہ ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلا ناغہ بھگتی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ

رات کے وقت یکا یک حجرہ منور ہوگیا۔ ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت نظر آئی...... لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آیا۔ اور فی الفور گونگا ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے اس کو بولتے نہیں سنا...... گرنتھی نے حجرے کا دروازہ کھول کر اس کے نمدار فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا۔ اور چُپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں اس کی بیوی وہاں آئی اور اُس کی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی۔ وہ اُس کو اپنے ساتھ لے گئی۔

صحن میں دستی چرکھڑی والے چھوٹے سے کنویں کے گرد اگرد بنے ہوئے چوڑے چبوترے پر نیلے رنگ کی لبوتری پگڑیاں باندھے نہنگ سکھ پتھر کے بڑے کونڈے میں شروائی گھونٹ رہے تھے۔ پگڑیوں پر لوہے کے چکّر، گلے میں آہنی منکوں کی مالا، لمبے لمبے چغے...... وہ لوگ باری باری بادام، چاروں مغز، کالی مرچیں اور قدرے بھنگ والی شروائی کی گھوٹائی کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کونڈے کو دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ اور دوسرا گھونٹنے کا ایک لمبا چوڑا ڈنڈا، جو نیچے سے کم موٹا اور اُوپر سے بہت زیادہ موٹا تھا، ہاتھوں میں لیے گھما رہا تھا۔ ڈنڈے کے اوپر گھنگھروں بندھے ہوئے تھے جو چھنا چھن بول رہے تھے۔ گرنتھی کچھ دیر تک ان کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوا بند تھی۔ جب اُس کی بیوی دودھ دوھ کر گھر کے اندر جارہی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول اپنی چار پائی باڑے کے قریب ڈال دی۔ جوتے اُتار دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیک چار پائی پر ہو بیٹھا۔

کوؤں کے جھنڈ کے جھنڈ کائیں کائیں کرتے گاؤں کے چکّر لگا رہے تھے چھوٹی سی نہر کی اونچی مینڈھ چکر لگاتی اُفق میں گم ہو رہی تھی۔ دور چند اونٹ بے مہار اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

گرنتھی کھوئی کھوئی نظروں سے اُفق کی طرف یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی کا

منتظر ہو۔ جیسے آسمان سے کوئی نورانی صورت نمودار ہوگی...... تاریکی بڑھ رہی تھی، پورا چاند بلند ہو رہا تھا۔ اتنے میں بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آ نکلا۔ بنتا سنگھ کسی عورت کو اغوا کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس قید با مشقت بھگت کر کل ہی اپنے گاؤں میں واپس آیا تھا، جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا، وہ بدستور ہٹا کٹا تھا۔ جب اس کو سزا ہوئی تھی۔ اس وقت گرنتھی گور دوارے میں آیا ہی تھا۔ قریب پہنچ کر بنتا سنگھ نے بلند آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ چار پائی پر بیٹھ گیا — اُس کے پھاوڑے سے گاڑھا گاڑھا کیچڑ ٹپک رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے پوچھا...... "گرنتھی جی! سُنا ہے کچھ آپ کے خلاف جھگڑا کھڑا کیا گیا ہے...... میں تو کل رات واپس آیا تھا۔ آج صبح سے میں چک 156 میں ماموں سے ملنے چلا گیا تھا۔ اب میں سیدھا کھیتوں کی طرف چلا آیا آخر ماجرا کیا ہے؟"

بنتا سنگھ کا نہ صرف اپنے گاؤں میں دبدبہ تھا بلکہ علاقہ بھر میں لوگ اس سے خم کھاتے تھے۔ جب گرنتھی نے اس کو بتایا کہ اُس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو چکا تو وہ جھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کس کی مجال ہے کہ تم کو یہاں سے نکالے۔ گرنتھی جی! تم اسی جگہ رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو یہاں سے نکالنے کے لیے آتا ہے۔"

یہ سن کر گرنتھی نے، جو اب تک بے حس سا بیٹھا تھا آنکھیں جھپکائیں، اُس کی بھنوؤں کو حرکت ہوئی۔ وہ مسکین آواز میں بولا۔ "اور سردار بنتا سنگھ واگورو جانتا ہے۔ میں نے لاجو کو چھوا تک نہیں۔"

سردار بگا سنگھ کے دو آدمی، اِدھر سے گذرتے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ بنتا سنگھ ان کو سنا کر بلند آواز میں للکار کر بولا: "گرنتھی جی! تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ تم ہزار مرتبہ لاجو کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو...... میں بگا سنگھ کو بھی دیکھ لوں گا،

بڑا نمبردار بنا پھرتا ہے...... اور جن لوگوں نے تمہارے خلاف پنچایت میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے ایک ایک سے نبٹ لوں گا......"

اپنی بھرپور آواز میں اُس نے یہ موٹی موٹی گالیاں بھی سنائیں......"

یہ خبر دونوں گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی...... سب لوگ لاجو کو گالیاں دینے لگے۔ حرام زادی! مفت میں بے چارے گرنیتی پر الزام دھر دیا۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' جنوری 1945 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ "تار و پود" میں شامل ہے۔

مہمان

سردی میں ٹھٹھرا ہوا، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں چھپائے بشمر خدا خدا کر کے ہوٹل تک پہنچا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً بستر میں گھس کر لحاف لپیٹ لے اور سو جائے لیکن ابھی اس نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ بھٹیوں کے قریب جا کھڑا ہوا، ہاتھ سینکتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کیا پکایا ہے آج — مونگ کی دال اور کدّو — کدّو سے اس کو نفرت تھی۔ ہوٹل والے ماہوار کھانے والوں کے لیے بغیر گھی کی' سب سے گھٹیا سبزی پکاتے تا کہ کھانے والا اسپیشل ترکاری یا گوشت وغیرہ کی پلیٹ خریدنے پر مجبور ہو جائے ...... اسپیشل کیا ہے؟ ...... گوبھی، آلو، مٹر، میٹ بھی ہے، کوفتہ، قیمہ......

اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک اب دور ہو چکی تھی۔ اُس نے مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے سوچا کہ اگر آدھی پلیٹ روغن جوش لیا تو چار آنے خرچ ہوں گے، اگر نصف پلیٹ قیمہ تو تین آنے اور گوبھی کی آدھی پلیٹ دو آنے میں ہی مل جائے گی...... تو بھئی آدھی گوبھی اسپیشل اور باقی جو کچھ بھی ہو۔

پتھر کی میز کے آگے کرسی پر بیٹھ کر وہ انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا۔ پھر اس نے کوٹ کے کالر سیدھے کر لیے جو کان ڈھانپنے کے لیے اوپر اٹھا دیے گئے تھے۔ سامنے ایک جاپانی تصویر تھی۔ دریا کا کنارہ...... افق میں اونچے نیچے ٹیلے ...... پیش منظر میں دو

جاپانی عورتیں نہانے کا لباس پہنے ہنستی چلی آرہی تھیں ان کے درمیان ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے ہاتھ سے اس کا ربڑ کا غبارہ چھوٹ کر نیچے پانی میں گر پڑا تھا وہ اچک کر اس کو پکڑنے کی فکر میں تھی۔ نہ معلوم لڑکی کا لباس عورتوں کی طرح کا کیوں تھا۔ چھوٹی سی کمسن لڑکی تھی۔ اگر اس کو پورے لباس کی بجائے صرف ایک جانگیہ پہنا دیا جاتا تو کیا ہرج تھا۔ کس قدر گھٹیا تصویر تھی نہ کوئی کلر سکیم، نہ توازن...... عورتیں بالکل بے جان، احساسات سے خالی جیسے سلولائڈ کے بوولے — ان کے پاؤں کی ٹکر سے جو پانی اٹھتا دکھایا گیا تھا وہ ٹخنوں کے قریب اٹھنا چاہیے تھا اور پھر ٹانگوں سے ٹکرانے کے بعد میں پانی کا کچھ دور تک ناہموار ہونا سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن یہ بات فہم سے باہر ہے کہ ٹانگیں تو ابھی دور اور پانی اُن کی سیدھ میں دو گز ادھر سے ہی اچھلنے لگا ہے۔ گھٹیا قسم کے آرٹسٹ اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے دس دس منٹ میں ایسی تصویریں بنا کر روپیہ کماتے ہیں......

نوکر ادھر سے گزرا ابے روٹی لا۔

اس کی آواز سن کر ہوٹل کا بھاری بھرکم منیجر ادھر چلا آیا۔ اس کا منہ ہمیشہ پان کی پیپ سے بھرا رہتا اور پیک روک روک کر بڑی مشکل سے بات کیا کرتا تھا۔ طبیعت کا برا نہ تھا لیکن اس کی عادت سے بشمبر کو سخت گھن آتی تھی۔ بابو بشمبر لعل!......'' اس نے منہ کھول کر ایک دم بند کر لیا۔'' تم سے کوئی ملنے آیا تھا۔''

''مجھ سے ملنے کے لیے؟''

منیجر نے بڑی مشکل سے منہ کھولا۔'' ہاں تمہارا گیسٹ......''

یہ مہمان کون تھا۔ آخر اس سے ملنے کے لیے کون آسکتا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے واقف تھا۔ اور جو تھوڑے بہت شناسا تھے ان کو اس کی جائے رہائش کا پتہ معلوم نہ تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ صرف دو تین مقامی دوستوں کو اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ سو وہ کبھی کبھار آتے...... آخر کون آیا تھا؟

''منیجر صاحب، اس کا نام کیا تھا؟''

''نام تو میں نے پوچھا نہیں...... گورے گورے سے......''

''گورے گورے ...... بہت لوگ گورے ہوسکتے ہیں۔ گورے ہونے کی بھی کوئی نشانی ہے۔ بعض لوگ کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں —

نوکر نے تھالی آگے رکھ دی۔

اس کی موجودہ بے کیف اور خالی خالی زندگی میں؛ جب کہ وہ بالکل تنہائی اور خاموشی سے دن گزار رہا تھا اس خبر نے ہلچل سی پیدا کردی۔ اس وقت وہ کسی مہمان کی آمد گوارا نہ کرسکتا تھا۔ اس کا کمرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ ایک اور چارپائی ڈال دینے پر اندر چلنا پھرنا بھی دوبھر ہوجاتا۔ پیسے اس قدر کم کہ کسی مہمان کو ایک دن بھی کھانا کھلانا دشوار تھا۔ اور پھر مہمان مہمان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لانبی داڑھی اور بڑے پگڑ والے بزرگ جو دو ڈھائی ماہ بعد جب کبھی آ ٹپکتے تو جینا محال ہوجاتا۔ وہ اپنی داڑھی جھٹکتے ہوئے اس کے ساتھ اپنی دور دراز رشتہ داری کی اہمیت واضح کرنے کے بعد خشک باتوں کا ایک سلسلہ شروع کردیتے۔ ان کی مقدمہ بازیاں، فلاں رشتہ دار نے ان سے کیا کہا اور انہوں نے اس کو کیا جواب دیا۔ وہ عورت جو اُن کے بھانجے نے بھگائی تھی۔ دراصل اس نے خود نہیں بھگائی تھی۔ بلکہ ایک رات عورت خود اس کے پاس آئی بولی چلو مجھے لے چلو کہیں نہ کہیں لے چلو میں تمہاری داسی ہوں۔ وہ بے چارا کل کا چھوکرا کیا جانے۔ آ گیا جھانسے میں — اب بچے کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں...... یا پھر' بھئی! ذرا انگریزی میں درخواست تو لکھ دو۔ اس نے درخواست کبھی نہ لکھی تھی اور پھر ان کی زبان جس بے ربط طریقے سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور جس طرح بار بار ایک ہی بات کی تاکید فرماتے وہ کہتا جناب! یہ بات ایک مرتبہ لکھی جاچکی ہے۔ باربار اس بات کی تکرار انگریزی میں مناسب نہیں ہوتی تو وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھنے لگتے جیسے کہہ رہے ہوں۔'' ابے تو کل کا چھوکرا مجھے سبق پڑھاتا ہے؟ ابے تو؟'' جب وہ آتے تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اس دروازے سے آئیں تو اُدھر کے دروازے سے وہ کھسک جائے...... اور کبھی اس کے پھوپھا کا لڑکا چوتی گاؤں سے اُدھر آنکلتا تو بجائے

نمستے کرنے کے وہ بازو پھیلا کر اس کے گلے سے لپٹ جاتا۔ ساتھ ہی زور زور سے بے معنی الفاظ اس کے منہ سے فرفر نکلنے لگتے۔ باتیں اس قدر زور زور سے کرتا کہ اِدھر اُدھر کے لوگ اُن کی طرف دیکھنے لگتے...... گھر ہو، گلی ہو، بازار ہو، کوئی جگہ ہو اس کا رویہ تبدیل نہ ہوتا۔ کبھی وہ ایک نہایت ہی معمولی بات اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا کہ اس کا جی چاہتا اپنے بال نوچ لے۔ چونی چھکڑے کے بھاری بھرکم پہیئے کے کیچڑ میں دھنس جانے کی داستان چھیڑ بیٹھتا۔ صاحب! پہیا کیچڑ میں دھنس گیا۔ وہ بیل زور لگا رہے ہیں۔ اس زور آزمائی میں ان کی دُمیں تن کر سیدھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن پہیہ ہے کہ اور بھی دھنسا جاتا ہے۔ چھکڑے والے نے بھی زور لگانا شروع کیا۔ لیکن پہیہ...... جیسے کنوئیں میں اترتا جارہا ہو۔ اِدھر اُدھر کے دوچار راہ گیر بھی لنگوٹا کس کر ایک بڑے لٹھ سے دوسرے پہیے کو اڑلیں دے کر گھمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دھکے دے کر اسے نکالنا چاہتے ہیں۔ لیکن سب بے سود...... آخر ہوتا کیا ہے؟ وہ خود کیچڑ میں گھس جاتا ہے، اور پہیے کو کندھا دے کر جو ہلّہ بولتا ہے تو پہیہ کیچڑ سے باہر، بیل بھاگتے چلے جاتے ہیں رکتے ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے اگر یہ بات ختم ہوجاتی تو وہ فوراً اسی قسم کا ایک دوسرا قصہ لے بیٹھتا...... یا پھر اس کے بڑے ماموں صاحب تھے۔ خاموش، چپ چاپ چارپائی پر لیٹے رہتے سارا سارا دن پڑے رہتے۔ اس کو ان کے آنے پر کوئی خاص تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی لیکن عادات ان کی بھی عجیب تھیں جو پگڑی جس طرح باندھ کر آتے جب تک اس کے پاس ٹھہرتے اس کو اسی طرح باندھے رکھتے۔ کبھی کھول کر از سرِ نو نہ باندھتے نہ معلوم کسی غیر سے بندھوا کر آتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے اسے قریب کی کرسی پر رکھ دیتے صبح اٹھتے تو منہ ہاتھ دھونے کے بعد پھر اس کو سر پر رکھ لیتے ویسے تو پگڑی کا کچھ نہ بگڑتا تھا جس بھدّے طریقہ پر وہ بندھی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ بھدّی تو خیر کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن ڈھیلی ضرور ہوجاتی مگر اس کے ڈھیلے ہوجانے کی ان کو پروا نہ تھی۔ اسی کو تھپتھپا کر سر پر جمائے رکھتے وہ کبھی کام کے بغیر نہ آتے تھے۔ اتنے

بڑے شہر میں یوں ہی چلے آنا تو محض فضول خرچی تھی۔ اس لیے ضرور کسی نہ کسی کام سے آتے۔ لیکن جب تک وہ کام پورا نہ ہو ان کا اس کے ہاں رہنا لازمی ہوتا تھا۔ سارا سارا دن چارپائی پر پڑے رہتے...... معمولی اردو پڑھ لکھ لیتے جو کتاب یا اخبار ہاتھ لگتا بلا تکلف پڑھنا شروع کر دیتے۔ غلط سلط جو کچھ بھی سمجھتے اس کو ختم کر کے چھوڑتے۔ روسو کا معاہدہ عمرانی دو ڈھائی گھنٹہ میں ختم کر کے کہتے۔ بشمبر! یہ پوتھی تو میں نے ختم کردی کچھ اور دو ماموں! آپ کو پسند بھی آئی یہ پوتھی؟ بھئی میری سمجھ میں تو آئی نہیں لیکن بغیر پڑھے میں چھوڑتا بھی نہیں...... اس کے بعد اگر ان کو پستالوزی یا کانٹ پڑھنے کو مل جاتا تو وہ ہرگز اعتراض نہ کرتے پھر شام ہوجاتی تو ایک موٹا سا کھیس لپیٹ کر بلا تکلف مال روڈ کی سیر کے لیے چل کھڑے ہوتے۔ بشمبر کو ہمراہ ضرور لے جاتے اور وہ پتلون کوٹ پہنے بھیگی بلی کی طرح ساتھ ہو لیتا...... کوئی دوست مل جائے یا کسی خوش پوش شریف آدمی سے باتیں شروع ہوجائیں...... لیکن وہ اپنی عادت نہ چھوڑتے تھے۔

لیکن اب وہ بزرگ بنوں میں تھے وہاں ٹھیکیداری کا کچھ کام تھا۔ چونی کو اس کے بڑے بھائی نے ٹاٹانگر بلا لیا تھا۔ گاؤں میں انہیں دنوں ایک بڑا میلہ لگنے والا تھا اس لیے ماموں جی کی تشریف آوری کا احتمال بھی نہ تھا...... شاید شہباز سنگھ ہو، وہ اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ اب وہ موٹر ڈرائیور تھا۔ سہارن پور سے دہرہ دون تک ۔ دہرہ دون سے سہارن پور تک ، تین ماہ پہلے اس کو شہباز کی ایک چٹھی ملی تھی۔ لکھا تھا کہ وہ پنجاب آنے والا ہے۔ شاید وہی آیا ہو۔ مارا مارا پھرتا ہوگا۔ کہیں سے پتہ چل گیا ہوگا۔ میرا۔

بے چارا شہباز سیدھا سادا سکھ تھا۔ بقول شخصے الٹ پلٹ کر جدھر سے دیکھو سکھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ لڑکپن میں وہ خوب موٹا تازہ تھا۔ ان کی پہلی ملاقات نہ معلوم کس جگہ ہوئی تھی...... اس میں تو شبہ نہ تھا کہ وہ ...... خدا جانے اس اسکول کا کیا نام تھا...... خیر اس اسکول میں شہباز ہی اس کو لے گیا تھا۔ دونوں دوست تھے ۔ دونوں کی صلاح ٹھہری کہ وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھیں۔ چنانچہ اس نے

اپنا اسکول چھوڑ دیا اور شہباز کے اسکول میں داخل ہوگیا۔ چھوٹا سا پرائیوٹ اسکول تھا۔ جہاں ہمیشہ لڑکوں کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اور اسی لیے نئے لڑکوں کی جستجو رہتی۔ طالب علم نہ صرف کتابیں پڑھتے فیسیں دیتے، مار کھاتے بلکہ اپنے غریب اسکول کے لیے نئے رنگ روٹ بھی پھانس کر لاتے۔

ایک چھوٹے سے گدلے تالاب کے قریب بوسیدہ سی عمارت باہر لوہے کی چادروں کا ایک سائبان اور اس جگہ بجلی کے تار سے بندھا ہوا ریل کی پٹڑی کا ٹکڑا جو گھنٹی کا کام دیتا تھا۔ نہ کوئی نوکر نہ چپراسی۔

ہیڈ ماسٹر ایک با رعب شخص تھا۔ اگرچہ اکہرے بدن کا آدمی تھا۔ لیکن ٹانگیں خوب پھیلا پھیلا کر چلتا۔ پہلوانوں کی طرح جھوم جھوم کر قدم اٹھاتا۔ اسکول کی چھت سے جب لڑکوں کو وہ آتا دکھائی دیتا تو شور مچ جاتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آگئے۔ ادھر جب ہیڈ ماسٹر کو اسکول کی عمارت دکھائی دیتی تو وہ مونچھوں کو انگلیوں سے چھونے لگتا...... راستے میں لڑکے ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرتے۔ وہ دیدہ دانستہ خوب اینٹھ سے نمسکار کا جواب دیتا۔ کبھی وہ رک جاتا کسی لڑکے کا کان پکڑ کر کہتا '' کیوں بے چینئے! کل آدھی چھٹی کے بعد کہاں چل دیا تھا۔ ایں؟'' یہ چینئے اس کی اپنی اختراع تھی۔ نہ معلوم اس کا مطلب کیا تھا۔

اسکول کی دوسری اہم ہستی...... ماسٹر جگل کشور...... ایک آنکھ پتھر کی۔ گورا چٹا، ہلکا پھلکا، چلتا پرزہ، ہونٹ خوب سرخ، دانت از حد سفید گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، وہ کسرت بھی کرتا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ کشتی لڑا کرتا تھا۔ لڑکوں کو خوب پیٹتا...... شہباز نے اسے بتایا کہ دیکھو پہلے پہل رعب جمانے کے لیے جگل کشور تمہیں پیٹے گا گھبرانا نہیں...... ادھر یہ بھی پرانا پاپی تھا۔ چھوٹی موٹی مار کو وہ خاطر میں کب لاتا تھا۔ اسی قسم کی مشترکہ صفات پر تو ان کی دوستی قائم تھی۔

پہلے پہل جب وہ جگل کشور کی جماعت میں بیٹھا تو ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ

دوسرے دن سب لڑکے اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے نئی کاپیاں خرید کر لائیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہت سے لڑکے تو کاپیاں لے آئے۔ لیکن وہ ان میں شامل تھا۔ جو کاپیاں نہ لائے تھے۔ خیر اس دن جنگل کشور نے محض لعنت ملامت کرنے پر اکتفا کیا اُردو کی چند سطور ترجمے کے لیے دیں۔ دوسرے دن شہباز تو جماعت میں ہی نہ آیا۔ باقی سب لڑکے ترجمہ کر لائے تھے سوائے دو کے۔ ان دونو ں میں ایک وہ خود تھا۔ ماسٹر صاحب کی آنکھیں مارے غصہ کے خون کبوتر ہوگئیں۔ اس نے بید منگوایا پہلے تو دوسرے لڑکے کو بید پڑے۔ دونوں ہاتھوں پر چار چار جب اس لڑکے کے ہاتھ پر بید پڑتی تو وہ ہاتھ جھٹک کر گھٹنوں میں دبا لیتا، منہ سرخ ہوجاتا غرض اس طرح اس نے مار کھائی۔ پھر اس کی اپنی باری آئی۔ ماسٹر صاحب مارنے میں ماہر تو یہ مار کھانے میں۔ ماسٹر نے بید جو ماری تو اس کا ہاتھ جوں کا توں۔ دوسری مرتبہ پھر اس کا ہاتھ بے حس و حرکت بید لگنے پر اس کا ہاتھ سرخ ہوگیا۔ لیکن ہاتھ کو جنبش نہیں ہوئی۔ چار ضربوں کے بعد ماسٹر نے کہا بڑھاؤ۔ دوسرا ہاتھ اس نے دوسرا ہاتھ اطمینان سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ بولا، آپ اسی پر لگا لیجیے باقی چار ...... زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ماسٹر دم بخود۔ اس نے بید کو پھینک دی۔ بے شرم! ...... پھر اس کو کبھی مار نہیں پڑی۔

دوسرے دن جب شہباز نے اس کے مار کھانے کا معرکہ خیز کارنامہ سنا تو وہ اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوگیا۔

اس کے بعد شہباز کا کارنامہ بھی یاد رہے گا۔ غریب اسکول نہ معلوم کیسے پانچ چھ سو روپیہ جمع کر کے سائنس کا سامان خریدا تجویز یہ تھی کہ لڑکوں کو سائنس کی ابتدائی تعلیم بھی دی جائے۔ پہلے پہل شہباز اور وہ شیشے کی نلکیاں پیالیاں، اسپرٹ کے چراغ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی بے صبری سے ان کو استعمال کرنے کے موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔ شروع شروع کے تجربے بھی کھیل تماشے سے کم پُر لطف نہ تھے لیکن جب نئے نئے فارمولے یاد کرنے پڑے اور پھر عملی تجربوں سے ان کو ثابت کرنے کی نوبت

آئی تو سب لوگ بہت چکرائے خصوصاً سردار شہباز سنگھ...... چنانچہ ایک علی الصبح دیکھا تو کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے، سلاخیں مڑی ہوئیں، سائنس کا کل سامان غائب — فرش پر جمی ہوئی گرد کی تہ پر پاؤں کے یہ بڑے بڑے نشان اتنے بڑے بڑے پاؤں اسکول بھر میں کس کے ہوسکتے تھے؟...... شہباز سے باز پرس ہوئی۔ وہ صاف مکر گیا۔ پولس کو اطلاع دی گئی شہباز کو اسکول کے سامنے والے بڑ کے نیچے کوتوال کے ہاتھوں وہ مار پڑی کہ خدا کی پناہ۔ اس کی پگڑی اُتر گئی، بال بکھر گئے۔ دو تین دن حوالات میں رکھا گیا، جرح ہوئی، دھمکیاں دی گئیں لیکن وہاں وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر جب ہنگامہ ختم ہوا اور بات آئی گئی ہوچکی تو ایک پرسکون شام کو شہباز اس کو اپنے ساتھ شہر سے باہر لے گیا۔ ویرانے میں آپ نے سائنس کا کل ٹوٹا پھوٹا سامان دکھایا...... بشمبر مسکرانے لگا۔ نوکر روٹی دینے آیا ''کیوں بے وہ جو ملنے آئے تھے کیا وہ سکھ تھے؟'' معلوم ہوا سکھ نہیں مسلمان تھے'' اب مسلمان؟ سچ کہہ نا! ...... '' مسلمان کون ہوسکتا تھا۔ وہ کئی اسکولوں میں پڑھ چکا تھا جس جگہ والد صاحب کا تبادلہ ہوجاتا اس کو بھی ہمراہ جانا پڑتا۔ نیا اسکول نئے ساتھی...... اس نے ذہن پر زور ڈالا...... مسلمان، آخر مسلمان کون...... کہیں حنیف نہ ہو۔ ارے حنیف وہ کدھر بھول پڑا...... برف کے لڈوؤں کا شوقین دُبلا پتلا، سر پر بے پھندنے کی ٹوپی، کم گو، سست رفتار...... لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ اس جگہ کیسے آیا، اس کو پتہ کیسے چلا، اوہ حنیف! افسوس کہیں بے چارا...... اس کے لیے یہ شہر اجنبی ہے لیکن کیسے ٹپک پڑا وہ، اب ملے بغیر کیوں کر معلوم ہو...... ہائے کاش آج وہ سرکس دیکھنے نہ جاتا...... اب تو سالا بڑا ہوگیا ہوگا۔ کتنی بے تکلفی تھی دونوں میں نہ کھانے میں پرہیز نہ پینے میں...... اور تو اور پیٹنے میں بھی دونوں ساتھی تھے...... ان دنوں وہ اے پی مشن ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ اسکول کی عمارت بیچ شہر میں تھی۔ اردگرد تھوڑی سی خالی جگہ بھی چھوٹی ہوئی تھی۔ آدمی چھٹی میں لڑکے وہاں والی بال کھیلا کرتے تھے۔

حنیف یوں تو کم گو لڑکا تھا۔ لیکن جس کسی سے گھل مل جاتا تو پھر اس کی زبان

بے لگان ہوجاتی۔ اس کی باتیں اور اس کے پروگرام ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ اسکول کا کام شروع ہونے سے پہلے جب یسوع کے پہاڑی والے وعظ، یا لوقا، متی، یوحنا کسی رسول کی کتاب میں سے کچھ پڑھ کر سنایا جاتا۔کبھی امریکن پرنسپل حضرت داؤد کے گیت پڑھتا۔ اس کے بعد دعا شروع ہوتی۔ ''اے خدا! تو جو آسمان پر ہے......'' اس دوران میں حنیف کھسر پھسر کیے جاتا، کلاس میں، آدھی چھٹی میں' گھر میں' بازار میں ان دونوں کا ساتھ تھا۔

ایک مسٹر ینگ تھے جو لڑکوں کو پیٹنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ وہ کلاس میں آتے اُچک کر بجائے کرسی کے میز پر چڑھ بیٹھتے۔ مار پیٹ کا بہانہ ڈھونڈتے دیر نہ لگتی۔ چنانچہ لڑکوں کی پٹائی شروع ہوجاتی۔ اگر لڑکا بید کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا ہوا روتا تو کہتے آہاہا کیسی میٹھی آواز ہے۔ جیسے پہاڑی ندی بہ رہی ہو۔ کبھی لڑکے کی دبی دبی سی چیخ نکل جاتی تو فرماتے یہ لیجئے گاڑی کے انجن نے سیٹی دے دی......تشبیہ و استعارے کے معاملے پر زیادہ غور نہ کرتے تھے ان کو تو کچھ نہ کچھ کہنے کی لت تھی۔ بات بنے یا نہ بنے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ لڑکوں کے پیٹنے کا اصلی شوق انہیں کو تھا جس دن سب کے سب لڑکے کام کر کے لے آتے کوئی بہانہ مار پیٹ کا نہ سوجھتا تو سٹ پٹا کر رہ جاتے۔

ایک صاحب اور تھے مسٹر پیٹرک۔ یہ مخلوط قسم کے صاحب تھے۔ خاصے سانولے آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ مسٹر پیٹرک کا رنگ کالا تھا لیکن منہ کے دہانے پر اندرونی سرخی جھلک دکھاتی تھی۔ ان کے منہ کا دہانہ بھیڑیئے کے جبڑے کی طرح نظر آتا تھا۔ لڑکوں کو ہر وقت نہیں پیٹتے تھے۔ لیکن اگر اس پر اُتر آئیں تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اس قدر مارتے کہ ادھ موا کر کے چھوڑتے۔ وہ نوجوان تھے۔ چاق چوبند۔ سیماب کی طرح بے چین اور کلبلاتے ہوئے۔ لڑکوں کو ڈرل بھی کرواتے تھے۔ آنکھ جھپکتے میں زمین پر ہاتھوں کے بل ڈنڈ پیلنے کے انداز میں...... اور پھر جھٹ سے سیدھے کھڑے ہوجاتے۔ ایسا

معلوم ہوتا جیسے ان کو اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ میاں حنیف ان کی ڈرل سے بہت گھبراتے تھے اور وہ سست لڑکوں کے دشمن۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کو وہ عمر بھر نہ بھلا سکتے — مسٹر جیمز — جیمز بے چارے دائم المریض۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے۔ گردن خم کھائی ہوئی۔ پیشانی نیلی نیلی اُبھری ہوئی رگیں، بے نور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ مزاج چڑ چڑا۔ ہاتھ میں بالشت بھر کا بید۔ ہنسنے کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ وہ مسکرانے سے کتراتے تھے۔ ان کی مونچھیں نہ لمبی نہ چھوٹی، نہ تنی ہوئی نہ گری ہوئی...... وہ لڑکوں کو مارتے وقت زیادہ تر اپنے چھوٹے سے بید سے کچوکے دیتے، ایک مرتبہ مارتے تو چار مرتبہ کچوکے دیتے۔ اس کے ساتھ ایک ہی سوال کی گردان کرتے ''کیوں؟'' جناب میرے سر میں درد تھا۔ ''کیوں؟'' جناب میری بہن نے مجھے دسوتی خریدنے کے لیے بازار بھیج دیا تھا۔ ''کیوں؟'' جناب میرے خالو آگئے تھے ''کیوں؟'' جناب میری دادی امّاں کا انتقال ہوگیا تھا...... ''کیوں؟''

اُن کی کسی ٹیچر سے دوستی نہ تھی۔ آدھی چھٹی میں وہ شوربہ دار چنوں کے ساتھ ایک آدھ کلچہ کھا کر پانی پی لیا کرتے اور اپنے کمرے میں پڑے اونگھتے۔

ایک مرتبہ آدھی چھٹی میں حنیف اور وہ بازار میں گھوم رہے تھے۔ دفعتاً مسٹر جیمز سامنے آگئے۔ یہ دونوں ان کو دیکھ کر اس قدر گھبرا گئے کہ سلام کر دیا۔ مسٹر جیمز نے اشارے سے ان کو بلایا اپنے کمرے میں لے جا کر بید سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ یہ سلام کرنے کا وقت؟ حنیف بولا جناب ہم نے سلام ہی تو کیا کوئی بُری بات تو نہیں کی نا! ''کیوں؟'' انہوں نے بید کے کچوکے دینے شروع کیے۔ صاحب! اس میں تو کچھ برائی نہیں ''کیوں؟'' جناب ہم سے غلطی ہوگئی۔ ''کیوں؟'' جناب ہم تو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں توبہ کرتے ہیں۔ ''کیوں؟'' ......

اتنے میں ہوٹل کا منیجر ادھر سے گزرا۔ بشمبر نے کہا منیجر صاحب! آپ نے

غضب کر دیا وہ تو میرے پرانے دوست تھے۔ حنیف صاحب بہت دور سے آئے تھے۔ بے چارے یو پی کے رہنے والے۔

''حنیف تو اسلامی نام ہے وہ مسلمان کہاں تھا؟ وہ تو ہندو تھا ہندو۔''

''ہندو تھا؟ منیجر صاحب! ہوش کی بات کیجئے۔ آخر یہ کیا مذاق ہے۔ میرا مہمان آیا۔ آپ نے اس کو بٹھایا تک نہیں...... دال بھیجئے اور پیاز بھی۔ واہ صاحب واہ!''

'' اجی صاحب! وہ ہندو تھا۔ کس گدھے نے کہہ دیا کہ وہ مسلمان تھا۔ ہندو تھا۔ کاشمیری ہوگا۔ گورا چٹا...... کچوری کے سے گال......

کچوری کے سے گال؟ علم میں نیا اضافہ ہوا...... گورا چٹا کچوری کے سے گالوں والا شخص کون ہوسکتا تھا۔ اس کے واقف کاروں میں کسی کا حلیہ ایسا نہ تھا۔ کس قدر غیر ذمہ دار لوگ ہیں یہ ہوٹل والے کوئی ملنے آئے تو اس کا نام تک نہیں پوچھتے۔ آخر کیوں کر معلوم ہو کہ وہ کون شخص تھا...... یہ حلیہ ...... ایک دھندلی سی صورت حافظہ میں محفوظ تھی۔ گورا چٹا، یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ کچوری کے سے گال...... وہ اس حلیہ والے شخص سے ملا ضرور...... نہ معلوم کہاں...... یا شاید...... اب وہ دھندلی صورت واضح ہوتی جارہی تھی...... لیکن کہاں! کب؟ ...... یاد آگیا، یاد آگیا...... وہ ان دنوں ایک انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ اس کا ہم جماعت تھا۔ کتنی مشکل سے یاد آیا۔ وہ اتنے گہرے دوست نہ تھے۔ لیکن پھر بھی دونوں میں راہ و رسم تھی...... وہاں زندگی دلچسپ تھی۔ دو چار مرتبہ تو وہ اچھے خاصے دوستوں کی طرح مچھلیاں پکڑنے بھی گئے ۔ کانٹے پانی چھوڑ کر وہ ندی کے کنارے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھے لوڈو کھیلا کرتے تھے۔ مچھلی پکڑنا بھی ایک بہت صبر آزما مشغلہ ہے...... اب تو اُسے اس کا نام بھی یاد نہ رہا تھا۔ ان کی دوستی بتدریج بڑھ رہی تھی لیکن اُنہیں دنوں اس کے والد کا تبادلہ ہوگیا ورنہ یہ معمولی دوستی ضرور گہری دوستی میں تبدیل ہوجاتی۔

وہ چند سال جو اس نے انگریزی اسکول میں گزارے تھے۔ اس کی زندگی کے

بہترین سال تھے۔ اس قدر پر لطف دن اس نے نہ پہلے کبھی گزارے تھے اور نہ آئندہ اس بات کی امید ہی تھی اسکول کی ظاہری صورت بھی اور اسکولوں کی طرح نہ تھی۔ بلکہ وہ دو عمارتیں کسی رائیس کی کوٹھیاں معلوم ہوتی تھیں۔ ہلکے صندلی سے رنگ کی دل کش ہوا دار عمارتیں۔ عام طور پر ان کا اسکول ییلو ہاؤس (Yellow House) کہلاتا تھا۔ ان کوٹھیوں کے ارد گرد کھلے لان تھے۔ روشوں کے دونوں کناروں پر گلاب کے گھنے پودے قطار در قطار کھڑے تھے۔ موسم آنے پر یہ پودے بڑے بڑے زرد رنگ کے پھولوں سے لد جاتے ـــــ فیسیں بہت زیادہ تھیں صرف امرا کے لڑکے پڑھتے تھے یا اینگلو انڈین طلبا بھی تھے۔ کسی کلاس میں بھی تیرہ چودہ سے زیادہ طالب علم نہ تھے۔ برآمدوں میں کلاسیں لگتیں۔ وہ مختصر سی کلاسیں کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کوٹھی کے ہر کونے پر خوش پوش لڑکوں کی ایک کلاس ابتدائی جماعتوں کے لیے علاحدہ عمارت تھی۔ جونیئر کلاسیں برآمدوں میں اور سینئر کمروں میں۔ وہاں سب لڑکے خوب سج دھج کر آتے ۔ ماسٹروں کو پیٹنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف پرنسپل لڑکوں کو سزا دے سکتا تھا۔ وہ بھی اپنے دفتر کے کمرے میں پبلک سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی۔ کھیل کود کی طرف بھی کافی توجہ کی جاتی۔ اس کے علاوہ ڈرامے بھی کھیلے جاتے۔ ہر ہفتے سینما دیکھنے کی بھی اجازت تھی۔

ہوسٹل میں ان کی دیکھ بھال کے لیے دو انگریز عورتیں مقرر تھیں۔ ایک بڑی میم دوسری چھوٹی۔ وہ سب ان کو میڈم کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ان کے سب کام میڈم کی نگرانی میں ہی ہوتے تھے۔ خصوصاً ہفتے والے دن تو میڈم بھی بہت چہکتی پھرتی تھیں۔ لڑکے بھی میڈم میڈم کی رٹ لگائے ان کے آگے پیچھے گھومتے پھرتے۔ میڈم! کیا یہ ٹارزن کی فلم ہے؟ میڈم! اس کھیل میں کون کام کرتا ہے۔ میڈم! کیا پکچر میں لڑائی بھی ہوگی۔ اسی قسم کے بیسیوں سوالات سے میڈم کو پریشان کیا جاتا تھا۔

کیسے کیسے ساتھی تھے وہاں بھی...... اور وہ بلیک برڈ...... ہو ہو...... اس کا اصلی نام نہ معلوم کیا تھا۔ لیکن سب اس کو بلیک برڈ ہی کہتے تھے۔ جو کچھ جماعت میں لکھایا جاتا

پہلے تو وہ جلدی سے لکھ لیتا۔ پھر ہوسٹل میں پہنچ کر وہ سب کچھ از سرِ نو خوش خط لکھتا۔ ٹیچر ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے ویسے بھی وہ بڑا ذہین طالب علم تھا۔ لیکن جب امتحان نزدیک آتے تو اس کی کاپیاں چرالی جاتیں۔ بے چارے کی سال بھر کی محنت بے کار جاتی۔ بھاگ دوڑ کر کے بے چارا دوسروں کی کاپیاں مانگ کر کچھ نقل کرتا کچھ یاد کر لیتا—

وہاں بھنّو برادرز بھی تھے۔ یہ تین بھائی تھے۔ تینوں لاڈلے اور پر لے درجے کے کند ذہن ہر جماعت میں پہلے ایک دو برس فیل ہونا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پہلے سال فیل ہونے پر ان کے کسی رشتہ دار یا دوست کو رنج یا تعجب نہ ہوتا تھا اور پھر اس کا وہ دوست جو آج اس کا مہمان بن کر آیا تھا اور جس کا نام تک اس کو یاد نہ تھا۔ یہ معلوم کر کے کہ یہاں اس کا نام تک یاد نہ تھا۔ اس کو کس قدر رنج ہوگا...... وہ باغیچہ جہاں گرمیوں کی دوپہر کو گھنٹہ خالی ہونے پر وہ کلوں میں چاکولیٹ دبائے، مٹرگشت کرتے یا پھر امرود کے کسی درخت تلے بیٹھ جاتے۔ اس کے دوست کا جسم فربہ اور گداز تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کی ماتی۔ وہ بقول منیجر ہوٹل، کاشمیری تھا۔ گورا چٹا، کچوری کے سے گالوں والا وہ اپنے سہارے پر کبھی نہ بیٹھتا تھا۔ ہمیشہ اُس کی ٹانگوں سے ٹانگیں چھوا کر اس پر گرا پڑتا تھا...... سر اس کے کاندھے پر رکھ کر وہ کہتا اچھا بھائی کوئی بات سناؤ مزے دار......

اتنے میں ہوٹل کا باورچی ادھر سے گزرا۔ سنو بھائی! کتنی مرتبہ تم کو سمجھا چکا ہوں کہ اگر کوئی ملنے آئے تو اس کا نام پوچھ لیا کرو۔ لیکن تم سے اتی سی بات بھی نہیں ہوسکتی اب مجھے کیا خاک پتہ چلے کہ وہ کون تھے۔ جناب کھانا کھلا رہا تھا اس وقت ورنہ ضرور پوچھتا...... لیکن وہ واپس آنے کے لیے کہہ گئے تھے بلکہ اب آتے ہی ہوں گے۔ میں نے ان سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بولے ذرا بازار تک گھوم آئیں۔ اسی لیے میں نے نام نہیں پوچھا۔ آئیں گے وہ ضرور...... عورت ذات کا ساتھ......

''عورت؟...... کیا اُن کے ساتھ عورت بھی تھی؟''

''ہاں جی۔'' باورچی نے انگلیاں نچائیں۔ ''لڑکی تھی نوجوان، سانولا رنگ تیکھی ناک اور ناک میں ایک کیل...... آئے تو مجھی سے بولے'' کیوں بھائی یہاں کوئی مسٹر بشمبر لعل بھی رہتے ہیں......'' ہاں صاحب! رہتے ہیں' پھر وہ کہنے لگے......

ارے لڑکی کا تو کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ اُفوہ کم بختوں نے کیسا بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ وہ تو ہمارے گاؤں کے چمن لعل تھے۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی۔ گاؤں میں ہم اکٹھے رہے، اکٹھے پڑھے۔ اس کے ساتھ اس کی بہن ہوگی۔ میں کئی برس بعد گاؤں گیا نا! تو مجھے وہ میرا لنگوٹیا یار ملا۔ میں نے پوچھا بھئی وہ لیلا کہاں ہے۔ اس کی بہن بھی ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ وہ بولا تجھے معلوم نہیں اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ اب وہ سسرال میں ہے۔ میں نے اس سے کہا بھئی لیلا سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا اب میں اس کو سسرال سے لاؤں گا تو راستے میں تمہارے پاس ٹھہروں گا۔ دو دن ...... لو کتنی سیدھی سی بات تھی۔ تم لوگوں نے تو چکرا دیا مجھ کو۔ گورا چٹا تو نہیں ہے وہ۔''

''باورچی چکرایا۔ صاحب کس نے کہہ دیا گورا چٹا۔ اچھا خاصہ گندمی رنگ ہے ہاں گال تو پھولے ہوئے ہیں اس کے ......''

غضب ہو گیا۔ بشمبر نے چھوٹے نوکر کو آواز دی۔'' تم جانتے ہو نا پچھلی گلی میں جو بابو رہتے ہیں...... ابے وہ ہمارے ہاں آیا کرتے ہیں نا' جن کے منہ پر سیتلا کے ہلکے ہلکے داغ ہیں...... تو ان کے ہاں جا کر کہنا کہ بشمبر بابو نے دو بستر منگوائے ہیں۔ اور دیکھ دو چار پائیاں میرے کمرے میں پہنچا دے...... بھاگا چلا جا۔ سن رہا ہے...... فوراً جا ایسا نہ ہو وہ لوگ سو جائیں...... ہاں برتن صاف کر لے۔ لیکن فوراً......

وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔ کم بخت ایک دم سب کچھ نہیں کہہ دیتے۔ کتنی سیدھی سی بات تھی...... میں الگ پریشان...... میں بھی کہوں کہ آخر کون تھا مجھ سے ملنے والا......

...... واہ رے چین لعل...... میرے دوست...... چھوٹے سے تھے۔ جب گھر کی چھت پر زرد رنگ کی کوڑیوں سے دونوں کھیلا کرتے تھے۔ چین لعل لمبا سا لڑکا تھا۔ لیکن تھا بے چارا کمزور، ڈھیلا ڈھالا...... اور وہ لیلا...... سانولی سلونی...... ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جیسے کہ عام طور پر گاؤں کے سبھی مکان ہوتے ہیں......

سردیوں کے دن تھے وہ اپنی چھت پر ٹاٹ بچھائے کاغذ کی بھنبیریاں بنا رہا تھا۔ اس وقت لیلا کٹوری میں ساگ لیے ان کے گھر آئی۔ جب وہ سیڑھیوں سے اترنے لگی تو ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بے اعتنائی کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ اس کو لیلا کا یہ انداز ذرا نہ بھایا شیخی خوری! جب وہ اوپر آئی تو اس نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں روٹی اور ساگ دوسرے میں لسّی کا کٹورا لیے تھی۔ چاچی نے بھیجا ہے۔ اس کی ماں کو وہ چاچی کہتی تھی۔ ''رکھ دے'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

روٹی کی رکابی اس کے پاس رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی کھڑی رہی۔ قدرے سکوت کے بعد وہ بولی کیا بنا رہے ہو؟ اس نے ذرا فخر سے جواب دیا۔ بھمبیری، وہ اس کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کی انگلیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ کیا یہ گھومے گی؟ ہاں بھئی! گھومے گی اور نہیں تو یوں ہی — بے چاری پر رعب جما دیا اس نے ، اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کو وہ بہت پیاری معلوم ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جنگل کی شہزادی- لیلا جنگ کی شہزادی کی طرح خوب صورت تھی۔ سانولی سی تیکھی ناک، وحشی سی آنکھیں...... اور ہیرو نے جنگل کی شہزادی کے کس کس طرح بوسے لیے تھے......

اس کے بعد لیلا کو تکیے کے غلاف پر ''ویل کم'' کاڑھنا تھا۔ اس نے پنسل سے نہ صرف ''ویل کم' لکھ دیا۔ بلکہ ادھر اُدھر کونوں پر پھول بھی بنا دیئے۔ اس دن سے تو لیلا اس کی کنیز بن گئی...... پھر تعلقات بڑھے۔ میاں بیوی بن کر کھیلے بھی۔ موقع پا کر وہ اس کو چوم بھی لیتا...... اس نے لیلا کو ہوائی بوسہ کی ترکیب بھی بتا دی۔ وہ دور سے اپنے

ہاتھ کو چوم کر بوسہ ہوا میں اڑا دیتا۔ جواب میں وہ بھی دور کھڑی ہوا میں بوسہ اڑا دیتی...... وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے بھی لاتا۔ صابن، ویسن، کلپ...... وہ بہت خوش ہوتی، معمولی سی بات پر بھی وہ پھولی نہ سماتی...... ان دنوں وہ معصوم تھے نا بالغ تھے۔ اب لیلا نے کیسا جو بن نکالا ہوگا۔ مکمل جوان عورت ہوگی، پکے ہوئے پھل کی طرح...... کیا اب بھی وہ...... اب اگر وہ موقع پا کر اس کو گلے سے لپٹا لے تو وہ برا مان جائے گی...... اس کو بھی اشتیاق ہوگا ملنے کا اس کی کھاٹ کے قریب چین لعل کی چار پائی' اس سے پرے لیلا کی ...... وہ اپنے بستر پر گٹھری بنی بیٹھی ہوگی۔

اب وہ اس کے بھائی کے سامنے براہ راست اس سے تو کچھ نہ کہے گا۔ یہ تو ہوگی بدتمیزی ...... باتیں تو وہ چین لعل سے کرے گا...... تو وہ آنچل میں منہ چھپا کر ہنسے گی...... اور جب چین لعل پیشاب کرنے کی غرض سے یا کسی اور کام سے باہر جائے گا تو حسب موقع وہ اس کا ہاتھ تھام لے گا یا گلے سے لپٹالے گا۔ یا اس کے ہونٹ چوم لے گا...... اور پھر نہ معلوم ......

وہ کھانا تو ضرور کھائیں گے۔ ان کے کھانے کے ساتھ کچھ۔ ربڑی اور دہی بڑے بھی منگوا لیے جائیں۔ کھانے کے بعد پھلوں کا انتظام ہوجائے تو رعب جم جائے گا۔ شاید پھل والے کی دوکان ابھی تک کھلی ہو۔ اُس نے کھانے کی رفتار اور بھی تیز کردی۔ اتنے میں باہر سے منیجر کی آواز آئی — "آپ آگئے۔ اچھا ہوا صاحب وہ تو ہمارے سر ہوگئے۔ کہنے لگے تم نے ہمارے مہمانوں کو بٹھایا کیوں نہ...... جی ہاں ادھر بائیں جانب...... آگے بڑھ جایئے...... بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں......"

بشمبر نے گھوم کر دیکھا۔ ایک مردانہ صورت کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی...... وہ کرسی سے اٹھنے لگا — وہ ان صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا منہ کچھ کہنے کے لیے کھلا...... نو وارد مرد کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہو کے معدوم ہونے لگی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ چین لعل نہ تھا۔ نو وارد نے کچھ محجوب ہو کر

معذرت چاہی...... اوہ معاف کیجئے...... آپ نہیں...... بابو بشمبر لعل کمپونڈر......

منیجر بھی آ گیا۔ ''جناب ہمارے ہاں تو یہی بابو بشمبر لعل رہتے ہیں۔''

نوجوان عورت کی آنکھیں پل بھر کو دکھائی دیں۔ پھر اس نے منہ پھیر لیا۔ نو وارد نے پھر معذرت چاہی...... غلطی ہوئی معاف کیجئے گا...... وہ اور ہیں بابو بشمبر لعل کمپونڈر...... انہوں نے اسی بازار کا پتہ دیا تھا...... آپ نہیں جانتے ان کو؟''

منیجر، نوکر، اور اجنبی باتیں کرتے ہوئے پرے چلے گئے۔ بشمبر پھر کرسی پر بیٹھ گیا...... اس نے روٹی کا نوالہ توڑا بجائے کھانے کے دو تھالی میں اس کو اپنی انگلیوں سے ٹھوکریں لگا لگا کر کھیلنے لگا۔

یہ افسانہ پہلی مرتبہ 'ادبی دنیا' مارچ 1945 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ ''تار و پود'' میں شامل ہے۔

بھول بھلیّاں

(عصمت شاہد لطیف سے معذرت کے ساتھ)

مطلع ابر آلود تھا اور ہوا خنک۔

وہ بڑی کھڑکی کے پاس پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھی۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ ایک رخسار بھی قدرے سوجا ہوا تھا۔ طبیعت مضمحل تھی۔ اتنے میں وہ ہنستے ہوئے آئے۔ کاغذات کی فائل کوچ پر پٹخ دی اور کوٹ کھونٹی پر لٹکا کر اس کے پاس گھس کر بیٹھ گئے۔

''کہیے مزاج کیسے ہیں؟''

''آپ کی بلا سے۔ نوکر کو چائے کے لیے کہہ دیا آپ نے؟''

''کہہ دیا— ہاں بھئی! یہ ہماری بلا سے کیوں؟'' ہاتھ بڑھایا۔

(چڑ کر) ''ہٹو بھی...... آتے ہی......''

(پنجہ لڑا کر) ''آتے ہی...... کیا کیا؟''

''ہائے اللہ!''

''ہائے اللہ کیا۔''

''کیا ہوگیا تم کو؟''

''اچھا تم، تم کہو گی مجھ کو؟''

''آتے ہی، آپ کہہ کر بلایا جناب کو۔''

(پنجہ مروڑ کر) ''پھر کہے جاؤ 'آپ'......''

''کیوں کہوں؟''

''نہیں کہو گی؟ مروڑوں؟''

''اوئی میں مری— تمہارا لڑکپن نہیں گیا۔''

''اپنی کہو نا— اپنے میاں' مجازی خدا کو تم کہہ کر بلاتی ہو؟''

''کہوں گی 'تم'...... ہزار بار تم تم تم......''

''اچھا تو لو......''

''اوئی ٹوٹی میری انگلیاں...... میرے اللہ! میری توبہ اب نہیں کہوں گی تم......''

(ڈھیل دے کر) ''کہو آپ......''

(ہاتھ چھڑا کر) ''تم۔''

''اچھا تو اب دوسرا علاج شروع کیا جائے گا تمہارا، آٹھ برس سے۔ جب تم دس برس کی تھیں تم کو سدھارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''میں نہیں سدھروں گی۔''

(بانہہ مروڑ کر) ''نہیں؟''

''نہیں۔''

(اور مروڑ کر) ''نہیں؟''

''اوئی اللہ! میں مری۔''

''اب میں مری'...... ایں؟''

''بھئی چھوڑ ہمیں۔''

''کیوں چھوڑیں؟''

''پہل کس نے کی تھی؟''

''تم کس نے کہا تھا؟''

''واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟''

''اپنے میاں کا کہنا مانا کرو۔''

''نہیں مانوں گی۔''

''پھر بغاوت؟''

''آپ کیوں دق کرتے ہیں مجھے۔''

''اب آئے مزاج ٹھکانے پر......بس اس طرح بولا کرو۔''

(وقفہ)

''بھئی میں نہیں۔''

''میں نہیں......کیا؟''

''کہہ جو دیا۔''

''کیا کہہ دیا؟''

''میں موڈ میں نہیں ہوں۔''

''موڈ بھی ہو جائے گا ابھی۔''

''(بڑبڑاہٹ)......''

''سر میں درد ہے اب بھی؟''

''نہیں تو کیا۔''

(وقفہ)

''یہ کیسا؟''

''کیا۔''

''یہ انگلی کیوں بڑھا رہے ہو؟''

''کیا۔''

''یہ انگلی کیوں بڑھا رہے ہو؟'

''انگلی سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''کیوں چھو رہے ہو؟''

''بھئی چھونے سے کیا ہوتا ہے؟''

''وہی بات۔''

''ذرا دیکھوں۔''

''چھونا مت۔''

''تمہارا حرج ہی کیا ہے۔''

''بھئی مجھ کو تکلیف ہوتی ہے اگر میری جگہ تم ہوتے اور میں ایک موٹی، بھدّی، کھردری......''

''ذرا رکو۔''

''ہائے۔''

''ایک منٹ، ذرا دیکھنے دو۔''

انگلی تو ہٹا لو، ایسی کھردری......''

''ایک منٹ...... بس ایک منٹ۔''

(جھلا کر) ''بھئی کیا ایک منٹ۔''

''بس ذرا کی ذرا۔''

''ہٹاؤ بھئی، تم نے کھیل بنا رکھا ہے۔ یہ کیا بھدّا مذاق ہے۔ میری حالت اور خراب ہو جائے گی۔''

(وقفہ)

''لو اب ہاتھ پھیرے جا رہے ہیں۔''

''کمال کرتی ہو۔ بالکل آہستہ آہستہ پھیر رہا ہوں ہاتھ''

''فائدہ کیا؟''

''تم کو کچھ آرام محسوس ہوگا۔''

''بھئی مجھ کو آرام محسوس نہیں ہوا، ہٹاؤ بہت پھیرا ہاتھ۔''

(وقفہ)

''اب پھر؟ ...... چٹکی لے رہے ہو۔''

''بھئی اسے تم چٹکی کہتی ہو۔ واہ اتنی نرمی سے......''

(تنگ آکر) ''بہت ہوا...... ہنک ہنک''

''یوں ہی؟''

''ہائے میرے اللہ! باز آجاؤ نا!''

''بھئی ذرا ٹھہرو۔ تم بھی عجب ضدی ہو۔''

''تم سے کچھ ہوتا ہے نہیں......''

''پھر بھی حرج ہی کیا ہے اگر......''

''آخر جب تم سے کچھ بھی نہیں بن پڑتا تو ایسی حرکتوں سے کیا حاصل؟''

''تم بیوی ہو یا بلا؟''

''بھئی چلو ڈاکٹر کے پاس۔ آخر کہاں تک صبر ہو۔''

''اپنے میاں کو دیکھتی نہیں کس قدر کام کرتا ہے۔ فرصت بھی ہے مجھے؟''

''بھئی بہت ہوا۔ یا میرے ساتھ چلو ورنہ مجھ کو کہو میں خود ڈاکٹر کو کل حال بتا کر دوا لے آتی ہوں۔''

''اوہو! اب اتنی آزادی کی ہوا لگی تم کو؟''

''کیوں تو کیا حرج ہے اس میں؟''

''حرج ہی نہیں؟ کیا شریف بی بی کا یہ فرض نہیں کہ......''

''شریف بی بی شریف بی بی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ خاوند کا بھی کچھ فرض ہے۔ یا

سب فرائض بی بی کے حصہ میں ہی آئے ہیں؟''

''جانِ من! اپنے فرائض سے کوتاہی کب کی ہم نے......''

''تو چلو ڈاکٹر کے پاس۔ میں کب تک سینے پر پتھر دھرے بیٹھی رہوں۔ میری زندگی عذاب میں ہے۔ جاؤ...... ورنہ۔''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ کیا...... میں خود جا کر ڈاکٹر کو کل بات بتادوں گی۔ تاکہ کچھ علاج تو ہو...... تم ٹالے جا رہے ہو...... ذرا میرے دل سے پوچھو نا!''

''سنو میری جان! وہاں غیر مردوں کے سامنے۔''

''بھاڑ میں جائیں غیر مرد...... مجھ کو دق کرنے پر تلے ہوئے ہو...... میں پوچھتی ہوں کہ دنیا میں لوگ بیمار نہیں ہوتے کیا؟ آخر شرمانے سے تو دنیا کے کام چلنے سے رہے......''

''بھئی تم یوں ہی سر ہوئی جاتی ہو، میں کہاں شرماتا ہوں۔ ذرا سی بات منہ سے نکلی اور تم......''

''اللہ میرے! آپ اب فضول میں جھگڑا تو نہ بڑھائیں۔ آپ سمجھتے ہیں مجھ کو بازار میں گھومنے کا شوق ہے یا منہ کھولے بے پردہ غیر مردوں کے سامنے......''

(آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔)

''لو بھئی اور سنو...... میں نے یہ کب کہا۔''

(بسور کر) ''کب کہاں۔''

''اور لیجیے ہم سے خفا ہونے کو جی چاہتا ہے تو یونہی ہو جاؤ نا! بہانے تراشنے سے کیا فائدہ؟''

''بہانے وانے کیا...... میرا ذکر ہی چھوڑیئے میں وہاں نہ جاؤں گی۔ آپ خود جائیں سب حال بتا کر دوا لے آئیں۔''

(چائے آتی ہے۔ چائے پینے کے بعد۔)

''اب ذرا پرے ہٹ کر بیٹھو نا! گرمی کے مارے مری جارہی ہوں۔''

''پرے کہاں؟''

''ذرا اُدھر کو۔''

''ادھر کو؟ ارے مجھے گرانا چاہتی ہو زمین پر۔''

(سمٹ کر) ''بھئی ہم کو نہ چھوؤ۔''

''کیا میں بھی کوئی ہری جن ہوں۔''

''گرمی لگتی ہے تو لگا کرے۔''

(سکوت)

''اب بیٹھے رہو نا۔''

''بیٹھا تو ہوں۔''

''مجھ پر گرے پڑتے ہو۔''

''کہاں گرا پڑتا ہوں؟''

''پھر وہی حرکت؟''

''حرکت؟''

''میں پوچھتی ہوں جب آپ سے کچھ بن نہیں پڑتا تو پھر کیوں آپ......''

''بن نہیں پڑتا؟ وہ کیسے؟''

(جھنجھلا کر) ''ہٹو''

''کیوں؟''

''بھئی کہہ جو دیا۔ میں موڈ میں نہیں ہوں۔''

''کیسا موڈ؟''

''یہی بے فائدہ ہنسی مذاق۔''

"تو تم سمجھتی ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟ قسم خدا کی میں سیریس ہوں۔ ذرا دیکھو تو۔"

"بہت دیکھا۔"

"افوہ! ٹھہرو بھی۔"

(کشمکش) "بھئی میں نہیں۔"

"میں نہیں کیا؟"

"پہلے بھی تو اتنی مرتبہ کوشش کر چکے ہو۔ جب تم سے کچھ بن نہیں پڑتا تو کیا حاصل میرا دل جلانے سے۔"

"تم نے ایک بات گرہ میں باندھ لی۔"

(کشمکش) "تم کوئی اور بات کیوں نہیں کرتے؟"

"بھئی تم بڑی جاہل ہو۔"

"دیکھو سامنے چھت پر کون ہے؟"

"ہونے دو۔ احمق کہیں کی...... ہم کوئی جرم کر رہے ہیں؟ یوں مفت میں......"

"بیکار باتوں کا مطلب؟"

"تم بڑی ضدی ہو۔"

"تم نہیں؟"

"بھئی! جب میں کہتا ہوں کہ تم کو کچھ تکلیف نہ ہوگی۔"

"میرا پہلے ہی سر پھٹا جا رہا ہے۔"

"سر کی تکلیف بھی دور ہو جائے گی۔"

"اچھا تو لو۔ بس ایک مرتبہ۔"

(پیار سے) "سر ادھر کو ذرا"

(چڑ کر) "لو"

(کچھ سکوت کے بعد)

"بھئی کہے دیتی ہوں انگلی سے مت چھوؤ۔"

"ابھی ہٹائے لیتا ہوں۔"

"اوئی۔"

"کیا درد محسوس ہوتا ہے؟"

"بھئی یہ اپنی انگلی ہٹا لو...... کیا میں حیوان ہوں۔"

"ہاہا...... ذرا دیکھنے بھی دو۔"

"ابھی تک دیکھ ہی نہیں پائے؟"

"ذرا صبر کرو۔"

"ہائے۔"

"کیا ہے؟"

"میرا سر"

"ذرا اس کروٹ ہو جاؤ۔"

"تم نے مداری کا تماشا بنا رکھا ہے۔"

"ذرا کروٹ تو لو۔"

(اکتا کر) "لو"

"ذرا سر ادھر کو لو"

"لو۔"

"بس ٹھیک (ہاتھ سے سہلاتے ہوئے) کیوں تسکین محسوس ہوتی ہے کچھ؟"

"خاک۔"

"چپکی پڑی تو رہو۔"

"اوئی۔"

''لاحول......''

''شرارت کرتے ہو۔''

''پھر جھگڑا؟''

''بس آج اتنا ہی کافی ہے۔''

''کافی کیا معنی اب دیکھو۔''

''بھئی چھوڑو۔'' اٹھ بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔

''تم مجھ کو دق کر رہے ہو میں موڈ میں نہیں ہوں۔''

''میں تم کو دق نہیں کر رہا۔ کہہ دیا میں نے کبھی کہنا بھی مانا کرو۔''

(مردے کی طرح لیٹ جاتی ہے) ''لو میں ہاری۔''

''ہاں بس ٹھیک ہے۔''

(منہ پھلا کر) ''اونھ!''

''ذرا ادھر کو۔''

(سکوت)

''اچھا اب یہ کیا؟''

''کیا ہے؟''

''تم باز نہ آؤ گے۔ یہ ہاتھ ہٹا لو ادھر کو۔''

''بھئی صبر کرو۔''

''اوئی ذرا......''

''مفت میں بکے جا رہی ہو۔''

''اچھا اب مجھ کو ہلاؤ چلاؤ نہیں۔''

''تم تو بالکل بچی بنتی ہو۔''

(سسکیاں) ''آج تو میں مرجاؤں گی۔''

''ہاں بس آج مر ہی تو جاؤ گی تم۔''

''تم راکشش ہو۔''

''اچھا راکشش ہی سہی۔''

(آبدیدہ ہو کر) ''میں ظالم کے پلے بندھی۔''

''ہاں بھئی بڑا ظلم ہو رہا ہے تم پر۔ کسی سے پوچھو نا اس میں ظلم کی کیا بات ہے؟''

(روتی ہے)

''میں پوچھتا ہوں روئی نہیں ہے؟''

''روئی کہاں؟''

''خیر کوئی حرج نہیں رومال ہے میرے پاس۔''

''بھئی مجھ کو چھوڑ دو میرا لبوں پر دم ہے۔''

''بڑی بہادر ہو تم۔''

معاً اس کو ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی شے حلق میں پھنس گئی ہو جا کر۔ جیسے آنتیں ٹوٹ گئی ہوں، وہ مارے درد کے دہری ہوگئی۔

''میں مری۔''

''اچھا لو اب تو ہوگیا کام۔''

(تڑپ کر) ''بھاڑ میں گیا تمہارا کام میری جان نکلی جا رہی ہے۔''

وہ مسکرا کر پلنگ سے کود کر علاحدہ جا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ انگلی سے چھو کر دیکھتی ہے۔

''ارے لہو...... لہو نکل آیا۔''

(رونے لگتی ہے)

''مجھ کو زہر دے دو میں زہر کھالوں گی۔''

''بھئی زہر و ہر مت کھانا۔''

''میں پوچھتی ہوں جب تم سے کچھ بن نہیں پڑتا تو ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہو؟''

''کم از کم دل کی تسلی ہوگئی۔''

''تسلی ہوگئی...... پہلے تو اِتنی موٹی بھدّی انگلی...... اور پھر......''

''احمق! پھر کیا...... یہ دیکھو میرے ہاتھ میں جھاڑو کا تنکا۔''

''جھاڑو کا تنکا؟ اللہ رے تبھی تو لہو نکل آیا۔ اگر کہیں یہ اور آگے چلا جاتا تو پھر؟''

''پھر کیا؟''

(منہ چڑا کر) ''پھر کیا...... پردہ نہ پھٹ جاتا میرے کان کا...... بہری ہوجاتی میں۔''

''میں ایسا بے وقوف تو نہیں ہوں نا! میں تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ کان کے اندر میل نہ ہو۔ کئی دفعہ میل کی وجہ سے بھی تو درد اور سوجن ہوجایا کرتی ہے...... لیکن تمہارے کان میں تو ہے پھوڑا...... یہ بڑا۔''

''بڑے بنے پھرتے ہو حکیم اجمل خاں...... جب سے آئے ہو میرے کان پر حکمت جھاڑ رہے ہو اپنی...... اگر ڈاکٹر کے پاس لے چلتے تو کیا حرج تھا تمہارا۔ یا خود ہی چلے جاؤ۔ دوائی تو لادو۔''

''بھئی عجب بے وقوف ہو میں خود دفتر سے اتنا لیٹ آتا ہوں۔ اتنی سمجھدار ہو کر بچوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہو۔''

''آج تو لیٹ نہیں ہونا۔ آج تو وقت سے بھی کہیں پہلے آگئے تھے۔''

''جب میں آیا تھا اس وقت دوکان ہی کب کھلی تھی۔''

''خیر! اب تو کھلی ہوگی۔''

''ہاں اب کھلی ہوگی۔''

(بہ منت) ''تو لے چلیے نا مجھ کو...... آخر آپ!''

(پیار سے) ''میں کہتا ہوں۔ بسروچشم چلیے، پہنئے نا کپڑے...... آپ!''

وہ اٹھ کر ہنستی ہوئی، کپڑے بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار ساقی ظرافت نمبر اپریل 1945 میں شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

خدا کی وصیت

حضرت مسیح سے چار ہزار برس پہلے مصر میں دریائے نیل کے کنارے کنارے کئی عظیم الشان شہر آباد تھے، اس وقت مصر دنیا کا مہذب ترین ملک تھا۔ اس قدیم ترین ملک کے ان بارونق شہروں کے ایک طرف تو دریائے نیل کا پانی لہریں مارتا تھا اور دوسری جانب صحرائے اعظم تھا جہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ کہیں کہیں کوئی اکا دُکا نخلستان ضرور نظر آجاتا تھا۔

ان شہروں میں سب سے زیادہ پر رونق اور خوب صورت شہر مصر کا دار السلطنت مازا تھا۔ مصر بھر میں یہی ایک شہر تھا جس کے چاروں طرف فصیل بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ شہر کے بیچوں بیچ فرعون وقت کا عدیم المثال محل تھا۔ شہر سے چار ہزار قدم پرے توم کا مندر تھا۔ مصری صناعوں کی صناعی کا بہترین نمونہ۔ اس قدر خوش وضع جیسے انگوٹھی کا نگینہ۔

توم کا بے مثل مندر عین لب دریا ایستادہ تھا۔ مندر کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ ہر روز کی پوجا کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرا حصہ خاص خاص پوجاؤں اور قربانیوں کے لیے وقف تھا۔ ہزار ہا بھیڑیں، بکریاں، بیل اور اراضی کے وسیع ٹکڑے مندر کی ملکیت تھے۔ آمدنی بے شمار تھی۔ بھاری بھرکم سلوں کا ایک طویل و عریض چبوترہ اور اس پر سنگِ سرخ

کا بنا ہوا یہ حیرت انگیز مندر نہ صرف ملک بھر کے یاتری بلکہ دور دراز ممالک سے سیاح محض اسے دیکھنے کے لیے سینکڑوں کوس کا فاصلہ طے کر کے آتے۔ توم کے مندر دیکھتے تو انگشت بدنداں رہ جاتے۔

مندر کی سب سے پہلی چیز اس کا بڑا دروازہ تھا۔ جو اس قدر بلند تھا کہ اوپر دیکھتے وقت بادشاہوں کو ایک ہاتھ سے اپنے تاج تھامنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ یہ بلند و بالا دروازہ چوکور کٹی ہوئی سلوں کا بنا ہوا تھا۔ سلیں ایسی نفاست سے کاٹی گئی تھیں کہ دو سلوں کے درمیان اتنا فاصلہ بھی نہیں تھا کہ باریک سے باریک سوئی اس کے اندر داخل ہو سکے۔ پتھروں پر دیوتاؤں سے متعلق روایات کی تصاویر کھدی ہوئی تھیں۔ ہر تصویر کے اوپر چھوٹی سی عبارت بھی کندہ تھی تا کہ تصویر دیکھنے والے ان کا مطلب سمجھ سکیں۔ یہ دروازہ اوپر سے تنگ اور نیچے سے بہت کشادہ تھا۔ اس دروازے میں سے سولہ رتھ ایک دوسرے کے متوازی بیک وقت گزر سکتے تھے۔

دروازے سے مندر کی سیڑھیوں تک ایک سڑک چلی گئی تھی۔ اسی سڑک کے دونوں کناروں پر مختلف دیوتاؤں کے سنگی مجسمے ایستادہ تھے۔ مثلاً گدھ کی چونچ والا دیوتا تھات، مینڈھے کے سروالا دیوتا ختنو، ہر دل عزیز دیوی آئی سس اور اس کا خاوند، بھائی بیٹا اور باپ دیوتا اوسارس، الو کی صورت اور انسان کے جسم والے سورج دیوتا را سے لے کر ہورس کے چاروں بیٹوں تک سبھی کے مجسمے موجود تھے۔ ان مجسموں کی صورتیں عجیب اور ان کی ذات سے وابستہ کہانیاں حیرت انگیز تھیں۔ ان میں سے ہر مجسمہ مصری بت تراشوں کی صناعی کا نادر نمونہ تھا۔ سڑک ختم ہونے پر مندر کی خوش وضع ایک سو تیرہ سیڑھیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے دونوں طرف دو عظیم الجثہ ابو الہول تھے جنہیں دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر طویل و عریض چبوترے پر بارہ ستونوں کا فقید المثال ایوان تھا۔ جس میں بیک وقت ہزارہا یاتری سما سکتے تھے۔ سرخ پتھر کے ستون اس قدر چکنے تھے کہ ان پر چیونٹی کا چلنا بھی محال تھا۔ اس بڑے ایوان میں ایک اور چبوترے پر توم کا بت نصب تھا۔ توم انسانوں اور دیوتاؤں میں سب سے بڑے رتبے کا مالک تھا۔ یہ کل کائنات کا پیدا کرنے والا تھا۔ اس کے حکم کے بغیر

زمین یا آسمان پر ایک تنکا ادھر سے اُدھر نہ ہوسکتا تھا۔ یہ بت مصر کے بہترین بت تراشوں نے چھ سال کی مسلسل محنت کے بعد مکمل کیا تھا۔۔۔ اس ایوان کے علاوہ بیسیوں اور کمرے بھی تھے۔

اس حصے کی پچھلی جانب، یعنی دوسرے حصے میں توآم کی محبوبہ دیوی رازانہ کا حسین مجسمہ نصب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دیوی کا مجسمہ تراشنے میں جس باریک بینی اور چابک دستی سے کام لیا گیا تھا۔ وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس دیوی کا رخ بھی دوسری جانب تھا۔۔۔ اس کے آگے دونوں جانب بل کھاتی ہوئی سیڑھیاں نیچے کو چلی گئی تھیں آگے بڑے دالان میں ایک بیضوی شکل کا حوض تھا۔ دالان کے دائیں اور بائیں طرف دو بہت عمدہ عمارتیں تھیں۔ ان میں سے دائیں ہاتھ والی عمارت میں فرعون، شاہی خاندان کے افراد، نیز امرا، وزراء، اور خاص مصاحبین کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ بائیں جانب دوسری عمارت تھی جس میں سینکڑوں پجاریوں اور ہزارہا یاتریوں کے بیٹھنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

مندر کے اس حصے میں موسم گرما کی سب سے بڑی پوجا شروع ہوچکی تھی۔ دور دور کے شہروں اور دیہات سے لکھوکھا یاتری آئے ہوئے تھے۔ جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ اس پوجا میں اکیس روز تک مسلسل شب و روز منتر پڑھے جاتے۔ اس کے بعد کاہن اعظم دیوتاؤں کی شان میں منتر پڑھتا اور پھر ایک سو سات بیلوں کی قربانی دی جاتی اور ان کا گرم گرم خون بیضوی حوض میں جمع ہوتا جس میں مصر کی تیرہ کنواریاں ڈبکی لگا کر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کے سامنے رقص کرتیں اور پھر کنول کے پھول دریائے نیل کی لہروں پر بہادیتیں۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ توآم کی محبوبہ دیوی رازآنہ جب یہ قربانی اور پوجا قبول کرتی ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں پھر دریائے نیل میں طغیانی آجاتی ہے اور مصر کی سرزمین کے کھیت شاداب فصلیں پیدا کرتے ہیں اور توآم دیوتا سورج دیوتا راکو حکم دیتا ہے کہ وہ سرزمین مصر سے دور چلا جائے چناں چہ گرمیوں کا

موسم ختم ہو جاتا ہے۔ سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ درختوں میں نئی نئی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ پھولوں کے مرجھاتے ہوئے پودے جی اٹھتے ہیں۔

کاہن اعظم کا رتبہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔ اس کا علم وسیع اور اس کا حکم اٹل ہوتا تھا۔ اس رتبہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ جب ایک کاہن اعظم مرنے لگتا تو وہ خود ہی اپنے شاگردوں میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیتا۔ صرف کاہن اعظم ہی نیا کاہن اعظم مقرر کرسکتا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس معاملے میں دخل اندازی کرے یہاں تک کہ فرعون بھی اس معاملے میں معذور تھا۔

ان دنوں توم کے مندر کا کاہن اعظم جے آپا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں دریائے نیل کے پانی پر بے بسی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔

کاہن اعظم اس وقت مندر کے ایک گوشے میں چھوٹے سے کمرے کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ یہ کمرا دوسرے کمروں کی بہ نسبت زیادہ خنک تھا۔ اس لیے وہ گرمیوں کی دوپہریں عموماً اسی جگہ گزارتا تھا۔ اس کمرے کے ایک طرف دریائے نیل تھا اور اندر کی جانب ایک دالان تھا جس میں چوبیس چکنے ستون تھے اور ان پر رنگا رنگ کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کاہن اعظم کا چمکیلا لبادہ پھیکی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ سورج غروب ہو تو وہ دریا کی سیر کرتا ہوا شاہی محل میں پہنچ جائے۔ آج پوجا کی آخری رات تھی۔ اس تقریب پر فرعون نے اپنے ہاں ملک کے بڑے بڑے امرا کو مدعو کیا تھا۔

مندر کی دوسری جانب سے مسلسل منتر پڑھنے کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اور وہ خیالات میں کھویا ہوا تھا — وہ اس مرتبہ ایک ایسا قدم اٹھانے والا تھا جو مصر میں انقلاب کا موجب بن سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس بات کا تصور کر رہا تھا کہ اس کے اس نئے قدم کا مصریوں پر کیا ردعمل ہوگا۔

مندر میں کام کرنے والے غلام جگہ جگہ رکھے ہوئے مٹی کے چراغوں میں تیل ڈال رہے تھے اور ہر چراغ میں ایک ایک بتی تیل میں بھگو بھگو کر رکھ رہے تھے۔ تاریکی ہوتے ہی چراغ روشن کر دیئے جاتے تھے۔

شام کے وقت ہوا بھی چلنے لگتی تھی۔ کاہن اعظم کھوئی ہوئی نظروں سے دریا کی سطح پر پیدا ہونے والی ننھی ننھی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

قدیم مصر کے باشندے بہت قد آور اور طاقت ور ہوتے تھے۔ کاہن اعظم کا قد پانچ ہاتھ سے کسی صورت بھی کم نہ تھا۔ مصری داڑھی منڈواتے اور سر کے بال چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن کاہن اعظم نے سر کے بالوں کے ساتھ داڑھی بھی چھوڑ رکھی تھی اس کی داڑھی بابل کے بادشاہوں کی طرح خوب بل کھاتی ہوئی نیچے کو چلی گئی تھی۔

.... اگرچہ اس کے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید تھے لیکن تھے خوب سخت۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں میں لہراتے نہیں تھے۔ وہ اکہرے بدن کا بوڑھا لیکن مضبوط شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ جسم کا ڈھانچہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ ناک رومیوں کی طرح لمبی اور بیچ میں اٹھی ہوئی بھنویں بہت بڑھی ہوئی اور آنکھیں چمک دار۔ اس کی ناک کی جڑ کی طرف بھنوں کے قریب سے دو گہرے خطوط اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ خصوصاً داہنی جانب کی لکیر بہت اوپر تک چلی گئی تھی۔

کاہن اعظم مینڈھے کے مجسمے کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا کہ غلام نے آکر خبر دی کہ سواری تیار ہے۔ اس نے اپنا تانبے کی طرح سیاہی مائل سرخ چہرہ گھمایا اور غلام پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی۔ دعوت میں ابھی کافی دیر تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دعوت میں شامل ہونے سے پہلے وہ تھوڑی سیر ہی کر لے۔ وہ صرف سورج کے غروب ہونے کا منتظر تھا۔

اس نے شہر کی جانب نگاہ ڈالی۔ شہر کی چوکور، نوکیلی، گول، ترچھی عمارتیں ایک دوسرے میں کھچڑی ہو رہی تھیں۔ بل کھاتی ہوئی پیچ در پیچ گلیاں کینچوؤں کی طرح نظر آتی

تھیں۔ مکانوں کی بیچ میں کہیں کھجور یا انجیر کے درختوں کے جھرمٹ سر اٹھائے دکھائی دیتے تھے۔ شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے دریا کی طرف جایا کرتے تھے۔ اس وقت تفریح کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سقے چمڑے کے بڑے بڑے تھیلوں میں پانی بھرے چھڑکاؤ کرتے پھر رہے تھے۔ دریا میں تجارتی جہازوں اور کاروباری کشتیوں کے علاوہ امرا کی دلہنوں کی طرح سجی سجائی کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ جن میں راتوں کو تاروں کی چھاؤں میں نو عمر لڑکے بنسریاں بجاتے اور نوجوان لڑکیاں رقص کرتی تھیں۔ اس دل آویز موسیقی میں ان رنگ برنگ کی کشتیوں کے اڑتالیس اڑتالیس آبنوسی چپو آہستہ آہستہ حرکت کرتے اور مدھم روشنی میں دریا پار کے ماہی گیروں کی مدھم تانیں بلند ہوتیں اور پھر ہر شے پر غنودگی سی طاری ہونے لگتی۔

بالآخر کاہنِ اعظم نے حکم دیا کہ چوں کہ اس وقت وہ پیدل سیر کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ بیشارتی تک پیدل جائے گا۔ اس لیے اس کی پالکی بیشارتی پہنچا دی جائے۔ وہاں سے وہ پالکی پر سوار ہو کر دعوت میں جائے گا— بیشارتی شہر سے باہر دریا کے کنارے ایک تفریح گاہ کا نام تھا۔

کاہن اعظم کی مرصّع پالکی آٹھ آدمی کاندھوں پر اٹھائے بیشارتی کی طرف چل دیئے۔ باقی نوکروں کو بھی انہیں کے ساتھ چلے جانے کا حکم ملا۔ صرف اس کا کفش بردار اس کے ہمراہ رہ گیا۔ جب وہ قدم بقدم مندر کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا تو وہ یاتری اور غلام اور کنیزیں جو سیڑھیوں پر دالان میں تھیں جھک گئیں۔ کاہنِ اعظم بڑے وقار کے ساتھ بڑے دروازے سے باہر نکل گیا کفش بردار نے بڑھ کر چپل اس کے پاؤں کے قریب رکھ دیئے۔

شہر پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔ اکا دکا تارا جھلملانے لگا تھا۔

کاہن اعظم ہاتھ میں سونے کا عصا لیے متانت سے قدم اٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ پیچھے دو لڑکے اس کے لبادے کا دامن اٹھائے ہوئے تھے۔ جب وہ شہر

کے قریب سے ہو کر نکلا تو لوگ دروازوں کی دراڑوں میں سے جھانکنے لگے۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو ننگ دھڑنگ، اپنے اپنے باپ کے گھر کے سامنے ریت میں لوٹ لوٹ کر مٹی کے جھنجھوں، کپڑے کی بنی ہوئی گیندوں اور کاٹھ کی گڑیوں سے کھیل رہی تھیں۔ کھیل بند کر کے پیٹ کھجا کھجا کر کاہن اعظم کی طرف دیکھنے لگیں۔

اس وقت کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کے نوجوان لڑکے جن کی گردنوں اور کنپٹیوں پر گرد جمی ہوئی تھی گدھوں پر سوار گانے گاتے اور الغوزے بجاتے واپس شہر کو آرہے تھے۔ شہر کے اس بیرونی حصے میں کچھ گارے کے بنے ہوئے کچے مکانات بھی تھے۔ ادھر اُدھر بڑھیوں، جولاہوں، اور لوہاروں کی دکانیں نظر آرہی تھیں۔۔۔ چلتے چلتے معاً اس کو خیال آیا کہ اس نے فرعون کی نئی رانی کے زیر تعمیر مندر کی دیواروں پر کھدائی جانے والی عبارتوں کا جو انتخاب کیا تھا اُسے وہ مندر ہی میں بھول آیا تھا۔ چناں چہ اُس نے اسی وقت اپنے کفش بردار کو واپس مندر کی طرف دوڑایا۔

آہستہ آہستہ وہ پیشارتی کی طرف بڑھا۔ یہ ایک بہت مضبوط پختہ چبوترہ تھا جو دریائے نیل کے کنارے کنارے تین ہزار قدم تک چلا گیا تھا۔ یہ چبوترہ بڑی بڑی سلوا، سے بنایا گیا تھا۔ بیچ بیچ میں خالی جگہیں بھی چھوڑ دی گئی تھیں۔ جہاں یا تو چھوٹے چھوٹے تالاب بنائے گئے تھے جن کی سطح پر کنول کے پھول تیرتے تھے اور جن کے کناروں پر کھڑے ہوئے مہکتے پھولوں کے پودے صاف و شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے۔ یا کھجور، پام اور انجیر کے درخت لگا دیئے گئے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو والے پھولوں کی جھاڑیوں کے جھرمٹ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موجود تھے جن کی اوٹ میں پتھر کی چوڑی چوڑی کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔

یہاں ہلکی شرابیں بیچنے والے آتے۔ مینڈھے کے سینگوں کے بنے ہوئے پیالوں میں چھلکتی ہوئی ارغوانی شراب پینے کے لیے اور چٹ پٹی مسالے دار مچھلیاں اور تلی ہوئی بطیں کھانے کے لیے بکتی تھیں۔

اس جگہ شہر کے سبھی لوگ آتے تھے۔ چھوٹے بڑے رتبے کی تمیز اٹھا دی جاتی تھی۔ گئی رات تک بربط کے تار بجتے الغوزوں کی دل دوز تانیں بلند ہوتیں۔ دل ربا چنچل لڑکیاں دلوں کو برماتیں۔ چاند کی مدھم اور سحر انگیز روشنی میں ان کے دل فریب سینے دریائے نیل کی سطح پر تیرنے والے بلبلوں کی طرح دکھائی دینے لگتے۔ افواہ تھی کہ بڑے بڑے گھرانوں کی مہ وش عورتیں اسی تفریح گاہ کے تنہا گوشوں میں اپنی نرم و نازک لیکن محبت کے بھوکے جسم کھیتوں میں کام کرنے والے اکھر چرواہوں کے کھردرے ہاتھوں کے سپرد کر دیتیں۔

کاہن اعظم اس تفریح گاہ میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ عموماً اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتا اور جب وہ ادھر سے گزرتا تو لوگ واہی تباہی بکنا بند کر کے مودبانہ سر جھکا لیتے اور جب تک قوم کے مندر کا کاہنِ اعظم آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتا وہ لوگ خاموش کھڑے رہتے۔

اس وقت طرح دار چھیل چھبیلی معشوقاؤں کے جھلڑ کے جھلڑ تفریح گاہ کی طرح بڑھے چلے جا رہے تھے۔ عورتیں زرق برق کپڑوں کے ٹکڑے کمروں سے لپیٹے اور ان پر رنگ برنگ کے مرصّع کمر بند باندھے زیادہ امیر عورتیں گلے میں بھی خاص تراش کے کپڑوں کے ٹکڑے پہنے ہوئے جو پیاز کی جھلی سے بھی زیادہ باریک تھے۔ ہاتھوں میں کنگن اور پیروں میں پازیب، بھرپور سینوں کے بوجھ تلے نازک کمریں پیچ و خم کھاتی ہوئیں— اور اگر ان میں سے کوئی مخملیں لب دوشیزہ کنپٹی کے قریب بے ترتیبی سے گری ہوئی لٹوں کو سنوارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے ساعد سیمیں کی ہر جنبش ابرِ محیط میں بجلی کے کوندنے کا ارضی جواب ہے۔ پھولوں کے کسی کنج میں سے بانکے نوجوانوں کے گروہ کلائیوں پر کلیوں کے ہار لپیٹے اور لبوں سے الغوزوں کے سرے لگائے بڑی شوخی سے تانک جھانک کر رہے تھے باہر سے آئے ہوئے پردیسی مکانوں کے آگے بنے ہوئے گارے یا پتھر کے بنے ہوئے چبوتروں پر نیم دراز ان جوبن کی

متوالیوں کی زیارت کر کے دلوں کو گرما رہے تھے۔

ان میں طرح دار مشہور رقاصہ ماشی را بھی تھی۔ ماشی را کا مطلب تھا "ننھی بلی" یہی وہ رقاصہ تھی جسے رات کے آخری پہر میں سپیدی سحر نمودار ہونے تک دیوی رازانہ کے سامنے رقص کرنا تھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ لوگ اسے وادی نیل کا پھول کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کے بوجھل بال پہاڑ کی بلندی سے گرنے والے آبشار کے کف اڑاتے ہوئے پانی کی منہ توڑ لہروں کی طرح بل کھاتے اور کروٹیں لیتے ہوئے چلے گئے تھے۔ اس کی پیشانی کے بیچوں بیچ سونے کا کنٹھا لرز رہا تھا جس میں سبز و سرخ موتی جڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں کنول کے پھول اٹکے ہوئے اور کلیاں پیشانی پر بکھری ہوئی۔ اس کے کانوں میں پڑی ہوئی سونے کی ہلکی ٹکلیاں چاند کی روشنی میں اس کے مے گوں رخساروں پر منعکس ہو کر اس کی میدہ شہاب رنگت کو اور بھی جاذب نظر بنا رہی تھیں۔ اس آتشیں رو رقاصہ کی اچھوتی چھاتیاں ان الٹے رکھے ہوئے مٹی کے کورے کوزوں کی طرح تھیں جن کے نیچے کا راز کسی نے نہ پایا تھا۔

کاہن اعظم کو دیکھ کر سب لوگ حسب معمول مودبانہ کھڑے ہوگئے دل میں سب کو اطمینان تھا کہ وہ بوڑھا کاہنِ اعظم جو دنیا بھر کے علوم و فنون کا جاننے والا تھا۔ اس جگہ رُکے گا نہیں کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کاہنِ اعظم کو مجذوب درویش سے انس تھا۔ درویش کے پاس پہنچ کر وہ دریا کی سیر بھی کرے گا اور اس سے دو دو باتیں بھی کرے گا۔

یہ درویش جسے سب مجذوب کہتے تھے اکہرے بدن کا الجھے ہوئے بالوں والا ایک فقیر بے نوا تھا۔ مصر کی گرم آب و ہوا میں زیادہ کپڑے پہننا ناممکن تھا۔ اس لیے مرد عموماً کمر کے گرد ایک کپڑا لپیٹ لیتے تھے۔ یہ کپڑا گھٹنوں کے اوپر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ عورتیں جسم کے نیچے کا نصف حصہ کپڑے کے دو ٹکڑوں سے ڈھانپتی تھیں جو ٹکڑا پچھلی

جانب لپیٹا جاتا تھا وہ نسبتاً چوڑا ہوتا تھا اور دوسرا ٹکڑا جو وہ آگے کی طرف استعمال کرتی تھیں کچھ کم چوڑا ہوتا تھا۔ پیٹ پر کمر بند یوں تو عورتوں کا یہ لباس ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ لیکن چلتے وقت ان کی سڈول ٹانگیں ان کپڑوں کی زد سے باہر آجاتی تھیں لیکن اس کو بے شرمی سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی مہذب ترین لباس سارے مصر میں رائج تھا۔ خیر اور لوگ تو تھوڑے بہت کپڑے پہنتے ہی تھے لیکن اس درویش کے جسم پر کسی نے ایک تار بھی کبھی نہیں دیکھا تھا وہ صبح ہی صبح شہر سے پرے ایک نخلستان سے دریا کے کنارے پر پہنچ جاتا۔ اور شہر کی طرف منہ کر کے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ مٹی کا ایک پیالہ اپنے سامنے زمین پر رکھ دیتا۔ راہگیر پیالے میں کھانے کی کوئی نہ کوئی شے ڈال دیتے تھے۔ جب وہ دیکھتا کہ اس پیالے میں پیٹ بھرنے کے لیے کافی خوراک جمع ہوگئی ہے تو وہ اسے کھا پی کر پیالے کو اوندھا کر دیتا اور شہر کی طرف پیٹھ پھیر کر دریا کی جانب دیکھنے لگتا وہ ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ اس کی پیشانی پر کبھی بل نہ آتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے یوں ہی مسکرائے جاتا۔ کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کس بات پر اس قدر خوش نظر آتا ہے۔ اس کی بابت لوگوں کی رائیں مختلف تھیں۔ لیکن زیادہ تر اسے پاگل ہی سمجھتے تھے۔

مصر بھر میں صرف یہی ایک شخص تھا جو کاہن اعظم کی تعظیم کرنے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا بلکہ اسے تو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ فرعون کو اس بات کی خبر ملی تو وہ اس کے خلاف کوئی قدم سخت اٹھانے لگا۔ لیکن کاہنِ اعظم نے منع کر دیا۔ کبھی کبھی مجذوب درویش ٹھنڈی ریت پر کاہن اعظم کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ جاتا۔ ظاہر ہے کہ کاہن اعظم کی موجودگی میں اس کی یہ حرکت نہایت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ لیکن وہ بے پروائی سے ہنسا کرتا کبھی کاہن اعظم سے مخاطب ہو کر کہتا۔ ”تیری آنکھوں کی روشنی اس دنیا کی روشنی نہیں یہ عرشی نور ہے۔“

کاہن اعظم یہ سنتا تو دل ہی دل میں تعجب کرتا۔ سوچتا میرے مجذوب بندوں کی رسائی کی آخر کوئی حد بھی ہے؟ اور کبھی وہ اپنے دل میں کہتا کہ کہیں یہ درویش میرے

کل حالات سے واقف تو نہیں شاید یہ حقیقت جانتا ہو کہ میں ہی خداوند ہوں اور میں نے ہی اس مہذب ترین قوم کو سیدھا رستہ دکھانے کے لیے گوشت پوست کے اس ڈھانچے میں خود کو محبوس کر لیا ہے اور اب دوسرے انسانوں ہی کی طرح بے بضاعت اور مستقبل سے بے خبر ہوں۔ اور اسی طرح رہوں گا تا وقتیکہ میری روح کو موت قبض کر کے اس فضا میں آزاد نہیں چھوڑ دیتی— یہ سوچ کر وہ درویش کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھتا لیکن درویش مجذوبانہ طور سے ہنستے جاتا— اور کاہن اعظم بحثیت انسان کے اس کے دل کا حال نہ پاسکتا تھا اور نہ اُسے اتنی جرأت ہی ہوئی کہ وہ اس سے بات دریافت کر لے۔

کاہن اعظم درویش کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ وہ حسب معمول شہر کی طرف بیٹھ گئے افق کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس نے کاہن اعظم کی طرف رخ کیے بغیر کہا ''کاہن! مجھے تجھ سے ایک بات پوچھنی ہے۔''

کاہن اعظم متعجب ہوا۔ درویش نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' کاہن! بتا تیرے لوگ مجھے ہنسنے کیوں نہیں دیتے لکڑی پر پتھر رگڑ رگڑ کر اسے ہموار کرنے والی بڑھئی، دہلتے انگاروں کے پاس بیٹھ کر لوہا کوٹنے والے لوہار، چمڑے کے تھیلوں میں پانی بھر بھر کر اپنے کھیت سینچنے والے کسان شب و روز قوم کے بے جان بت کے آگے پیشانیاں رگڑنے والے پجاری، اپنے باغوں میں انجیر کے درختوں تلے تالابوں میں پڑے رہنے والے امرا— مجھ سے پوچھتے ہیں— میاں! تو ہنستا کیوں ہے؟''

کاہن اعظم مسکرانے لگا— درویش اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا خالی پیالہ اٹھا کر چلتا بنا۔

دور سے شہنائیوں، بربطوں ، اور بنسریوں کی ملی جلی اڑتی ہوئی صدائیں آرہی تھیں۔ یقیناً تفریح گاہ میں اس وقت ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ لوگوں کے گیتوں، قہقہوں ،

تالیوں، اور نازک عورتوں کی مسرت انگیز چیخوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ دور شام کے دھندلکے میں مجذوب درویش ریت کے ٹیلوں میں نظروں سے اوجھل ہوا جا رہا تھا۔ جب تاریکی روشنی پر غالب آچکی اور بڑے بڑے چمگادڑ خاموشی سے اپنے لمبے چوڑے پر پھڑپھڑاتے ہوئے ویرانے کی طرف اڑے جارہے تھے۔ تو کاہن اعظم نے غلاموں کو اشارہ کیا جو ذرا پرے اس کے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ وہ فوراً پالکی آگے لے آئے کاہنِ اعظم نے چپل اتار کر کفش بردار کو دے دیئے اور خود پالکی میں بیٹھ گیا۔

مویشی کھیتوں سے واپس آرہے تھے۔ لڑکے بالے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ کر ایک دوسرے پر کیچڑ کے گولے بنا بنا کر پھینک رہے تھے۔ کئی غریب لوگ اطمینان سے لکڑی کے تختوں پر مہرے بچھائے چالیس چلنے میں منہمک تھے۔ اور چند نوجوان زمین پر پیروں کے بل اکڑوں بیٹھے انگلیاں بوجھنے کا کھیل کھیلنے میں معروف تھے۔ ان میں سے ایک اپنا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے سے دفعتاً آگے کر کے انگلیاں دکھاتا اور دوسرا فوراً ان کی تعداد بتاتا۔ اگر بتانے والا صحیح ہوتا تو وہ جیت جاتا اور اگر غلط ہوتا تو ہار مان لیتا۔ کہیں کہیں کسی گلی کی نکڑ پر کوئی لمبے چغے والا داستان گو ابو الہول کی پیٹھ پر بیٹھا ہاتھ اور بازو ہلا ہلا کر، آنکھیں مٹکا مٹکا کر، اور بھنویں گھما گھما کر کوئی دلچسپ قصہ سنا رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے مرد اور عورتیں بیٹھے بڑے انہماک سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔

کاہنِ اعظم اس مہذب اور خوب صورت قوم کے افراد کو دیکھتا تو اس کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی—— صرف چند پہر باقی تھے۔ کل سپیدۂ سحر نمودار ہونے پر وہ ان کو ایسا پیغام دینے والا تھا۔ جسے سن کر ممکن ہے وہ اسے قتل کر کے اس کا گوشت کتوں کو کھلا دیں—— بے شک وہ خداوند تھا لیکن اس وقت وہ محض ایک انسان تھا۔ اتنا ہی کمزور اور بے بضاعت، مستقبل سے ناواقف، انہیں کی طرح وہ بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا تھا۔ دکھ اور درد کا احساس کرتا تھا۔ کاش! وہ راز جو وہ بے نقاب کرنے والا تھا۔ یہ لوگ

بھی سمجھ سکیں۔ اس طرح ہی ان کی فکر بلندی کی طرف اٹھ سکتی تھی۔ اور اسی میں ان کی بہبود بھی تھی......

کاہنِ اعظم انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اس کی پالکی فرعون کے محل کے پاس جا پہنچی۔ شاہی دروازے کے اوپر کھڑے ہوئے سات سپاہیوں نے لمبی لمبی نفیریاں بجا کر اس کی آمد کا اعلان کیا۔ سب لوگ اس کا استقبال کرنے کے لیے بڑے دروازے س آن کھڑے ہوئے۔ آگے آگے فرعون تھا پیچھے پیچھے شاہی خاندان کے افراد— عورتیں، امراء، وزرا وغیرہ۔

نوجوان فرعون ایک سرو قد اور خوب صورت شخص تھا۔ اس وقت وہ جنوبی و شمالی مصر کا مشترکہ تاج سر پر رکھے ہوئے تھا۔ متبرک گدھ کے پھیلے ہوئے سنہرے پروں کے نیچے اس کے کان چھپے ہوئے تھے۔ سنہرے پروں کے نیچے سے ارغوانی رنگ اور چوڑی دھاری کے قیمتی کپڑے کے دو پلو اس کے دونوں کندھوں پر گرے ہوئے تھے۔ گلے کے چاروں طرف نصف سینہ ڈھانپے ہوئے ایک چوڑی سی منقش پٹی سی تھی۔ نہایت باریک ململ کا لبادہ اس کے کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔ ایک پھول دار تہبند اس کے ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ سنہری کمر بند میں سے نکلا ہوا سفید جھاگ کی طرح کا کپڑا اس کے گھٹنوں تک لہرا رہا تھا۔ اس کی پشت کی جانب کمر بند سے متبرک گیدڑ کی دم لٹک رہی تھی اس کے ہاتھ میں شاہی عصا تھی۔ اس کے پیچھے کفش بردار اس کے چپل لیے کھڑا تھا۔ دو غلام شتر مرغ کے پروں کے اونچے اونچے پنکھے اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا پالتو شیر اس کی ٹانگوں کے قریب کھڑا منہ پھاڑ رہا تھا۔

فرعون نے کاہن اعظم کو دیکھتے ہی اس کے لبادے کا دامن آنکھوں سے لگایا۔ کاہن اعظم نے پاکیزہ پانی سے لبریز چاندی کے پیالے میں انگلیاں بھگو کر پانچوں انگلیاں فرعون کی پیشانی پر لگا دیں اس کے بعد امرا اور عورتیں آگے بڑھیں اور آداب بجالائیں۔

دالان میں ایک قدِ آدم بربط پر ایک حسین عورت کی نازک انگلیاں رقص کرنے لگیں۔ دعوت کا انتظام وسیع دالان ہی میں کیا گیا تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر جتنی بھی تصاویر تھیں ان میں فرعون کی زندگی کے واقعات دکھائے گئے تھے۔ مثلاً ایک جگہ وہ شیر کا شکار کھیلتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے رتھ میں کھڑا کمان کھینچ رہا تھا۔ اور اس کے نیزہ بردار سپاہی جھنجلاتے ہوئے شیر پر نیزے پھینک رہے تھے۔ ایک تصویر میں فرعون ایک مجرم کو بالوں سے پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص قسم کا ایک گرز تھا۔ گرز لکڑی کے ایک مضبوط ٹکڑے پر دو نوکوں والا پتھر باندھ کر بنایا گیا تھا۔ اس کا گرز والا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ایک تصویر میں فرعون اپنے مویشیوں کو گنتا ہوا دکھایا گیا تھا۔

کئی کئی بتیوں والے چراغ روغن ہو چکے تھے۔ دالان میں خوب سجاوٹ کی گئی تھی۔ عورتوں کے بھڑکیلے کپڑے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ بھاری میزوں پر مختلف قسم کے پھلوں کے طشت رکھے ہوئے تھے۔ عریاں اور نیم عریاں غلام اور کنیزیں مشعلیں لیے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ لڑکے مدھم سروں میں بنسریاں بجا رہے تھے۔ سوانگ رچانے والے بہروپئے اور نٹ اپنے اپنے کرتب دکھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

کاہن اعظم اور فرعون کے بیٹھنے کے لیے کوچ بچھائے گئے تھے۔ یہ کوچ پلنگوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ ان کے سرہانے کی طرف دونوں پایوں پر چیتوں کے منہ بنے ہوئے تھے۔ کوچوں پر گدیلے پڑے تھے اور ان پر لکڑی کے تکیے۔ فرش پر ایک ایک بالشت اونچے پائدان باقی لوگوں کے بیٹھنے کے لیے خوب صورت چوکیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

پہلے کاہن اعظم اپنی جگہ پر بیٹھا پھر فرعون اور اس کے بعد سب لوگ بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے حسب معمول مومیائی ہوئی ایک لاش محفل میں گھمائی گئی۔ پھر بربط نواز نے اپنا دل دوز نغمہ چھیڑا۔ پہلے اس نے دنیا کی بے ثباتی کا گانا گایا۔ مصر کے

پرانے بادشاہوں کا ذکر کیا۔ جو اپنے عظیم الشان مقبروں میں سوئے پڑے تھے۔ ان میں ایسے حکمران بھی تھے کہ جب وہ زندہ تھے تو اس وقت زمین ان کے پاؤں تلے کانپتی تھی۔ ان کی دولت کا شمار نہ ہوسکتا تھا۔ وہی لوگ اب خاک میں مل چکے تھے۔ ان کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اور کئی کشور کشا تا جور ایسے مٹے جیسے انہوں نے اس دنیا میں کبھی قدم ہی نہ رکھا تھا۔ گیت کے آخری حصے کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی روح دوسری دنیا سے واپس آ کر ہمیں بتلاتی کہ اس کا وہاں کیا حال ہے۔

تا کہ پیش تر اس کے کہ ہم اس دنیا کو خیر باد کہہ دیں ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو۔

نہ معلوم وہ لوگ کہاں چل دیئے — لیکن خیر

ہم کو چاہئے ایسی رنج دہ باتوں کو بھلا کر دلوں کو اور کسی طرف متوجہ کریں۔

جب تک زندہ رہو عیش کرو۔

اپنی پیشانیاں لوبان سے خوشبو دار کر لو......

دلوں کو اداس مت ہونے دو، کھاؤ پیو، جو جی میں آئے سو کرو۔

اس اندوہ ناک گھڑی تک

ان نوحوں کی طرف دھیان مت دو جو بین کرنے والے اپنے بچھڑے ہوؤں کی قبروں پر پڑھتے ہیں۔

کیوں کہ جو مرگیا سو مرگیا، اس کے لیے یہ سب کچھ بے کار ہے۔ اس دعوت کے سامان سے دل بھر کر لطف اٹھاؤ۔

کیوں کہ کوئی شخص کوئی شے سینے پر رکھ کر نہیں لے جاسکتا۔ اور ہاں، مت بھولو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ رخصت ہو کر پھر واپس کبھی نہیں آتا۔

اس کے بعد فوراً ہی الغوزوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ڈھول بجنے لگے۔ ناچنے والی لڑکیاں چلبلے پن سے کولھے مٹکاتی تھرکتی ہوئی پھرکیوں کی طرح گھومنے لگیں۔

آتشیں رخ کنیزیں شراب کی صراحیاں بغلوں میں دبائے مہمانوں کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے پیالوں میں دودھ اور شہد ملی شراب چھلکانے لگیں۔ اور ان کے سامنے سر کے میں بسی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی طشتریاں رکھ دی گئیں۔

اس وقت وزیر اعظم نے کھڑے ہو کر کہا۔" اس مسرت انگیز موقع پر یہ پہلا پیالہ اپنے محبوب فرعون کی صحت کے لیے۔" سب لوگ اپنا اپنا پیالہ چڑھا گئے۔ وزیر نے پیالہ پرے پھینک کر بلند آواز میں پکار کر کہا" فرعون وقت، سانڈوں کا سانڈ ہے جو اپنے دشمنوں کو پاؤں تلے کچل کر ان کی چٹنی بنا دیتا ہے۔" اس پر سب نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔

فرعون زندہ دل شخص تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد خوب قہقہے لگا لگا کر باتیں کرنے لگا۔

جب فرعون کو، ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے امرا نے بتایا کہ آج کل مصری نوجوان یا تو آرام طلب ہو گئے ہیں۔ یا اپنے عزیزوں سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے وہ شاہی فوج میں بھرتی ہونے سے دامن بچاتے ہیں تو بادشاہ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا" میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر مصری نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے کیا دیوتا را کی اولاد کا ان پر کچھ بھی حق نہیں رہا— اور پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ پردیس میں انہیں پینے کو بہترین انگوروں کی شراب ملتی ہے۔ لوٹ مار میں نت نئی بھرپور رانوں والی عورتیں میسر آتی ہیں۔ اور سونے کے ڈلے واپس گھر لانے کو ہاتھ لگتے ہیں۔ آخر اور وہ کیا چاہتے ہیں؟— اور جب وہ واپس آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی وہ بہنیں جنہیں وہ گھر پر گرد میں کھیلتی چھوڑ گئے تھے اور جن کی چھاتیاں اس وقت بالکل سپاٹ تھیں واپس آنے پر دو خوش وضع چھاتیاں ایسے ابھر آتی ہیں جیسے لق و دق ریگستانوں میں قدیم بادشاہوں کے مقبروں کے نوک دار مینار— جب وہ سونے چاندی کے ڈلوں سے لدے ہوئے آتے ہیں تو روٹی

کی فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور پھر شتر مرغ کے نازک نازک پروں کی سجوں پر ان کی جو بن کی ماتی بہنیں اس قابل ہوتی ہیں کہ وہ اپنی سالہا سال کی تکان دور کرسکیں اور نسل جاری رکھنے کے لیے بچے بھی پیدا کرسکیں۔"

سب نے فرعون کی عقل کی داد دی۔ اور یہ طے پایا کہ فرعون کا یہ پیغام ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا جائے۔

اس کے بعد خوب زور زور سے باتیں ہونے لگیں۔ مسلم مرغابیاں، بطیں، چوزے، جنگلی بکری کا گوشت، نو عمر بیلوں کی رانیں اور کئی قسم کے سالن اور مزیدار کھانے میزوں پر چن دیئے گئے۔ مہمانوں نے جی بھر کر شراب پی۔ مہمان اپنی انگلیاں چاٹتے اور چٹخارے لیتے تھے۔

دعوت زوروں پر تھی۔ نٹ تماشے دکھا رہے تھے۔ بنسریاں بج رہی تھیں۔ چلبلی گل رخ لڑکیاں تھرک رہی تھیں۔ کاہن اعظم ا(۱) سب کو اپنی گھنی بھنوؤں تلے سے دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں میں نے بلند آواز میں ایک لطیفہ سنانا شروع کیا۔ چند روز پیش تر بابل کے بادشاہ کے بھیجے ہوئے سفیر دربار میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ لمبے لمبے کانوں والے سات گدھے بھی تھے۔" میں نے دریافت کیا۔ ان گدھوں پر کیا شے لدی ہوئی ہے؟ ان میں سے ایک آداب بجالایا اور کہنے لگا بندہ پرور ان گدھوں پر وہ اینٹیں لدی ہوئی ہیں جن پر ہمارے معزز بادشاہ سلامت نے حضور کے نام خط لکھ کر بھیجا ہے۔ یہ بات سن کر میں ہزار کوشش کے باوجود ہنسی ضبط نہ کرسکا۔" یہ لطیفہ سنا کر فرعون پھر بے اختیار ہنسنے لگا۔" غور کرو بابل کے بادشاہ کو ایک خط کے لیے سات گدھوں کی ضرورت پڑی۔"

اس پر سب لوگ خوب ہنسے۔

مصر دنیا کا متمدن ترین ملک تھا۔ اس کے باشندے زندگی کے ہر شعبے میں دنیا

کے کل ممالک سے آگے تھے۔ وہ ایک صحت اور ہوش مند اور مہذب قوم تھی۔ ملک کے منتخب ترین لوگ یہاں جمع تھے۔ کاہن اعظم سوچ رہا تھا۔ کیا یہ لوگ انسانی فکر کی سیڑھی کے بلند تر ڈنڈے پر پاؤں رکھنا منظور کرلیں گے؟ کاہن اعظم ان قہقہوں کے درمیان ایک عجیب قسم کی ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔

رفتہ رفتہ محفل سرد پڑنے لگی۔ اس جلسے کو طول دینے سے جان بوجھ کر احتراز کیا گیا۔ کیوں کہ دوسرے روز ایک پہر رات رہے سب کو توم کے مندر میں پوجا کرنے کے لیے جانا تھا۔ چراغوں کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کی لوئیں ٹمٹمانے لگی تھیں۔ رقاصاؤں کے گھنگھرو اور بنسریاں بجانے والے لڑکوں کے ہونٹ دکھنے لگے تھے جگہ جگہ بہتی ہوئی شراب چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور مسلے ہوئے پھول گرے پڑے تھے۔

محفل ختم ہونے کے بعد جب کاہن اعظم پالکی میں بیٹھ کر مندر کو جا رہا تھا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ جو لوگ شراب کے نشے میں بالکل ہی دھت ہو گئے تھے۔ انہیں ان کے غلام کندھوں پر لادے لیے جا رہے تھے۔ جب وہ تفریح گاہ کے قریب سے گزر رہا تھا تو وہاں بھی معمول سے بہت پہلے بے رونقی طاری ہو گئی تھی۔ دور دراز مقامات سے آئے ہوئے یاتری لب سڑک چبوتروں یا پتھر کے کوچوں پر سو رہے تھے۔ دریائے نیل کے پانی کا ریلا زور کرتا ہوا آتا تو اس کی لہریں تیز رفتار سانپوں کی طرح زبانیں نکالے بیشارتی کے چبوترے پر چڑھ دوڑتیں اور جب ریلا واپس چلا جاتا تو پھیکی چاندنی میں چوڑے پتھروں میں رکا ہوا پانی جھلملانے لگتا ہے جب وہ مندر کے دروازے میں داخل ہوا تو دیکھا مندر کی سیڑھیوں پر سینکڑوں تھکے ماندے یاتری نیند میں مدہوش پڑے ہیں۔

کاہن اعظم اپنے پلنگ پر لیٹتے ہی سو گیا۔

مندر کے دوسرے حصے میں پجاریوں کے منتر پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لوگ بیضوی تالاب کے چبوترے سے ایک طرف ہٹ کر باری باری منتر پڑھے

جا رہے تھے۔

یہ مندر اس نیت سے بنایا گیا تھا کہ یہ ابد تک قائم رہے گا آندھیاں اور زلزلے اس پر اثر نہ کرسکیں گے۔ بیضوی تالاب کے دونوں طرف جو عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ یہ بلحاظ فن تعمیر دنیا بھر میں یکتا تھیں۔ اس خاموش رات میں جب کہ دریائے نیل کا پانی بھی چپ چاپ بہہ رہا تھا، توم کا یہ عدیم المثال مندر اور بھی زیادہ پر اسرار نظر آرہا تھا۔ ان دونوں عمارتوں میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں داہنے ہاتھ والی عمارت کے پیچھے ایک تالاب تھا۔ جس میں نہانا ہر یاتری کے لیے لازمی تھا۔ مندر کی عمارت میں ہندوستان کے سنگ مرمر کی بنی ہوئی رازانہ دیوی کی مورتی مدھم روشنی میں لکۂ ابر کی طرح نظر آرہی تھی۔ شمعیں روشن تھیں۔ مورتی کے دائیں بائیں طرف مٹی کے بنے ہوئے برتنوں میں جن پر سرخ رنگ کے بیل بوٹے منقش تھے، عرب سے آئی ہوئی خوشبوئیں جل رہی تھیں اور دھواں بل کھاتا ہوا چھت کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

مورتی کے سامنے وہ چبوترہ تھا۔ جہاں بیلوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ اور اس کے آگے متبرک گیدڑ کے منہ والی ٹونٹی تھی جس میں سے گرم گرم خون حوض میں گرتا تھا۔ حوض کے پرلے کنارے پر ایک اور چوڑا چبوترہ تھا۔ جہاں مصر کی تیرہ منتخب اچھوتیاں خون میں نہانے کے بعد رقص کرتی تھیں۔ ٹونٹی کے دونوں طرف انجیر کی نازک پتیوں والی شاخیں لٹک رہی تھیں۔

ایک پہر رات رہ جانے پر لوگ جمع ہونے لگے۔ جب وہ آتے تو مورتی کے سامنے قربانی کے چبوترے پر پھولوں کی پنکھڑیوں کی ایک مٹھی بکھیر دیتے۔ اور جب بہت زیادہ پنکھڑیاں جمع ہو جاتیں تو پجاری پنکھڑیاں جمع کر کے متبرک تالاب کے کنارے بکھیر دیتے۔

غلاموں نے کاہنِ اعظم کو جگایا اور بتایا کہ یاتری، پجاری، امراء وغیرہ جمع ہو چکے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد تالاب میں نہا رہے تھے اور وہ سجا سجایا متبرک بیل

جو رات بھر خاموشی سے گلیوں میں گھمایا گیا تھا واپس آ چکا تھا۔

کاہن اعظم جلدی سے کپڑے بدل کر مورتی کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہاں سب لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ ایک طرف ڈھول ، نفیریاں، تھالیاں اور بربط بجانے والے کھڑے ہیں۔ ان کے آگے وہ بیل کھڑا ہے جو رات بھر گلیوں میں گھمایا گیا تھا۔ بیضوی تالاب کے پرلے کنارے پر مصر کی تیرہ حسین اچھوتی لڑکیاں اپنے لمبے بالوں میں اپنی عریاں جسموں کو چھپائے سمٹی ہوئی بیٹھی ہیں۔ فرعون اور شاہی خاندان کے افراد آہستہ آہستہ داہنے ہاتھ کی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ مشہور رقاصہ ماشی راج دھج کر رقص کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہے۔ صرف فرعون کے تخت پر جلوہ افروز ہو جانے کا انتظار ہے۔

چوں کہ یاتری بہت زیادہ تعداد میں جمع ہوئے تھے اس لیے وہ لوگ جو عوام کی عمارت میں نہ سما سکے باہر میدان میں دور تک ریت ہی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

کاہن اعظم نے آسمان کے ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھا۔

اُدھر فرعون نے تخت پر پاؤں رکھا۔ اِدھر نفیریاں بجانے والوں نے ایک مرتبہ نفیریاں بجائیں اور پھر خاموش ہو گئے اس کے ساتھ ہی بربط کے تاروں کو چھیڑا اور ایک ایسا غم ناک اور دل میں اُتر جانے والا نغمہ چھیڑا کہ ایک مرتبہ تو حاضرین کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا کی ناپائیداری کا نقشہ کھینچ گیا — ماشی را دف بجاتی زلفیں اڑاتی بیضوی تالاب کے پرلے سرے والے وسیع چبوترے پر رقص کرنے لگی۔

پجاریوں نے منتر پڑھنے بند کر دیئے تھے۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس لامتناہی سکوت میں بربط کے تاروں کی صدا اور دف کی جھنکار میں یہ ایک نئی اور انوکھی دنیا معلوم ہو رہی تھی۔

وہ رقص کیا تھا۔ دیوی کے آگے اپنی بضاعتی کا اظہار' منت اور اس کی نظرِ عنایت کے لیے ایک پکار تمنا تھی۔

نغمہ جاری رہا۔ اور پھر رقاصہ کی تالی کی تال میں وقفہ لحہ بہ لحہ کم ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ماشی را کے رقص میں سمندر کی طوفانی لہروں کی سی تیزی، جوالامکھی پربت کے منہ سے بہتے ہوئے لاوے کی سی تندی، کالی گھٹاؤں میں چمکنے والی بجلی کی سی برق رفتاری پیدا ہوگئی ساتھ ہی نفیریاں بڑے زور زور سے بجنے لگیں۔ ڈھول بجانے والے کپاس کی چھڑیوں سے اندھا دھند ڈھول بجانے لگے۔ بربط نواز نے بربط کے تاروں کو نچا ڈالا۔ تھالیاں بجانے والوں نے تھالیاں پیٹ ڈالیں اور حاضرین پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ بے اختیار سر دھننے لگے۔ اور اُدھر صبح کا ستارہ طلوع ہوا اِدھر ایک بڑے نقارے پر چوب پڑی اور اس کے ساتھ ہی ماشی را نے مورتی کی طرف منہ کر کے پیشانی فرش پر ٹیک دی— سارے ساز ایک دم بند ہوگئے— البتہ نقارے کی پرہول آواز چند لمحوں تک لرزاں رہی۔

اب کاہن اعظم کی باری تھی۔

قد آور کاہن اعظم آگے بڑھا اور اپنے لبادے کا دامن سنبھال کر قربانی والے چبوترے پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے حاضرین کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لیا۔ پھر اس کی بھرپور آواز گونجی مصر کے مردو! عورتو! بچو، لو ہارو! کسانوں! مزدورو! پجاریو! کاریگرو! معمارو! اور مفکرو!— آج میں ایک بڑا اہم فرض ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔ یہ مہادیوی رازانہ کی پوجا کا دن ہے— یہی وہ موقعہ ہے جس کا مجھے انتظار تھا— اور میں ایک راز دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ اس لیے کہ میں آپ لوگوں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ یہ راز آپ کو بتا دیتا۔ لیکن اب میرا خیال یہی ہے کہ آپ کو اپنا رازداں بنالوں اور مجھے یقین کامل ہے کہ دنیا کی یہ متمدن ترین قوم انسانی فکر کی سیڑھی کے اوپر والے ڈنڈے پر قدم رکھنے میں پس و پیش نہیں کرے گی۔

پیش تر اس کے کہ میں اپنا اصل مدعا بیان کروں میں ایک حکایت سنانا چاہتا ہوں— ہمارے ملک سے بہت دور ایک اور ملک ہے جسے یونان کے نام سے پکارتے

ہیں۔ یونانیوں کی دیو مالا میں ایک کہانی قابلِ شنید ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں جب عرش کے رہنے والے دیوتا زمین کے باشندوں سے راہ و رسم رکھتے تھے، ہماری دھرتی کا ایک بیٹا، ٹائتھنس نامی، صبح کی دیوی اروراؔ پر عاشق ہوگیا۔ ارورا پربھات کی دیوی تھی۔ اس کا کام یہ تھا کہ جب جب سورج دیوتا کا رتھبان فیبس اپالو، اس کا رتھ ہانکتا ہوا آتا تو وہ مشرق کے روپہلی دراوزے کھول دیتی۔ جب وہ دروازے کھولنے لگتی تو اس خاکی دنیا کا ایک فرد یعنی ٹائتھنسؔ اپنے گھر سے باہر نکل آتا اور اس کی زیارت کر کے محبت کی آگ میں جلتے ہوئے دل کو ٹھنڈک پہنچاتا۔ دیوی بھی اس حسین نوجوان پر فریفتہ ہوگئی۔ اور ان کی محبت نے اس قدر طول کھینچا کہ بالآخر دیوی اروراؔ اپنے عاشق کو زمین سے اٹھا کر عرش پر لے گئی، اور انسانوں اور دیوتاؤں کے شہنشاہ جو جو پیٹر پر اپنی محبت کا راز افشا کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس کے عاشق کو آبِ حیات کا ایک گھونٹ عنایت کیا جائے تاکہ یہ فانی پتلا لافانی ہوجائے۔ جو پیٹر نے اس کی درخواست قبول کرلی۔

''اب وہ دونوں بڑے آرام سے بےفکر ہوکر دادِ عیش دینے لگے دیوی نے اپنے محبوب کے لیے لامتناہی عمر تو مانگ لی۔ لیکن دائمی شباب طلب کرنا بھول گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر اس کا عاشق بوڑھا ہوگیا۔ دیوی اس کے باوجود اس سے محبت کرتی رہی لیکن جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ ٹائتھنس کے منہ میں ایک دانت تک باقی نہ رہا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا، نقاہت اس قدر بڑھ گئی وہ چارپائی سے اٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ تو اس نے اپنی لرزتی ہوئی مدھم آواز میں محبوبہ سے کہا۔ اب تک کب تک مجھ سے محبت کیے جاؤ گی۔ ادھر میں بھی تمہارے حسن و شباب سے لطف اندوز ہونے سے معذور ہوں۔ اس لیے اب میری نجات موت ہی میں ہے— اس پر دل شکستہ دیوی جو پیٹر کے پاس پہنچی اور اس سے استدعا کی کہ اس کے عاشق کی زندگی ختم کردی جائے اس نے جواب میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا، نہیں

بیٹی! نہیں۔ تو اس بات پر مزید اصرار نہ کر...... کیوں جو شے ہم ایک مرتبہ عنایت کر چکے اسے واپس لے لینا یا اس کے خلاف عمل کرنا۔ خود ہمارے بھی بس کی بات نہیں۔"

کاہنِ اعظم نے سکوت کیا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ اس نے پھر اپنی بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اے مصر کے باشندو! تم جو دنیا کی متمدن ترین قوموں سے بھی زیادہ متمدن ہو۔ میں تم میں سے ہر ایک سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے الفاظ غور سے سنے— تم میں سے ہر ایک کو اپنی پاکباز ماں کی قسم! جس نے تمہیں نو ماہ تک اپنے پیٹ میں رکھا اور جب تم مدرسے میں پڑھتے تھے تو وہ تمہارے لیے اخروٹ کی گریاں، کھجوریں اور روٹیاں لے جایا کرتی تھی— میری بات کو گرہ میں باندھ لو۔ یہ کہانی جو میں نے تم کو سنائی اس کا ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ اس کائنات کے قوانین اٹل ہیں۔ ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ اگر ہم اس دیوی کی پوجا کریں گے۔ تب دریائے نیل میں طغیانی آئے گی۔ کھیت سیراب ہوجائیں گے، سورج دیوتا پیچھے ہٹ جائے گا تپتی ہوئی ریت ٹھنڈی ہوجائے گی۔ سوکھے ہوئے پیڑوں کی شاخوں پر نئی کونپلیں پھوٹیں گی......" لوگوں میں ہلچل پیدا ہوگئی لیکن کاہن اعظم نے بلند تر آواز میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سب غلط ہے۔ یہ پوجا ایک ڈھونگ ہے۔ یہ قربانیاں محض بے زبان جانوروں کا قتل عام— مصریو! باور کرو دریائے نیل میں طغیانی پوجا کے بغیر بھی آئے گی...... موسم بغیر دعاؤں کے بھی تبدیل ہوجائے گا...... سوکھے پیڑوں پر نئی کونپلوں کو تمہارے پیشانیاں رگڑنے سے دور کا بھی واسطہ نہیں......"

معا فرعون تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مارے غصہ کے اس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔

حاضرین میں افرا تفری مچ گئی۔ مشعلیں گر پڑیں، بچے پاؤں تلے کچلے گئے۔ فرعون کا پالتو شیر خوف زدہ ہو کر محلوں کی طرف بھاگ نکلا۔ قربانی کے بیل بدک گئے

لوگوں نے کاہنِ اعظم کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ سمجھے کاہن اعظم پاگل ہوگیا ہے۔ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔ اس کی منت سماجت کی خوشامد کی ، دھمکیاں دیں، لیکن وہ ہٹ پر قائم رہا۔ اس نے اپنے لمبے لمبے بازوؤں کو ہلا کر کہا مصر کے لوگو! میری بات سنو، ہوش میں آؤ میں تمہارے سامنے ترقی کی نئی راہیں کھولنا چاہتا ہوں—— میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ مجھے دیوتاؤں کے دیوتا توتم پر کوئی ایمان نہیں۔ میں اس پوجا کی کارروائی کو وقت کا بدترین مصرف سمجھتا ہوں—— ہمیں کسی دیوتا کی ضرورت نہیں۔''

یہ خبر سارے مصر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مصر کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی واقعہ تھا جو سنتا حیران رہ جاتا کیا کاہنِ اعظم عقل و حواس سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ کیا اسے دیوتاؤں کے قہر کا بھی خوف نہیں۔ کیا اس بوڑھے کے سر پر شیطان سوار ہے......

سب سے بڑا خطرہ قحط کا تھا۔ پوجا کے بغیر موسم کیوں کر بدل سکتا تھا۔ دریائے نیل میں طغیانی کیسے آسکتی تھی—— سورج دیوتا آگ برسائے گا۔ کھیت خشک رہ جائیں گے۔ درختوں کی جھلسی ہوئی شاخوں پر ایک تازہ کونپل تک نظر نہ آئے گی—— مصر پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا۔ انسان بھوکوں مر جائیں گے۔ مویشی کیچڑ کھائیں گے۔ بچے بلبلائیں گے۔ پڑوسی پڑوسی کا دشمن بن جائے گا۔ لوگ شہر کے کتوں اور بلیوں کو کھا جائیں گے۔ بالآخر والدین بچوں کو اور عورتیں خاوندوں کا گوشت کھائیں گی—— یہ منتخب قوم تباہ ہوجائے گی—— ملیامیٹ ہوجائے گی۔

لیکن کاہنِ اعظم کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی رضا مندی کے بغیر نیا کاہن اعظم بھی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ لوگ اس کی بوٹیاں اڑا دینا چاہتے تھے۔ لیکن کاہن اعظم کو کسی صورت میں بھی قتل کرنا گناہِ عظیم تھا۔ اس لیے فرعون کے حکم سے کاہنِ اعظم کو محل کے نیچے ایک ایسے تاریک تہہ خانے میں ڈال دیا گیا جہاں بچھوؤں کی بھرمار تھی

اور زہریلے سانپوں کا خوف۔

گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ چہل پہل رنگ رلیاں، کھیل، تماشے ناچ گانے سب موقوف، تفریح گاہ میں الو بولنے لگے۔ مہ رخ عورتوں نے بالوں میں خاک ڈالی عیش پسندوں کی اڑتالیس چپوؤں والی کشتیاں کنارے پر کھڑی کھڑی ہچکولے کھانے لگیں پانی کی لہریں آتیں اور ٹکرا کر واپس چلی جاتیں۔ بنسری بجانے والے لڑکوں نے بنسریاں توڑ کر پھینک دیں۔ عورتیں گلیوں میں چلا چلا کر کاہنِ اعظم کو کوسنے دیتیں۔

فرعون نے امراء سے مشورہ کر کے پہلے اس تجویز پر غور کیا کہ دریائے نیل سے اور زیادہ نہریں نکال کر کھیتوں میں آبپاشی کی جائے لیکن مشکل یہ تھی اگر آبپاشی کا انتظام ہو بھی جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہر سال دریائے نیل جو بہت اعلاقسم کی مٹی لاکر کناروں پر دور دور تک بکھیر دیتا تھا اس کا کیا حل ہوگا۔ اور اب جبکہ دیوتا ناخوش ہو چکے تھے اور ہمارے کاہن اعظم کے ہاتھوں ان کی جو تضحیک ہوئی ہے۔ شاید دریائے نیل بالکل ہی سوکھ جائے۔ دیوی رازانہ یقیناً آنسو بہانا بند کردے گی۔ اور اب اس دریا کا بھی کچھ بھروسہ نہیں— آخر بہت سوچ بچار کے بعد ایک تجویز طے پائی۔ اگرچہ یہ بھی کم دشوار نہ تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ ملک بھر کا اناج بڑی احتیاط سے کام میں لایا جائے۔ جن لوگوں کے پاس فالتو ذخیرے موجود ہوں۔ وہ بادشاہ کے بڑے ذخیروں میں جمع کرادیں تاکہ قحط پڑنے پر لوگوں کو بھوکوں مرنے سے بچایا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے ایک بڑی فوج اس مقصد کے لیے مقرر کی کہ وہ مصر کی حدود سے باہر نئی زمین تلاش کریں۔ شاید وہاں پہنچ کر وہ دیوتاؤں کے قہر سے کسی حد تک محفوظ رہ سکیں۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تگ و دو شروع ہوئی۔ لوگ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے وہ دار الخلافہ جہاں صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں جمتی تھیں اب وہاں

خاک اڑتی تھی۔ کسی کا ایک سریلے گیت کی ایک تان بلند کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ لوگ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے اور باقی انتظامات میں فرعون کی مدد کر رہے تھے۔

ایک دن چند سبزی فروش لڑکے گدھے دوڑاتے آئے اور خبر سنائی کہ دریائے نیل کے پانی پر سرخی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔۔۔ جو علامت اس امر کی تھی کہ عنقریب دریا میں طغیانی آنے والی تھی۔

لوگوں نے ان کی باتوں کا یقین نہ کیا لیکن احتیاطاً کچھ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر جدھر سے دریا کا پانی آتا اس طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے گئے اور خبر لائے کہ واقعی دریا میں طغیانی کے آثار نظر آتے تھے۔ دو چار روز کے بعد پانی بچ مچ چڑھنے لگا۔

گاؤں کے لوگ طغیانی کے موقع پر اپنے کچے مکانوں کو ڈھا کر اینٹیں گدھوں پر لاد دریا سے دور چلے جاتے تھے اور پھر واپس آ کر مکان کھڑے کر لیتے تھے۔ چناں چہ اب کچے مکانوں کے مالکوں نے دریا کا پانی طغیانی پر دیکھا تو گھروں کو ڈھا کر اینٹیں، گھر کا سامان، اور بچے گدھوں اور بیلوں پر لاد کر بکریاں ہانکتے ہوئے چل دیئے۔۔۔ سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

رفتہ رفتہ سوج دیوتا بھی زمین پر سے ہٹنے لگا۔ ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی۔ درخت ہرے بھرے ہوگئے۔ دریا کا پانی توتم کے مندر کی ایک سو پانچویں سیڑھی تک جا پہنچا۔ جب پانی اُتر گیا تو زمین پر اعلا درجہ کی زرخیز مٹی کی موٹی تہ جم گئی۔

اڑتالیس اڑتالیس چپوؤں والی کشتیوں کی از سرِ نو مرمت کی گئی۔ ان کو ایک مرتبہ پھر نئی نویلی دلہنوں کی طرح سجایا گیا۔ نوعمر لڑکوں نے سرکنڈے کاٹ کاٹ کر دوبارہ بنسریاں تیار کیں۔ تفریح گاہ کی بہار واپس آ گئی۔ شراب کے پیالے گردش میں آئے۔ لچکتی بل کھاتی جوبن کی ماتی دوشیزائیں پھر سے عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگیں۔ بربطوں کی جھنکار اور الغوزوں کی تانیں بلند ہوئیں۔

ایک روز صبح کے وقت کاہن اعظم کے تہ خانے کا دروازہ کھلا اور فرعون کے

خاص مصاحبین اندر داخل ہوئے۔ کاہنِ اعظم نم دار پتھریلے فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ چکے تھے۔ بچھوؤں کے ڈنک کھا کھا کر اس کی ایڑیاں دکھنے لگی تھیں۔

سب امیر اس کے پاؤں پر گر پڑے۔ انہوں نے بتایا کہ توم دیوتا نیز دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کے بت توڑ ڈالے گئے ہیں۔ کاہن اعظم کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا اوپر سلاخوں والے کھلے دروازے میں سے بہتے ہوئے دودھ کے دریا کی طرح اندر آنے والی دن کی سفید روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے زیرِ لب کہا ”یہ صداقت کی فتح ہے۔ ظلمت پر نور کو برتری حاصل ہوئی۔“

کئی دن کے بعد اسے دن کی روشنی نظر آئی۔ جب وہ لڑکھاتے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اسے کھلے دروازے میں سے صاف و شفاف ہلکا نیلا آسمان نظر آیا۔ ابابیلوں کے جھلڑ کے جھلڑ ہوا میں تیزی کے ساتھ دائرے بنا بنا کر اڑ رہے تھے۔

طویل عرصے بعد آج روشنی دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں وہ تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ محل کے وسیع دالان اور گلیوں میں، مکانوں کی چھتوں پر لاکھوں مرد، عورتیں بچے اس کی زیارت کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ مصر کی کنواریوں نے اس کے راستے میں اس کی رہائش گاہ یعنی توم کے مندر تک اپنے لمبے لمبے بال بچھا دیئے تھے تاکہ اس کے متبرک پاؤں گرد میں نہ اٹ جائیں۔

نفیریاں بجیں اور فرعون خود پیدل چلتا ہوا اس کی طرف بڑھا—— ڈھول بجا بجا کر لوگوں کو متوجہ کر کے نقارچی نے شاہی حکم سنایا۔ ”مصر کے باشندو! ہم نے توم کے بت توڑ ڈالے۔ سب نام نہاد دیوتاؤں کو ملیامیٹ کر دیا—— اور اب ہمارا خدا کاہنِ اعظم ہوگا۔ یہی ہمارا منتخب محبوب ہے اب بجائے توم کے اس کے بُت مصر کے مندروں میں نصب کیے جائیں گے......“

کاہن اعظم کے لبوں سے یکا یک مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کے چہرے کا

رنگ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں کے تلے گڑھے اور بھی گہرے ہو گئے۔

اور جب ملک کے ماہر ترین بت تراش آگے بڑھے تو کاہنِ اعظم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

لوگوں نے سمجھا وہ نقاہت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ اسے توم کے مندر میں پہنچا دیا گیا۔ ہوش آنے پر کاہنِ اعظم نے سب حکیموں، تیمارداروں اور غلاموں کو اپنے کمرے میں سے نکل جانے کے لیے کہا۔ سوائے مادر زاد برہنہ فقیر کے اور کسی شخص کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔

مصر کے کونے کونے سے لوگ جمع ہونے لگے۔ اور توم کے مندر کے باہر انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا تھا۔

ایک دن شام کے وقت خبر پھیل گئی کہ کاہنِ اعظم کی روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خبر پاتے ہی فرعون پالکی میں سوار ہوا۔ لاکھوں لوگ شہر سے مندر تک پھیلے ہوئے تھے۔ بادشاہ کی سواری بڑھی اور لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ سب لوگ افسردہ تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

جب فرعون سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ برہنہ فقیر گھبرایا ہوا باہر نکلا اور ہاتھ اوپر اٹھا کر مہیب آواز میں چلایا۔ مصر کے لوگو! سنو......"

فرعون رک گیا— لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

فقیر پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ چلایا۔ "مصر کے لوگو! کاہن کی وصیت پر کان دھرو۔ مرنے سے پہلے اس نے کہا کہ میرے بت نہ بنائے جائیں۔ میری پوجا نہ کی جائے۔ اس وقت میری روح عرش کی طرف پرواز کر رہی ہے اور اگر تم باز نہ آئے تو پھر نہ معلوم میری روح......"

فرعون کے اشارے پر فقیر کے قریب کھڑے ہوئے دو مضبوط ماہی گیروں نے

الٹے ہاتھ سے تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیے۔ نحیف درویش تیورا کر فرعون کے قریب گرا فرعون کا سنہری عصا اٹھا۔ اور اس کی ایک ہی ضرب سے وہ خاک و خون میں لوٹنے لگا۔

فرعون اطمینان کے ساتھ سیڑھیاں عبور کر کے کاہنِ اعظم کے حجرے کی طرف بڑھا۔ باقی خلقت سر جھکائے خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں کاہن اعظم کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کا جسم سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سوائے چہرے کے۔ حیرت سے کھلا ہوا منہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں...... جیسے مرتے وقت انہوں نے کوئی انہونی شے دیکھی ہو۔

فرعون نے دور ہی سے سنہری عصا پرے پھینک دیا اور دو زانو ہو کر پیشانی فرش پر ٹیک دی — اس کی رعایا نے بھی اس کی پیروی کی۔

یہ افسانہ پہلی بار ''ادبی دنیا'' جون 1945 میں شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ پہلی بار کلیات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پنجاب کا البیلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔ لیکن میں اس قدر دبلا پتلا اور منحنی سا لڑکا تھا کہ بہ مشکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور بورڈنگ میں رہتا تھا۔ یہ بورڈنگ تو برائے نام ہی تھا۔ اسے گھوڑوں کا اصطبل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ شہر سے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی عمارت تھی جس کے اردگرد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ عمارت چوکور تھی، اندر گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدہ تھا۔ فرش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں سے گرد نکل نکل کر چلنے والوں کے قدموں کے ساتھ اڑا کرتی تھیں۔ کمرے بہت بڑے بڑے تھے اور ایک ایک میں کئی کئی لڑکے رہتے تھے۔ ہر لڑکے کے لیے ایک الماری، ایک چار پائی، ایک کرسی اور آدھی میز مخصوص تھی۔

باورچی خانے کا کل انتظام لڑکوں کے سپرد تھا۔ رسوئی میں تین نوکر تھے ایک باورچی اور دو نوکر کھانا کھلانے اور دوسرے کاموں کے لیے۔

باورچی خانے میں کوئی شے مول تھوڑے آتی تھی۔ سب کے سب جاٹوں کے لڑکے تھے۔ گھی اور گیہوں گھروں سے آجاتے تھے۔ اور ضروریات کی باقی چیزیں مثلاً ایندھن، سبزی، ترکاری مار دھاڑ سے حاصل کی جاتی تھی۔ ہوسٹل کے پیچھے ایک "ارائیں"[1]

---

1. پنجاب میں سبزی ترکاری بونے اور بیچنے کا کام کرنے والی جماعت

کے کھیت تھے۔ اس ارائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو چھیلے بیٹے تھے۔ دن بھر لڑکے ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ سبزیاں اڑا لاتے۔ بے چارے ارائیں نے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ان لڑکوں کی شکایتیں کیں۔ لیکن بے چارا سوجے ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی داڑھی کھجلا کر رہ جاتا۔ وہ خود ناچار تھا۔ ارائیں کو تشفی دے کر واپس بھیج دیتا اور لڑکوں سے محض زبانی باز پرس کرتا...... لیکن لڑکوں کے معمول میں فرق نہ آیا۔

سپرنٹنڈنٹ پکا سکھ تھا۔ خوب لمبی لہراتی ہوئی داڑھی چھوٹی پیلے رنگ کی پگڑی پر اس کا یہ بڑا نیلے رنگ کا صافہ تنگ پائجامہ، ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ اس کا ازار بند اس سے کبھی نہیں سنبھلتا تھا۔ ہمیشہ نیچے لٹکتا رہتا۔ ہر روز بلا ناغہ گوردوارے جا کر پاٹھ کرتا — وہ لڑکوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا۔ لیکن ہوسٹل میں اس کی حیثیت بس برائے نام ہی تھی۔ بے چارے کی بیوی اور بچے ہمیشہ بیمار رہتے۔ ان کی تیمارداری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھی ہوسٹل میں آنکلتا۔ لڑکے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیکن حقیقت میں انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

جب وہ ہوسٹل میں داخل ہوتا تو عموماً باورچی خانے کا ایک نوکر اس کے ساتھ ہوتا برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رک جاتا اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجی رہتی تھیں اور آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا ہے جسے وہ ایک جھاڑن نما رومال سے گاہے بگاہے صاف کر لیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ ایک ہلکی سی جھوٹی کھانسی کھانستا تاکہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ سب سے پہلے وہ نوکر سے گفتگو شروع کرتا۔ کسی معمولی سی بات پر باز پرس ہونے لگتی۔ ''ہوں ...... کیوں بے سورا یہ پانی یہ تو نے گرایا...... ابے راستے ہی میں...... ایں؟ ...... کسی نے بھی گرایا۔ تو نے اسے صاف کیوں نہیں کر دیا جھاڑو سے......''

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آ گئے ہیں۔ عموماً سب سے پہلے

بغداد سنگھ جس کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی متانت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ ''ست سری اکال سردار جی!''

''ست سری اکال'' پھر سپرنٹنڈنٹ کا پہلا سوال یہ ہوتا — ''کیوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

بغداد سنگھ یہ بڑا ہاتھ دھپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا۔ ''ساب ٹھیک ٹھاک ہے جی۔''

سپرنٹنڈنٹ قدرے سکوت کرتا۔ اب اور لڑکے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے۔

سپرنٹنڈنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی۔ موٹا تو وہ تھا ہی۔ لیکن ورزش نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑ اور ٹانگیں ہلکی تھیں اور پیٹ خوب پھولا ہوا۔ چنانچہ جب وہ اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کولھوں پر رکھ کر کھڑا ہوتا تو اس کا پھولا ہوا پیٹ اور بھی آگے کو بڑھ جاتا۔ اور وہ کسی سپیرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کو ہنسی آ جاتی۔ سپرنٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی پر ہنس رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے ذرا بے تکلف ہو کر بناوٹی غصہ سے پوچھتا۔ ''بغداد سنگھ تم بڑے شیطان ہو گئے ہو۔''

''جی میں؟'' بغداد سنگھ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ ''واہگورو...... میں تو آپ کا داس ہوں جی۔ کہئے تو ابھی سر اتار کر رکھ دوں۔ قدموں میں۔

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے۔ کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو کر کہتا ''کس کا سر؟''

اب بغداد سنگھ نتھنے پھلا کر للکارتا...... ''اوئے اوئے...... بچو سردار جی کھڑے ہیں ورنہ ابھی تیرا مور بنا دیتا پکڑ کر۔''

اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اسی طرح باتیں کرتا ہوا سارے ہوسٹل میں لٹو کی طرح

گھوم جاتا۔ اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہ کے طور پر کہتا۔'' اچھا اب سبزی بازار سے آتی ہے نا۔''

'' جی بالکل''...... اب تو ہم روز کا حساب بھی لکھ کر رکھتے ہیں۔ دیکھیئے گا؟''

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن وہ اسی بات پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزت تو رکھ لیتے ہیں۔ وہ اسی بات پر اپنی خیر مناتا۔ حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے جانے کے بعد لدھا سنگھ پانی کے گلاس میں سے چند بوندیں آنکھوں پر ٹپکا لیتا۔ کولھوں پر ہاتھ رکھ کر تولیے سے آنکھیں پونچھتا ہوا کہتا۔'' اوہوں اوہوں ...... بغدادسنگھ! سب ٹھیک ٹھیک ہے نا؟''

میں صرف کم سن بلکہ دبلا پتلا بھی تھا۔ اس لیے وہ سب مجھے بجائے میرے اصلی نام کے بکری سنگھ کہہ کر پکارتے تھے۔ بکری سنگھ نام تو بہت برا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میں اس نام سے مانوس ہوگیا۔ اب مجھے بکری سنگھ مذاقاً شاذو نادر ہی کہا جاتا تھا۔ نہایت سنجیدہ گفتگو میں بھی سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں کمزور تھا اور وہ لوگ سرکاری سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے۔ لیکن وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانا گئو ہتیا کے برابر پاپ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی میں طیش میں آکر ان میں سے کسی کو لڑنے کے لیے للکارتا بھی تو وہ میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ میں اپنی کمزوری کے طفیل ان لوگوں میں قطعاً محفوظ تھا۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں کسی سکھ تہوار کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوئیں۔ تقریباً سبھی لڑکے بوریا بستر باندھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں محنتی لڑکا تھا۔ پہلے تو ہوسٹل ہی میں چھٹیاں گزارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلے جی نہ لگا۔ نہ وہ تر و تازہ سبزیاں نہ وہ چہل پہل۔ رات کے وقت تاریک برآمدوں میں بھتنے ناچتے دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ دو ہی دن بعد میں نے بھی اپنے

گاؤں جانے کی ٹھانی۔

گاؤں میں میری اماں، پھوپھی اور دو بڑے بھائی رہتے تھے۔ میں نے میلے کپڑوں اور چند کتابوں کی گٹھڑی باندھی اور سائیکل کے پیچھے کیریر پر رکھ کر رسّی سے باندھ دی پچیس میل کا سفر تھا۔ پمپ سولیوشن ربڑ وغیرہ ضروری سامان چمڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً کم ہوئی تو چل دیا۔

اس وقت پانچ بجے تھے۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

جب شہر سے باہر نکل آیا تو ایک کمہار کی دکان پر رکنا پڑا۔ میں شام کو جب کبھی ادھر سے گزرتا تھا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کمہار کی بیوی بہت خوب صورت تھی۔ اس کا سن اگرچہ تیس سے کم نہ تھا۔ لیکن تھی بڑی طرح دار اور پھر اس کی چہار دہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے۔ میں شرمیلا اور خاموش ضرور تھا۔ لیکن بچپن ہی سے ایک حسن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ کمہار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آجاتا تھا۔ سوہنی بھی کمہارن تھی۔ وہ لوگ اسی قسم کے قصوں کو باور نہیں کرتے۔ اور انہیں ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن میری نظروں کے سامنے یہ زہرہ جبیں لڑکی تھی۔ اس پر کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہوسکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس اور اپنے آپ ہی میں سلگنے والا تھا۔ نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم۔ مہینوال جب سوہنی کمہارن کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید ڈالی تھی۔ لیکن میں دکان تو کیا خرید کرتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لیے وہاں چلا جاتا۔ کبھی مٹی کا دیا یا ایک پیالہ یا صراحی خرید لیتا اس کی ماں پرے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے مطلوبہ برتن اٹھا اٹھا کر دکھاتی۔ اس کی ماں مجھے نابالغ سمجھ کر اس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ ادھر میں جی بھر کر اس ننھی سوہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی الھڑ ہی سی تھی۔

اسے کبھی میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ وہ سرد مہری سے میری طرف دیکھتی۔" اچھا یہ پیالہ تمہیں پسند نہیں...... کیا خرابی ہے۔ اس میں...... اچھا یہ لو......"
میں مرعوب ہو کر کہتا۔" نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں ——"
وہاں سے برتن لاکر میں ہوسٹل کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا۔ اور دل شکستگی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا۔ تو اودھم سنگھ میرا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر پکار کر کہتا۔" سنا بائی بکری سنہیا!"

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت ماں تو غالباً گرمی کے مارے مکان کے اندر گھس بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پر کپڑے کا ایک ٹکڑا ڈالے ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ گال خوب سرخ ہو رہے تھے۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے گال چومنے کی اجازت دے دے......" کیا چاہئے" اس نے پیٹھ موڑ کر کوئی برتن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی اچھی صراحی طلب کی۔ اس نے نمکین مٹی کی بنی ہوئی صراحی میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔" یہ لے جاؤ پانی ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ بس یاد کرو گے عمر بھر۔"

" عمر بھر یاد کرنے" والی بات تو اس نے محض دکانداری کے خیال سے کہہ دی تھی۔ لیکن میرا دل چھاتی کے قفس میں سے نکل کر اس کے قدموں پر نچھاور ہو جانا چاہتا تھا۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا...... کہ میں تو اسے ہر وقت یاد کیا کرتا ہوں۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکا—— میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے دانت نکال کر کہا۔" اب میں گاؤں جا رہا ہوں۔"

" پھر کب آؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مصروف ادھر اُدھر گھومنے لگی—— میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے جلدی سے دام دیئے اور پیڈل پر پاؤں رکھ کر چل کھڑا ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر اس نے یہ

بات کیوں پوچھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک سراب ہے۔ اسی لیے مجھے یہ اس قدر عزیز بھی تھا۔ دل ہی دل میں میں شاداں و فرحاں سفر پر روانہ ہوگیا۔

دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی۔ لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک کے ذرا پرے ہٹ کر جا بجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی جھالوں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اِن پُران کنوؤں کے ارد گرد قینچی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر ادھر اُدھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے۔ اور اپنی میلی کچیلی چندریوں میں سوکھے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے والی لڑکیاں کبھی کبھی اپنا کام چھوڑ کر گلہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔

ابھی میں نے چار پانچ میل ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سائیکل پنکچر ہوگئی۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ رہٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک جوہڑ کے کنارے سائیکل کو لٹا دیا۔ ٹیوب میں بہت بڑا پنکچر ہوگیا تھا۔ ڈبل پنکچر لگانے میں بیس پچیس منٹ صرف ہوگئے۔ دو میل چل کر سائیکل کی ہوا پھر نکل گئی۔ اب کے پانی بھی قریب نہیں تھا۔ چنانچہ سائیکل لڑھکاتے ہوئے آدھ میل کے قریب پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا۔ وہاں ایک سائیکل والے کی دکان بھی تھی۔ میں نے سائیکل اس کے سپرد کردی۔ میرا لگایا ہوا پنکچر اکھڑ گیا تھا۔ اسے از سرِ نو درست کیا گیا۔ اسی گڑبڑ میں سورج افق تک جا پہنچا۔ اور میں نے ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔ پنکچر لگ جانے پر میں نے سائیکل خوب تیز چلا دی۔ یہاں تک کہ راستے میں مرغیاں کڑکڑاتی اور پر پھڑپھڑاتی ہوئی ادھر اُدھر دیواروں پر جا بیٹھیں — گاؤں سے باہر نکلا تو سورج تقریباً غروب ہوچکا تھا۔ کھلی ہوا تھی۔ دھواں، گرد،

شہر کی پکّی دیواروں کی تپش وغیرہ کا نام تک نہ تھا۔ کچھ دور تک میں نے خوب زور سے سائیکل چلائی۔ یہاں تک کہ میں ہانپ گیا۔ پیاس بھی محسوس ہونے لگی۔ کھلے آسمان تلے کھیت حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ببول کے درخت جھنڈوں میں ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ کھیتوں کی پگ ڈنڈیاں قینچیوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں۔ دور افق میں کوئی شخص گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ دوڑائے چلا جارہا تھا۔ اس قدر تیزی اور روانی سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی تھکے گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہوگی۔ بس اسی تندی اور برق رفتاری سے ابد تک دوڑتا چلا جائے گا اور وہ خود اسی جوش وخروش سے رہتی دنیا تک اس پر بیٹھا رہے گا۔ بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ پرندے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے۔ آسمان کی وسعت بے کنار تھی۔ اور پرندوں کی طاقت پرواز بے انداز۔ ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اُگے ہوئے پودے ایک رخ کو سر بہ سجود ہوئے جاتے تھے۔ جیسے کوئی ازلی نغمہ سن کر وہ ایک ساتھ سر دھن رہے ہوں۔ در اصل وہ شاہد قدرت کی ایک صدا تھی جسے سن کر سوار نے منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ پرندے تیر کی سی تیزی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گئے اور کھیتوں میں پودے وجد میں آکر جھومنے لگے۔

موسم خوش گوار تھا۔ میں نے رواں رواں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب سائیکل ررک لی۔ نہانے کو جی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں کپڑے اُتار کراولو[1] میں جا گھسا۔ بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے وہ سر ہلاتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے' تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ رہٹ گیت گانے لگا۔ اور پانی اس تیزی سے باہر گر رہا تھا۔ جیسے کنوئیں میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹ گیا ہو۔ سرد پانی میرے جھلسے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسانی فرحت محسوس کی اور سنبھل کر جھال کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی ململ کی

1 کنوئیں کا چوبچہ

طرح باریک چادر میں سے آسمان، زمین، درخت پودے، کلیلیں کرتے ہوئے بچھڑے، قلابازیاں لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے۔

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کسان، جس کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے کانوں کے پیچھے چکنے پٹے نظر آرہے تھے' حقہ گڑگڑاتا ہوا ادھر آ نکلا۔ مجھے خوش دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اولو میں سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور افق کے قریب سیاہی مائل دھوئیں کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی...... چنانچہ میں اولو میں سے نکلا اور گیلے بدن پر کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

اب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی جگہ پر بھی نہیں رکوں گا۔ میں نے سائیکل پہلے سے بھی تیز چلا دی۔ پکی سڑک کا تقریباً آٹھ میل راستہ رہ گیا تھا۔ اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل اور تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ نصف منزل پر ایک گاؤں تھا جسے قلعہ کا ہن سنگھ کہتے تھے۔ خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پکے مکانات بھی تھے۔ ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزار دوں۔ لیکن پھر گھر کا خیال آیا ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں ما۔ جس پر ایک لوہے کا ڈول پڑا رہتا تھا۔ سوچا کنوئیں پر ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کئی کئی تہوں والے پراٹھے پکائے گی اور میں ہری مرچوں کی چٹنی کے ساتھ مزے لے کر لے کر کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہو تو میرے لیے گھر پہنچنا نا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے شروع کیے۔ جب میں ایک زناٹے کے ساتھ گاؤں میں سے ہو کر گزرا تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ پھولے ہوئے پیٹوں والے بچے ''اوئے اوئے'' کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے۔ اروڑیاں[1] سونگھتے ہوئے کالے اور ٹیالے کتے بھی دمیں ہلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے ہولیے۔ کتوں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے طیش

---

1. کوڑے کا کھتہ۔ کوڑی

میں آ کر حقے کی نئے کھینچ ماری۔ گاؤں سے باہر ایک مردہ بیل پر جھپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن کر ہراساں ہوگئے۔ اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑ پھڑاتے اور اچکتے ہوئے ذرا پرے ہٹ گئے۔ ادھر میں کسی فرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے بڑھا چلا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے اور ان کا شور بھی مدھم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے شیشم کے درختوں کے سلسلے شروع ہوگئے۔ ان کے نیچے گری ہوئی خشک پتیاں میری سائیکل کے پہیوں کے نیچے چرمر کرتی ہوئی گھومنے لگیں اور گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا پیچھا کرتیں اور پھر جیسے دم پھول جانے پر وہ ہنس کر ایک جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔

اب اکا تارا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اور شفاف آسمان پر زرد زرد چاند کسی تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کڑھائی کی طرح معلوم ہوتا۔

دائیں بائیں دور تک ناہموار زمین چلی گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کے سلسلے شروع ہوگئے تھے۔ یہاں پر بھیڑیوں کا بھی خطرہ تھا۔ اگر بھیڑیوں کا کوئی غول آن گھیرے تو پھر؟ میں خوف زدہ ہو کر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ غروب آفتاب کے بعد دن کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہوگئی۔ صرف چاند کی پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ شیشم کے درختوں کی وجہ سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میں اس سے پہلے صرف دو مرتبہ یہ سفر اکیلا کر چکا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہوگیا تھا— میرا خیال تھا کہ دو ڈھائی میل پر کا کوشاہ کے مقبرے کے قریب سے سڑک چھوڑ کر اپنے گاؤں کی طرف گھوم جاؤں گا۔ دل کو کچھ اطمینان ہو چلا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر تو ختم ہونے والا تھا۔

میں اندھا دھند چلا جارہا تھا کہ آگے سڑک رکی ہوئی معلوم ہوئی۔ جیسے نئے

سرے سے بنائی جا رہی ہو۔ میں نے سائیکل دھیمی کر دی۔ نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے۔ ساری سڑک اُکھڑی پڑی تھی، مجبوراً سائیکل سے اُتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ ایک نئی آفت آن پڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے کنارے پٹھان مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ انہیں ''راشے'' کہا کرتے تھے۔ یہ ''راشے'' خوب موٹے تازے اور ہیبت ناک صورت والے ہوتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ لوگ بچوں کو بوریوں میں بند کر کے کابل لے جاتے ہیں۔ اور آٹھ دس دس روپے میں بیچ ڈالتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوف زدہ بھی تھا۔ لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی میں راشوں کے چہروں کے خوف ناک خطوط، الجھے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اور میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک مجھے اول تو گاؤں میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ یا گاؤں کے قریب ہی ہونا چاہئے تھا۔ اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب پہنچ کر میں پگ ڈنڈی پر ہو لیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے مجھے سائیکل سے اُترنا پڑا۔ کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ مجھے ایک نشانی یاد تھی۔ دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا جو آج کل سنسان پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسی کا رخ کیا۔ جب پانی سے بچتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا کہ آگے پانی اور بھی زیادہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پگڈنڈی پانی ہی میں گم ہو گئی تھی۔ میں پانی سے بچتا ہوا خشکی کے راستے چلتا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازاً گاؤں کی طرف چل دیا۔ لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد بھی گاؤں کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھندلی چاندنی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گزرا کہ کہیں میں نے غلط

راستہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ کھیتوں اور درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض کھیتوں میں کوئی فصل بھی کھڑی نظر آجاتی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یوں ہی اندھا دھند چلتا گیا کہ دفعتاً مجھے دور سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی ترچھا بانکا سانڈنی سوار چلا جا رہا ہے۔ سنسان جگہ پھیکی چاندنی جھینگروں کا شور...... پہلے خیال آیا اسے آواز دے کر راستہ دریافت کر لوں۔ لیکن اس کی وضع قطع ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ سوچ میں پڑ گیا کہ نہ معلوم یہ کون ہے۔ کاش! وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل جائے۔ میں سمٹ کر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا...... اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی...... دفعتاً اس نے رخ بدلا اور بظاہر میری طرف مڑا۔ میں نے سوچا شاید وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائے گا۔ چنانچہ میں ذرا پہلو بدل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا اور قریب پہنچ کر اس نے سانڈنی روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اونٹ کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اکہرے بدن کا مضبوط سکھ تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ داڑھی چھوٹی چھوٹی اور چھدری سی بھنوئیں گھنی، ناک جیسے بطخ کی چونچ نتھنے پھولے ہوئے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مگر چمک دار تھوڑی عین بیچ میں سے دبی ہوئی کانوں میں سنہری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا کنٹھا۔

وہ تھوڑی دیر تک منہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کہو بھئی لونڈے! کون ہو تم؟''

میرا دل ڈوب گیا۔ ''جی میں گاؤں کو جا رہا ہوں۔''

''کہاں سے آ رہے ہو۔''

''شہر سے آ رہے ہو۔''

''شہر سے...... جی۔''

''کیا کرتے ہو وہاں۔''

''جی پڑھتا ہوں۔''

''کیا پڑھتے ہو؟''

میں اس سوال پر چکرایا۔ کتابیں پڑھتا ہوں جی۔

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گٹھڑی کو کلہاڑی کے دستے سے کچو کا دیتے ہوئے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''جی اس میں میلے کپڑے ہیں...... کیا جی کھول کر دکھاؤں؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''رہنے دو۔''

میری جان میں جان آئی۔ اس نے ڈاچی کی نکیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا۔ کہاں جا رہے ہو۔''

''جی اپنے گاؤں کو۔''

''کون گاؤں۔''

''جی اکال گڑھ''

''اکال گڑھ؟''

''جی''

اس نے قدرے سکوت کیا۔ پھر اپنے کلّوں کے نیچے زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ادھر آؤ۔''

میں ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب گیا۔ اُس نے کہا۔ ''سائیکل نیچے رکھ دو۔''

میں نے سائیکل زمین پر ڈال دی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا ۔'' میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔''

میں ڈرا لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے پیچھے اڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلہاڑی میں سائیکل اڑا کر اوپر کھینچ لی۔ نکیل کو جھٹکا دیا اور سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے روانہ ہوگئی۔

میں نے اس کی پسینے میں تر گردن پر نظر جمادی۔ اس کے سر کے بال اس قدر کھینچ کر بندھے ہوئے تھے کہ اس کی گدی پر بالوں کی جڑوں کا گوشت اوپر ابھر آیا تھا۔ جیسے ننھی ننھی پھنسیاں نکل آئی ہوں۔ ہوں اس نے پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔

'' تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا گاؤں کدھر کو ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب تم اپنے گاؤں ہی کو جا رہے تھے۔

'' جی میں راستہ بھول گیا تھا۔ میں پہلے شہر سے صرف دو ہی مرتبہ آیا ہوں۔ لیکن دن ہی دن میں گھر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن آج رات ہوگئی اور پھر راستہ میں پانی بھی کھڑا تھا۔ اس لیے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

اس پر اس نے اپنی بے باک آواز میں قہقہہ لگایا۔'' میاں! اگر تم رات بھر بھی اس طرح چلتے رہتے تو بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے...... تمہارے جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنسان جگہوں میں ہرگز نہیں گھومنا چاہئے۔''

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں دل ہی دل میں بہت ڈرا میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نو عمر لڑکوں کے سروں میں سے مومیائی نکال لیا کرتے ہیں۔ سر مونڈ کر چوٹی میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں اور ٹانگیں باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کے نیچے آگ جلا کر ایک کڑا ہی رکھ دیتے ہیں۔ آگ کی گرمی سے سر کی چربی پگھل جاتی ہے۔ اور مومیائی کیل کے سرے سے بوند

بوند کر کے کڑاہی میں ٹپکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سر کی ساری مومیائی نکل جاتی ہے اور لڑکا مرجاتا ہے...... سانڈنی سوار کی صورت تو ہیبت ناک ضرور تھی۔ لیکن اس کی باتوں سے کسی قسم کے خطرے کی بو نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھا۔

کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں کسی نے دن کے وقت کہانی کہی ہوگی۔ تبھی تو تم راستہ بھول گئے۔

میں سانڈنی کے کوہان سے پھسلا جاتا تھا۔ چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس کی گاڑھے کی قمیص پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ بغلوں سے ہلکی ہلکی بو آرہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے نیچے کو لٹکتے ہوئے پھندنے میرے نتھنوں اور آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سواری کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس قدر تکلیف دہ سواری تھی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ اور وہ میری تکلیف سے بے خبر اندھا دھند سانڈنی دوڑائے چلا جارہا تھا۔ وہ بڑا باتونی شخص تھا۔ اس کی بھاری بھرکم بھرپور آواز اور قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزرے جس پر بئیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔ ایک گھونسلہ تو میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے کھسوٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن گھونسلہ میری زد سے باہر رہا۔ وہ کہنے لگا۔ ''بیا بڑا سمجھ دار پرندہ ہوتا ہے وہ اپنا گھونسلہ بڑی محنت اور کاریگری سے بناتا ہے۔ دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوب صورت گھونسلہ نہیں بنا سکتا۔ تم نے بانسوں پر لٹکتے ہوئے گھونسلے نہیں دیکھے۔'' بے حد خوشنما ہوتے ہیں۔ ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوپیاں سی۔ بئیے پھدک کر کبھی اندر چلے جاتے ہیں۔ کبھی باہر آجاتے ہیں اور ایک قسم کا گھونسلہ بھی بناتے ہیں۔ یعنی ایک تو اپنے رہنے کے لیے نرم تنکوں اور پتوں سے جس میں ایک طرف کو اندر جانے کا راستہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا گھونسلہ جھولے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے۔ سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ تو بئے چہچہاتے ہوئے ان پنگھوڑے

جیسے گھونسلوں پر پنجے جمائے جھولا جھولتے ہیں۔''

مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ میں نے کہا۔'' سنا ہے بیئے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لیے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑس دیتے ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا۔'' ہاں یہ درست ہے یہ بہت ہی سیانا پرندہ ہے۔''

اس پر میں نے اسے بندر اور بیئے کی کہانی سنائی جو میں نے تیسری جماعت میں اُردو کی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس نے بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ کہانی سنی۔ اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔

اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا۔ میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آرہا تھا تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ نکل آئے۔

اس پر وہ پھر اپنے بے باک لہجے میں ہنسا۔'' نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس علاقے یں بھیڑیے بہت کم ہیں۔ تاہم کبھی کبھار دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔'' پھر اس نے بتایا کہ شیخو پورہ کے علاقہ میں آبادیوں سے پرے خونخوار بھیڑیے غول بنا کر گھوما کرتے ہیں اور وہ قد میں گدھے سے کم نہیں ہوتے......''

میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر جانکلتا ہوگا۔ تو بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کرڈالتے ہوں گے۔

اس نے یہ بڑا منہ پھیلا کر کہا۔'' ہاں...... ایک مرتبہ ایک آدمی ادھر سے جارہا تھا...... میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی......''

'' کیا وہ کوئی بڑا طاقت ور شخص تھا؟''

'' ہاں وہ بہت تگڑا آدمی تھا...... دوپہر کے وقت راستہ چلتے چلتے وہ تھک گیا تو

ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ ایک جھاڑن میں روٹی بندھی تھی۔ اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ گیا۔ پھر یکا یک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کچھ عجیب عجیب سی آوازیں سنیں۔ اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں......

میں نے اچھل کر کہا۔ ''وہ بھیڑیے ہوں گے۔ ہے نا۔''

'' ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بھیڑیے کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کے جبڑے خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ بھیڑیا بہت ہی مکار جانور ہے......''

'' پھر کیا ہوا میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

'' بس بھئی ۔ وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے دیکھا کہ اردگرد کی جھاڑیوں میں بہت سے بھیڑیئے بالشت بالشت بھر کی زبانیں نکالے چور نظروں سے اس کو گھور رہے ہیں...... اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اس کا تنا اس قدر چکنا تھا کہ اس پر پھرتی سے چڑھنا ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کرے گا۔ تو بھیڑیئے اس پر جھپٹ پڑیں گے...... لحہ بہ لحہ بھیڑیئے اس کے قریب چلے آرہے تھے۔ وہ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنے گھیرے اور تنگ کیے جارہے تھے۔ زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی، نہ کوئی لاٹھی نہ ہتھیار...... اتفاق سے قریب دوچار اینٹیں نظر پڑیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے کبھی اس جگہ اینٹوں کا چولھا بنا کر روٹی پکائی تھی...... اس نے اپنی کھدر کی موٹی چادر کو دہرا کر کے پھرتی سے وہ اینٹیں اس کے اندر رکھ کر انہیں گرہ دے دی۔ ابھی اس کے سرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھے کہ سب بھیڑیئے ایک دم اس پر پل پڑے۔ اس نے چادر میں بندھی ہوئی اینٹوں کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ جو بھیڑیا اس کے قریب آتا اینٹیں اس کی تھوتھنی پر اس قدر زور سے لگتیں کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ بھیڑیئے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے وہ بھی

بڑی پھرتی اور تندی کے ساتھ اینٹیں گھماتا رہا۔ اس طرح قریب آدھ گھنٹہ تک وہ بھیڑیوں کے حملوں کو ناکام بناتا رہا...... یہاں تک کہ وہاں چند راہگیر بھی آن پہنچے۔ انہوں نے دور ہی سے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ بھیڑیئے اس قدر شور وغل کی آوازیں سن کر بھاگ نکلے اور اس آدمی کی جان بچ گئی۔

یہ سنسنی خیز قصہ سنا کر وہ سانڈنی کو گالیاں دینے لگا۔ اور میں اپنے خیالات میں کھوگیا...... زرد چاند کی پھیکی روشنی میں دور دور تک کالے کالے درخت پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں بہت دور سے کسی کے گانے کی اڑتی ہوئی تان سنائی دینے لگی۔ سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے لپکی ہوئی چلی جارہی تھی۔ ہم ایک اونچے درخت کے قریب سے ہو کر گزرے جس پر خشک لوکیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے کلہاڑی کے دستے سے ایک لوکی کو ٹھکرا کر کہا۔" دیکھو یہ ہے تو بنی۔ بچپن میں جب ہم لوگ نہر پر نہانے جایا کرتے تھے تو بس اسی قسم کی تو بنی بغل میں لے کر اپنا مزے سے بوتل کے کاگ کی طرح تیرا کرتے تھے۔"

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھیڑیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے پھر بات چھیڑی۔ کیا بھیڑیے بڑے آدمی پر بھی حملہ کر دیتے ہیں؟"

اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھیڑیے تعداد میں زیادہ ہوں اور کوئی اکیلا وکیلا آدمی مل جائے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے ہیں...... لو میں تمہیں ایک مزے دار قصہ سناتا ہوں...... یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے...... تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے —میں اپنے ننھیال کو جارہا تھا۔ راستے میں جنگل پڑتا تھا۔ لیکن مجھے پروانہ تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاٹھی تھی جس کے نیچے لوہے کی یہ موٹی شام لگی ہوئی تھی۔ اگر اس لاٹھی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی بھیڑیئے کے سر پر پڑ جاتی تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ خیر! دوپہر کا وقت تھا۔ ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے داہنے ہاتھ کی

طرف کوئی جانور جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ کی طرف جھاڑی کے پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا ہے...... میں چوکنا ہو کر راستہ طے کرنے لگا جس جگہ جھاڑیاں ذرا کم ہوتیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دو بھیڑیے تیس تیس یا چالیس چالیس قدم کا فاصلہ دے کر چلے جا رہے ہیں۔ میں نے لٹھ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا تھا۔ کبھی وہ میرے قریب آجاتے اور کبھی پھر دور چلے جاتے۔ جب ہم گھنی جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے مجھے اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں حملہ نہ کر دیں اور جس جگہ جھاڑیاں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگتے اور ہاں...... ایک عجیب بات دیکھی...... کبھی دائیں ہاتھ والا بھیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا۔ اس طرح وہ راستہ بھر ادل بدل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا۔ لیکن ان کو مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا۔ اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے۔

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا۔ اور باتیں ایسی سنسنی پیدا کرنے والی اور مزے مزے کی کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں ہی کرتا چلا جائے ۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ۔ وہاں قصوں کی کیا کمی تھی۔ اس نے کہا۔" اب میں تمہیں اپنے پرنانا کا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں — پرنانا یعنی میرے نانا کے باپ اپنے زمانے میں بہت ہی طاقت ور شخص سمجھے جاتے تھے۔ علاقے بھر کے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے پرنانا اپنی پھوپھی سے ملنے کے لیے گئے۔ وہاں انہیں کچھ کام تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے۔ انہیں خبر ملی کہ گھر پر میرے نانا جو اس وقت بچے ہی تھے بیمار پڑ گئے ہیں۔ خبر ملتے ہی پرنانا فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلدی میں انہوں نے اپنے ہاتھ میں لاٹھی تک نہ لی۔ بیس

پچیس میل کا فاصلہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے۔ اس وقت چونکہ اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی۔ اس لیے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ جائیں۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں کے قریب سے ہو کر گذرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ جس راستے سے جارہے ہیں ادھر سے نہ جائیں بلکہ دوسرے راستے سے چلے جائیں۔ دوسرے راستے سے بہت بڑا چکر پڑتا تھا۔ اس لیے پرنانا اس راستے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس راستے پر ایک بھیڑنی نے بچے دے رکھے تھے جو شخص ادھر سے گزرتا تھا وہ اس پر حملہ کردیتی تھی۔ چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا۔ اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا۔ اس لیے انہوں نے لوگوں کے کہنے کی پروا نہ کی اور سیدھے راستے سے ہی جانے کی ٹھان لی۔ جب کوئی ایک ڈیڑھ میل آگے نکل گئے تو دیکھا کہ مین راستے کے بیچ میں ایک خشمگیں بھیڑنی بیٹھی ہے۔ وہ تھوڑا سا راستہ کاٹ کر گزرنے لگے تو اس نے ان پر حملہ کردیا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کے جبڑوں کے پچھلے حصے میں جہاں دانت نہیں ہوتے دونوں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی ادھر وہ جھنجھلائی۔ لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا۔ انہوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں جکڑ کر زور جو لگایا تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا۔ وہ بہت تڑپی اور انہوں نے ایک بڑی سی اینٹ سے اس کو جان سے مار ڈالا......''

مجھے اس قصے میں بہت مزا آیا۔ اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جارہے تھے مگر اب میں کچھ تھک گیا تھا جسم بھی دکھنے لگا تھا۔

دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چھن چھن کر نکلتی دکھائی دی۔ جب ہم اور قریب پہنچے تو باجوں اور ڈھول کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ویرانے میں یہ رونق! پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میلا لگا ہوا ہے۔ یہ بڑا میلہ سات دن تک مسلسل لگتا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور بھانت بھانت کے کھیل تماشے آتے تھے۔ میں نے دریافت کیا۔'' کیا اب میلے میں چلنا ہوگا۔''

''ہاں مجھے وہاں ایک ...... سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب ہی کیا ہے جہاں میل نہ ہو سکے...... کیا سمجھے؟''

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے رتیلے راستے پر ہو لیے۔ اس راستے کے دونوں کنارے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ان کناروں پر ببول کے اونچے اونچے درخت قطار در قطار میلے کے مقام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کالے کالے درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے گیس کے ہنڈے اور خیمے نظر آنے لگے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے توں توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی۔ حلوائیوں، بساطیوں، کمہاروں، کھلونے اور شربت فالودے والوں کی دکانیں، ایک طرف اوپر نیچے گھومنے والے پنگھوڑے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے، گھوڑے، گدھے، تانگے، ٹھیلے، بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ روشنی اور گانے بجانے کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔

میلے میں پہنچ کر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے سانڈنی کو زمین پر بٹھا دیا میں اترا تو میری ٹانگیں سن ہوگئی تھیں۔ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس لیے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا۔ ''کیوں بس تھک گئے۔''

میں کچھ جھینپ سا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''تمہیں بھوک تو لگی ہوگی خوب زور کی۔''

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر حلوائی کی سب سے بڑی دکان پر پہنچا۔ کڑا ہے آگ پر چڑھے ہوئے تھے۔ گرما گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں۔ پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں۔ مجھے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس

دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔'' بس اب تم جو جی چاہے کھاؤ خوب پیٹ بھر کر' سمجھے!''

مجھے دکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کو چل دیا۔ میں نے جو جی چاہا کھایا۔ جب کھا چکا تو حلوائی کے نوجوان لڑکے نے دام طلب کیے۔ میں بڑا گھبرایا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں خوب پھنسا۔ میں نے حلوائی سے کہہ دیا کہ میرے پاس دام نہیں ہیں۔ اس پر نوجوان حلوائی نے کہا۔ کرسی پر بیٹھے رہو۔ جب تک پیسے نہیں دو گے یہاں سے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔'' میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی دیر بعد حلوائی پھر بکواس کرنے لگا۔ ڈرا کہ کہیں دو چار چپت ہی نہ جما دے...... اتنے میں بطخ کی چونچ کی سی ناک والا میرا ساتھی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آن پہنچا۔ اسے آتا دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس وقت حلوائی کا لڑکا مجھے کھری کھری سنا رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی بڑی زور دار آواز میں اسے للکار کر کہا۔'' ابے او حرامی کے پلّے! ...... کیا کہتا ہے ہمارے چھوکرے کو......؟

پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیٹوا دبا لیا۔'' برخوردار میرا نام جستا سنگھ ہے جستا سنگھ......'' شور سن کر لڑکے کا باپ ہاتھ جوڑ کر دکان سے نیچے اُتر آیا۔ اور جستا سنگھ کے سامنے رونی صورت بنا کر کھڑا ہوگیا۔'' لالہ جانتے ہو میں کون ہوں......''

لالہ ہانپ رہا تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ جی ان داتا جانتا ہوں......''

جستا سنگھ نے اس کے جوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ گرم گرم گھی کے کڑاہے میں گرنے سے بال بال بچا......'' تو پھر اپنے اس لونڈے کو بھی بتادو۔ کہیں مجھے اس کا بھرکس نہ نکالنا پڑے...... کیوں بے سور تجھے اتنی جرأت کیوں کر ہوئی کہ تو ہمارے لڑکے پر پیسے لینے کے لیے چڑھ دوڑا......'' وہ لال

.ں آنکھیں نکالے لالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی آن موجود ہوئے۔ لالہ نے کدو سا سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' جی میں نے پیسے نہیں مانگے...... اجی مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا اس حرام زادے نے کب پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔''

جسا سنگھ نے کہا۔'' خون پی لوں گا خون...... یہاں انگریز کا راج نہیں میرا راج ہے...... کہو تو دکان برابر کردوں صبح تک۔''

اتنے میں ایک اور قد آور مسلمان نوجوان آگے بڑھا۔'' ابے جانے دے یار غلطی ہوگئی بے چارے سے ، جسا سنگھ نے گھوم کر دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں بغل گیر ہوگئے۔ شاید بہت دنوں بعد دونوں دوستوں کا ملاپ ہوا تھا۔ نووارد بھی ایک خونخوار گدھ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

حلوائی کو اتنی تنبیہ ہی کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ میلے میں گھومنے لگے۔ وہ دونوں بہت دیر تک مقدموں، پولس اور تھانے وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

میلے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ کھلے کھیت میں الغوزے بج رہے تھے۔ لوگ ایک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں بغلوں میں دبائے ان کے سہارے بیچ میں کھڑے تھے بعض لاٹھیوں پر ٹھڈیاں ٹکائے اچکے ہوئے کھڑے تھے۔ الغوزے بجانے والے کے قریب ایک گبھرو ہاتھ کان پر دھرے بڑے مزے میں پورن بھگت کا قصہ گا گا کر سنا رہا تھا۔ ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گانے والے کی ورد میں ڈوب ڈوب کر اُبھر آنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب گانے والا ایک بول کہہ کر خاموش ہو جاتا تو الغوزوں کی لہکتی ہوئی دل کش آواز دو بولوں کے درمیانی وقفہ کو اور بھی دل کش بنا دیتی۔''

ایک اور جگہ بہت بھیڑ تھی۔ خوب ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں نے ایک رنگین مزاج سرمست بوڑھے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بوڑھے کی سپید داڑھی اور لمبے لمبے پٹھے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پہلے وہ ایک لمبی سی ہانک لگا کر بڑی لے

کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا۔ لوگ قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کہ چٹکیاں بجاتا اور کبھیاں ہلاتا ہوا اچھل اچھل کر رقص کرتا تھا۔ اس کے منہ میں ایک دانت تک نہ تھا۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں پکار کر بولا۔

اوئے — نالے بابا کھیر کھا گیا۔
نالے دے گیا دوانی کھوٹی

ہو ہو

''بلّے اوئے بابیا'' ہر طرف سے تحسین اور آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اسی طرح گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے جتا سنگھ اور اس کا دوست عقابوں کی طرح آگے کو جھک جھک کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر نگاہ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اتنے میں جتا سنگھ میری طرف مخاطب ہوا۔ '' کاکا...... کیا نام ہے تمہارا......''

میں '' بکری سنگھ کہنے ہی کو تھا کہ یکا یک رُک گیا۔ ورنہ میرا خوب مذاق اڑایا جاتا۔ میں نے سنبھل کر اصلی نام بتا دیا۔

'' تم نے کبھی اونٹی کا دودھ پیا ہے...... اہا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آؤ تمہیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو۔''

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے۔ ایک جگہ بہت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر کھلے میدان میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کی کمی کی وجہ سے ان کے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے۔ ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے۔ جتا سنگھ نے اپنے سامنے دودھ دہایا۔ اور پھر تین ٹنڈیں[1] دودھ کی بھری ہوئی لایا۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی ٹنڈیں ایک

---

1. پنجابی۔ مٹی کا چھوٹا ڈول

ہی سانس میں چڑھا گیے۔ لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے مین سیر لی ٹنڈ پی نہ سکا۔ چنانچہ جستا سنگھ میری ٹنڈ کا دودھ بھی پی گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے۔ ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے ارد گرد کے دیہات سے آئی ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں۔ اگرچہ اب رونق کافی تھی۔ لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا۔ محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکی تھی۔

ایک طرف مجرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک سفید ریش بزرگ سیاہ کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے۔ دانتوں میں حقے کی نے دبی تھی ادھر اُدھر عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا چند نوجوان عورتیں ہار سنگار کرنے کے بعد پاؤں میں گھنگرو باندھ رہی تھیں۔ طبلے پر آٹا ملا جا رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد تھپ تھپ تھاپ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک طرف سارنگی نواز بیٹھے سارنگیوں کے کان مروڑ رہے تھے۔ ادھر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گز ہلتے اور ادھر ان کے بڑے بڑے پگڑوں والے سر بھی بڑی ہم آہنگی کے ساتھ حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بل کھا کھا کر سو سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سیاہ پوش پیر کی سرمگیں آنکھوں سے لے کر معمولی سے معمولی شخص کی آنکھوں تک سب ان ہی کی شیدائی تھیں۔

جستا سنگھ کے دوست نے مجرا دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جستا سنگھ کا بھی خیال تو یہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ دوست سے رخصت ہوا۔ اور ہم لوگ اپنی سانڈنی کی نکیل پکڑ کر میلے سے چل نکلے۔

جب ہم میلے سے باہر آ گئے تو سامنے پھر گھنی گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت تھے۔ ہمارے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکا دکا خیمہ نظر آ ہی جاتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جستا سنگھ رُک گیا — اس نے مجھے وہیں ٹھہرایا اور سانڈنی کی مہار میرے ہاتھ میں دے کر خود اس رتیلے راستے کے اونچے کنارے کی طرف رخ کر کے تن کے

ایک اور درخت کے قریب پہنچا۔

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ درخت کے سائے میں ایک نوجوان عورت تنے کی اوٹ میں سے باہر نکل آئی۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

مدھم روشنی میں اس عورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آئی تھی۔ البتہ جب وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگے۔

وہ ایک خوب پلی ہوئی جنگلی بلی کی مانند تھی۔ اس کے چلنے کا انداز بھی اس موٹی تازی بلی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوہے کھا لینے کے بعد خرخر کرتی ہو۔ خوب کھنچی تنی ہوئی وہ ٹھساٹھس گوشت کا تڑپتا ہوا ایک ٹکڑا تھی۔ جیسے خربوزے کی قاش یا میٹھے سنگترے کی رس بھری پھانک۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی اوڑھنی کی ماجھی[1] بُکل مار رکھی تھی جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے صحت ور گالوں پر اس قدر گوشت نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں۔ ابرو لچکتی کٹار تھے اور دانت صاف و شفاف اور آب دار اخروٹ کے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے ہنستے وقت اس کے دانتوں کی چمک بجلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سمندر کی لہروں کا سا مد و جزر پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی مچھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی۔ پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے دھیرے کر رہے تھے۔ کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ عورت کے ہونٹوں کے اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں...... کبھی شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ٹھینگا دکھانے کے

---

[1] ماجھا پنجاب کا ایک مشہور علاقہ ہے۔

انداز میں اوپر والا ہونٹ بھینچ کر نیچے کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی...... اس نے اپنی چندریا کو سنوارا تو اس کے سیاہ، گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے۔ اس کی خوش وضع گردن کی جھلک بھی لمحہ بھر کو دکھائی دی۔ اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں روپوش ہوگئی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی کبوتری کی طرح اٹھکیلیاں کر رہی تھی...... جتا سنگھ نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے نرمی سے اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے بانکپن سے ٹھمک کر سپردگی کے انداز میں اس کے قریب ہوگئی۔ اور اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کچھ کہا۔ جتا سنگھ نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا...... پھر جتا سنگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں سے روشنی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں...... اور جب جتا سنگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اور کچھ غم ناک آنکھوں سے جتا سنگھ کی طرف ٹک ٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اس کا ایک گال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا۔

ہم بدستور سابق سانڈنی پر سوار ہوگئے۔ اور سانڈنی پہلے کی طرح بے ڈھب چال سے بھاگ نکلی۔ کافی دور آجانے کے بعد میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے۔ تو جتا سنگھ نے اپنا بٹوے جیسا منہ کھول کر میری طرف دیکھا اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا۔ اس کی چھوٹی موٹی مونچھوں کے تلے اس کے کچھ بھدے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بھاری سی آواز میں بولا۔ ''کیا سوچ رہے ہو۔''

میں کچھ جھینپ سا گیا۔

سانڈنی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھائے کسی روٹھی رانی کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلی جارہی تھی۔ جتا سنگھ نے لوہے کے کڑے والا ہاتھ اٹھا کر کان پر رکھ لیا ایک لمبی ہانک

لگائی۔ اس کے منہ میں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکلی جو فضا میں پھسلتی ہوئی چلی گئی۔ اس قدر آزاد اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کی آواز میں موسیقی نہ سہی۔ لیکن ایک ایسی کشش' ایک ایسا خلوص اور کرارا پن تھا۔ جس پر سنگیت سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جاسکتی تھیں۔ لمبی ہانک کے بعد وہ گانے لگا۔

اوئے
میں مل لاں تخت لاہور وا (میں لاہور کے تخت پر جمالوں)
میں کھوہ لاں راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں چھین لوں)
اوئے۔ ہو ہو

پھر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ '' لو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں۔ بہت مزے کا گیت ہے۔ ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے ...... یعنی سمجھے نا! اس سے پوچھتی ہے۔

ہیں دے کتھے چلے او (ہاں اے حاکم کہاں چلے ہوتم۔ تم کہاں چلے ہو)
حاکماں تُسی، تُسی وے کتھے چلّے او
اب حاکم جواب دیتا۔
ہے نی دلّی چلّے آں (اری بھاگن ہم دلی چلے ہیں)
بھاگنے! اسی، اسی نی دلّی چلّے آں
اس پر بھاگن کے دل میں لڈوں پھوٹنے لگتے ہیں کہتی ہے
ہیں وے کی لیادوگے (ہاں رے بھاگن ہم دلی سے بلی لائیں گے بلی)
حاکماں! تُسی، تُسی وے کی لیادوگے

بھلا حاکم بھاگن کے لیے کچھ لانے سے کب چوک سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اسے شرارت سوجھتی ہے۔ وہ اصل تحفے کا ذکر تو کرتا نہیں بلکہ کہتا ہے۔

ہیں نی! بلّی لیاواں گے (ہاں رے بھاگن ہم دلی سے بلّی لائیں گے بلّی)

بھاگنیں! اسی، اسی نی بلّی لیاواں گے
بلّی کا نام سن کر بھاگن کا جی کٹ جاتا ہے۔ تیور بگڑ جاتے ہیں۔ پوچھتی ہے۔
بلّی کی کرجے گی
حاکماں! بلّی، بلّی دے کی کرجے گی (بلی کیا کرے گی اے حاکم! بلی کیا کرے گی)
حاکم کنکھیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے برہم ہوجانے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔
ہے نی نہوندر مارے گی۔ (ہاں ری بلی پنجے مارے گی)
بھاگنیں! بلی، بلی نہوندر مارے گی۔
بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنزاً پوچھتی ہے۔
پٹی کون بنھے گا
حاکماں! پٹی، پٹی دے کون بنھے گا۔ (پٹی کون باندھے گا۔ اے حاکم پھر پٹی کون باندھے گا)
اب حاکم کی باری تھی۔ بھاگن سمجھتی تھی کہ اب حاکم سے کوئی بات نہ بن پڑے گی۔ اب حاکم نے پہلے تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گئیں۔ جب شرم کے مارے بھاگن کے رخسار سرخ ہوگئے تو اس نے کہا۔
پٹی توں بنھیں گی
بھاگنیں پٹی، پٹی نی توں بنھیں گی (پٹی تو ہی باندھے گی بھاگن۔ پٹی تو تو ہی باندھے گی۔)

او ہو ہو ہو

''کیوں میرا گانا پسند آیا؟''
گانا تو خیر جو تھا سو تھا ہی لیکن گانے میں جو زندگی اور للکار اور اس کے انداز میں جو بے باکی سنی وہ مجھے بہت پسند آئی۔

اس نے پوچھا۔ ''تم بھی گانا جانتے ہو۔''

میں گانا نہیں جانتا تھا۔ کاش میں اسے گانا گا کر ہی سنا سکتا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ ''وہ مسلمان کون تھا؟''

وہ ہنس پڑا۔ وہ میرا جگری دوست ہے سمجھے۔ بڑے عرصے کے بعد بڑے گھر سے آیا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا۔''

''بڑا گھر کیا ہوتا ہے؟'' (پنجاب کے دیہات میں قید خانے کو طنزاً بڑا گھر کہا جاتا ہے)

'' ارے تم بڑا گھر نہیں جانتے۔ ہائے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جاسکو گے۔ صرف بڑے آدمی ہی بڑے گھر میں جاسکتے ہیں...... بس سردار بہادر! یہ سمجھ لو کہ بڑا گھر صرف انہیں لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے ہیں۔ جب وہ خدمت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو انہیں آرام کرنے کے لیے بڑے گھر میں بھیج دیا جاتا ہے وہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سرکار اور پرجا کی سیوا کے نئے نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو پھر نئے نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پرجا کی سیوا کرتے ہیں۔ پرجا سرکار سے ان کی پرزور سفارش کرتی ہے۔ سرکار جتنی زیادہ خوش ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ان سیوکوں کو بڑے گھر میں بھیج دیتی ہے۔ جو شخص جتنی زیادہ تندہی کے ساتھ خدمت کرتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ عرصہ کے لیے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔''

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچتا رہا۔ جتا سنگھ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ میرے اس دوست کا نام نورا ہے۔ اس کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گاؤں میں رات کے وقت کسی کے گھر میں گھس گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے۔ کوئی غیر معمولی آواز سنائی نہ دی۔ لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے

اندر ہم گھسے ہوئے تھے' اُسے گاؤں کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے......''

'' آپ لوگ اس گھر میں گھسے ہی کیوں تھے۔''

'' اوہو! دیکھو ننھے! ایسی باتوں میں ٹوکنا اچھا نہیں ہوتا۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے تھے۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی اور وہ سب گاؤں والوں کو کس وقت بلا لائے...... اتنے آدمیوں کا اجتماع دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے۔ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہے۔ سوچتے تھے کیوں کر صحیح و سالم باہر نکلیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہیں پڑے پڑے صبح نہ ہوجائے۔ یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولس ہی کو نہ بلا لائیں چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لاٹھیاں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ بس ہم نے لاٹھیاں چلانی شروع کردیں۔ ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس قدر جان کا ہی سے ہم نے آج تک لاٹھی نہیں گھمائی تھی۔ لوگوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ لاٹھیوں کی زد سے بچنے کے لیے وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایک بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پھر ان کا حوصلہ بڑھا۔ اور وہ لپک لپک کر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم بھی لہو لہان ہوگئے۔ ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم بھاگے تو آٹھ کوس تک بھاگتے ہی چلے گئے۔ تاکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں...... سمجھے میرا یہی دوست میرے ہمراہ تھا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پر ان تیاگ دیتا۔''

مجھے بہت تعجب ہوا '' کیا سارے گاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کرسکتا؟''

'' کہاں بھیا! ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے تو ان پاس پڑوس کے گاؤں میں سے بھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر

ہماری دال نہیں گل سکتی تھی۔"

"کیا آپ کے ماموں بہت طاقت ور شخص ہیں......"

" طاقت ور؟ — میرے ماموں اس قدر طاقت ور شخص ہیں کہ ادھر اُدھر کے لوگ انہیں "رب" کہتے ہیں۔ بڑا بھاری ڈیل ڈول ہے ان کا۔ قد میں تو خیر مجھ سے بھی کچھ کم ہی ہیں۔ لیکن ان کی للکار ہی ایسی زوردار ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ ان کا علاقے بھر میں بڑا دبدبہ ہے......"

" کیا وہ کبھی چوروں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں کبھی کوئی ڈاکو پکڑا انہوں نے؟"

" انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ تمہیں میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا بہت ہی دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت وہ گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے پھاٹک کے قریب چارپائی ڈالے سو رہے تھے۔ ان کے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے۔ اتنے میں وہاں چور آ نکلے اور انہیں گہری نیند میں مدہوش پاکر اندر گھس گئے۔ اور بیلوں کی ایک بہت عمدہ جوڑی نکال کر چل دیئے۔ ابھی وہ بیل ہانکتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے ہوں گے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ فوراً بھانپ گئے کہ چور ان کے مویشی لیے جارہے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے۔ "بھئی تم جو کوئی بھی ہو...... میری بات کان کھول کر سن لو...... تم میرے مویشی تو لیے جارہے ہو بڑی خوشی سے لے جاؤ۔ لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انہیں جہاں کہیں بھی لے جاؤ گے کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں...... اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دسوندھا سنگھ ہے۔

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک شخص بلند آواز میں بولا۔ دسوندھا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارے بیل ہیں۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوتے پڑے ہو۔ ہم نے تمہارا نام سن رکھا

ہے۔ اس لیے ہم یہ بیل اسی جگہ چھوڑے جاتے ہیں! چنانچہ انہوں نے دونوں بیل باڑے کی طرف ہانک دیئے اور خود اپنی راہ پر روانہ ہوگئے۔''

مجھے اس کی باتیں سننے میں بڑا مزا آرہا تھا۔ خاموش رات میں سانڈنی کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش رکھتی تھی میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑے زور کی پھنکار سنائی دی۔ دیکھا تو سامنے ایک اونچی سی جگہ پر ایک سانپ پھن اٹھائے لہرا رہا ہے۔ میرے جسم میں بجلی کی ایک روسی دوڑ گئی۔ جستا سنگھ نے سانڈنی روک لی۔

کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا۔ ''یہ سانپوں کا راجہ ''ناگ'' ہے۔ اُف کس قدر کالا ہے۔ اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو اسے پانی مانگنے کی مہلت نہ ملے۔

پھر اس نے مجھے سانڈنی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اُتر گیا۔ سانپ ابھی تک پھن اٹھائے لہرا رہا تھا۔ جستا سنگھ نے کندھے سے چادر اتار کر بائیں ہاتھ میں پکڑلی اور داہنے ہاتھ میں لاٹھی لے کر وہ آگے بڑھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک اصیل مرغ کی طرح چوکنا ہو رہا تھا۔ اس کی گھنی بھوؤں تلے اس کی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا لوہے کا کڑا کلائی سے پیچھے ہٹا کر بازو پر پھنسا لیا۔ سانپ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملا کر کھڑا ہوگیا۔

میں ڈر گیا۔ میں نے اُسے آواز دے کر واپس چلے آنے کے لیے کہا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا کوئی آدمی، جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔ چاند کی روشنی اب کچھ تیز ہوگئی تھی۔ ببول کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان کی شاخوں کی نازک سے نازک کونپلیں تک ساکن تھیں۔ وہ ایسے بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انہیں اس بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس سنسان مقام پر انسان

اور ناگ کا مقابلہ میرے لیے ایک نئی اور عجیب شے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ دھوکے سے جسا سنگھ کی ننگی ٹانگ پر دانت مارے گا۔ اور وہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس چلا آئے۔ لیکن وہ میری بات سنتا ہی کب تھا۔ اب وہ عورت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ورنہ میں بھاگ کر اسے ہی بلا لاتا۔ وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جسا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک چنچل بچے کی طرح ضدی اور کھلنڈرا دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ اچک کر اپنا تہبند اس کے پھن کے قریب ہلانے لگا۔ سانپ نے بھی پھن بڑھا بڑھا کر دو تین مرتبہ اُسے کاٹنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب کی تو نڈر سانپ اچھل کر چادر سے لپٹ گیا۔ جسا سنگھ نے چادر زمین پر پھینک کر اسے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کے لیے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی دیا۔ پھر وہ بھاگ نکلا جسا سنگھ بھی اچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر وہ ہموار ریتلی زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے۔ سانپ پلٹ پلٹ کر اس پر حملے کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت دور نکل گئے جسا سنگھ کی لاٹھی بار بار ہوا میں بلند ہوتی تھی۔ اور پھر دفعتاً جسا سنگھ زمین پر گر پڑا...... اٹھا اور پھر گر پڑا...... میرا دھڑکتا ہوا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہو...... جسا سنگھ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا۔''

''نہیں تو'' وہ ہنس کر بولا۔'' وہاں گیلی زمین تھی۔ میرا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھو یہ میرا کچھا بھی کیچڑ میں خراب ہوگیا...... گر کر میں اٹھنے لگا تو پھر گر گیا......''

''تو سانپ بھاگ گیا؟''

"بھئی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا میں۔ تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر بچ نکلے تو اپنے دشمن سے انتقام ضرور لیتا ہے۔ اسی لیے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو میں نے اس کا سر اچھی طرح کچل کر رکھ دیا ہے...... آؤ نیچے اُترو۔ تمہیں بھی سانپ دکھا لائیں......"

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ ہاتھ لمبا سانپ تھا۔ پیٹھ بالکل سیاہ تھی۔ پیٹ سفیدی مائل تھا۔ بل کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوف ناک دکھائی دیتا تھا کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے۔ ہم واپس آ کر سانڈنی پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے۔ مجھے ابھی تک پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ جسا سنگھ کی جسارت احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ پورے وثوق کے ساتھ نیچے اُترا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن میں رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جسا سنگھ کو کاٹ ہی کھاتا تو کیا ہوتا۔

جسا سنگھ نے سانڈنی کو للکار کر ہانکتے ہوئے کہا۔ یہ سانپ بہت ظالم ہوتا ہے۔ یہ گائے کا تھن منہ میں لے کر دودھ پی جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں جو آدمی دکھائی دے اسے کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چھوٹا سا ہوتا ہے اور ہے بہت چالاک اور مکار۔ اس کو مار ڈالنا بھی آسان نہیں۔ بس ایسے سانپ سے واہگورو ہی بچائے۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جسا سنگھ نے کہا۔" بولو یہ سامنے تمہارا ہی گاؤں ہے نا"

میں اس کی باتوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے اِدھر اُدھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا تھا

اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ جھڑ بیریوں کے بیچ میں ابھری ابھری ہوئی قبریں چاندنی رات میں اور بھی زیادہ بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے نیم کے درختوں کے تنے چماروں کا کنواں بھی نظر آ رہا تھا۔ کنوئیں کی چرخی تاریکی میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننھے ننھے چوزے پنجوں سے زمین کریدتے پھرا کرتے تھے۔ پرے چھوٹے چھوٹے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہوں۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے عین سرے پر بنے ہوئے رہٹ کے قریب جستا سنگھ نے اپنی سانڈنی بٹھا دی میری سائیکل اُتاری پھر خود اترا اور مجھے بھی اتارا۔ میری گٹھڑی میرے حوالے کر دی۔

گاؤں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ آدھی رات کے قریب گزر چکی تھی ۔ سب لوگ اپنے کچے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے۔ صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پانی پیا۔ پانی کی بوندیں اس کی مونچھوں سے نیچے کی طرف لٹک کر لرزنے لگیں۔ میں نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ گٹھڑی بھی اسی پر رکھ دی۔ جستا سنگھ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا۔ جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں۔ میں ایسے محسوس کر رہا تھا کہ آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا۔ ''کہوں اب تو گھر پہنچ جاؤ گے۔ راستہ تو نہ بھولو گے؟''

میں نے شرما کر کہا۔ ''جی نہیں' اب میں پہنچ جاؤں گا۔''

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ اس جذبے کا اظہار کیوں کر کروں۔ میں اس کشمکش ہی میں تھا کہ اس نے پگڑی کے شملے سے مونچھیں اور داڑھی

پونچھتے ہوئے کہا۔''اچھا اب تم گھر کو جاؤ میں بھی جاتا ہوں۔''

میں نے اس کی پگڑی کے شملوں کی طرف دیکھا۔ ایک کان کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا ہوا میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کاٹھ کے سے ہاتھوں میں میرا کمزور اور چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح اس قدر بڑے آدمی سے ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم واپس جانے پر تل جائے گا۔ میں نے کہا'' آیئے ہمارے گھر چلیے۔گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔''

یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اس نے انگلی سے پرے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' کیا کہتے ہو...... مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے؟...... ہو ہاہاہا''

ہنستے ہنستے اس کی ناک کی نوک سرخ ہوگئی۔

میں نے اس کی اُنگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کیا تو پھر وہ کہنے لگا۔'' آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ اس لیے تم جاؤ میں پھر کبھی آؤں گا۔تمہارا نام تو میں جانتا ہی ہوں......''

میں نے اُنگلی اٹھا کر کہا ضرور۔''

'' ضرور'' وہ ہنسنے لگا۔

اس کے بعد وہ اپنی کلہاڑی سنبھالتا ہوا سانڈنی پر سوار ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ افق میں غائب ہوگیا۔گرد کے بادل اڑتے رہ گئے۔

لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا......کبھی نہیں۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ادبی دنیا' لاہور میں جولائی 1945 میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوی مجموعہ 'تارو پود' میں شامل ہے۔

خود دار

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت ایک انجینئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد ریلیف کا کام شروع ہوا تو میں نے بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر ایک با رسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چنانچہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام بہت تسلی بخش تھا۔ جلد ہی اگزیکیٹو انجینئر بنا کر موتی ہاری بھیج دیا گیا۔

اس جگہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارا دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹوں کو چھپانے کے لیے دری بچھادی گئی تھی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ یہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت عملہ میں آٹھ کے قریب اشخاص تھے۔ چپڑاسی ان کے علاوہ۔

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کردیئے تھے۔ وہاں بے کاروں کے لیے روزی کے دروازے بھی کھول دیئے۔ کئی اشخاص کے لیے یہ

سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لے کر آیا تھا۔ جب شام کے وقت ہم لوگ سیر کے لیے باہر نکلتے تو جگہ بہ جگہ دھرتی ماتا کو نہنگ کی طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ دراڑوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح کو جب میں دفتر پہنچا۔ تو رگھوناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندہ میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام کو میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہوگئے تھے ــــ پہلے رگھوناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا ہوا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

پیش تر اس کے کہ وہ کچھ کہے چپڑاسی خبر لایا کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ میری کوٹھی کے چکّر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائیاں بھی دے گیا تھا...... میں نے اس کو بلوا لیا۔ اس پر رگھوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سنیما کے پاس لایا تھا۔ وہ شہر کا ایک متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اس قدر زیادہ چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ دھکے دے کر باہر نکلوا دوں میری بے اعتنائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دور از کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کروں......

میرا دھیان رگھوناتھ کی طرف تھا۔ رگھوناتھ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا۔ بلکہ دوسرے تو سب کے سب نوجوان تھے۔ دسویں پاس اسٹینو گرافر، نشست و برخاست میں سلیقہ مند، بات چیت میں ہوشیار، لیکن مجھ کو رگھوناتھ پر وہی بھروسا تھا۔ وہ ہمیشہ رُک رُک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اس کو دیکھ کر اتنا کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

نوکری کے لیے وہ براہِ راست مجھ کو ملنے کے لیے آیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگھوناتھ کا ملاقاتی

کارڈ لا کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت کے لیے آئے ہیں میں نے جواب بھجوا دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ایک کتاب لینے کے لیے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھ کو رگھوناتھ واپس جاتا ہوا دکھائی دیا۔ کھدر کا ایک نیل لگا ہوا پائجامہ، انگلش ٹویڈ کا ایک پرانا گرم کوٹ، سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی، گھٹنے کے قریب اس کے پائجامے میں ایک ابھار سا پیدا ہوگیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ بے چارا بوڑھا شخص ہے۔ اس کو بلا لینا چاہئے۔ چنانچہ نوکر بھیج کر میں نے اسے بلوا لیا۔

جب میں نے اس کے چہرے پر خصوصاً اس کی نیچے کو لٹکتی ہوئی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی تو مجھ کو اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد کے لیے معذرت چاہی اس نے کہا کہ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لیے آیا تھا۔ ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کارو باری نیز دفتری خط و کتابت میں اس کو کافی تجربہ حاصل تھا۔

میں نے اس کو شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا رہا۔ اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں باتوں میں میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیے۔ پہلے وہ ایک متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا بیٹا وٹرنری ڈاکٹری پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہوجانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی کیوں کہ اس کی کمائی کا بیش تر حصہ انہیں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا...... لیکن جب برے دن آتے ہیں تو آنکھ جھپکتے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ بھرا پڑا گھر بری طرح تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے کے لیے آگئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے یہ سازش

کر رکھی تھی کہ ان کے گھر کے سب افراد کو یکجا کر کے کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی' اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی، اس کی بیوہ بہن، اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ صرف بڑا لڑکا بچا تھا۔ لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کر دی۔ لیکن اس کو موت کے چنگل سے نہ بچا پاسکا...... اس کی آپ بیتی سن کر دل کو یقین نہ آتا تھا کہ قدرت اس قدر جابر بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا۔ ''رگھوناتھ جی اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کی ثابت قدمی اور حوصلہ دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں۔''

وہ اپنی چھتری سے زمین کریدنے لگا۔ '' نوازش ہے جناب کی......'' قدرے سکوت کے بعد مجھ سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے بولا۔ '' ...... لیکن میرا حافظہ کمزور ہوگیا ہے کچھ...... میں بھول جاتا ہوں کئی باتیں......''

اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا۔

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہوگیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی ۔ مجھ کو تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمہ دار شخص موجود تھا۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمہ دار شخص ہوں۔ اس لیے اس قسم کے اشخاص پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمہ دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھ کو رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دورے پر چلا جاتا۔ لیکن میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑ بڑ نہ ہوتی تھی۔

اپنی میز کے آگے بیٹھے بیٹھے میرا دل رگھوناتھ کی طرف کھنچا رہتا۔ اس کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کے کالر کو اس پر چڑھا کر اس کو چھپائے رکھتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فائل

لیے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رُک جاتا۔ مجھ کو معلوم ہوجاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے — کبھی کبھی اس کی قمیص کے بوسیدہ کف کوٹ کی بانہہ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے ہوئے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کی بانہہ کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھ کو پتہ نہ چلے لیکن میری متجسس نگاہوں سے اس کی کوئی حرکت پوشیدہ نہ رہتی تھی۔

دیوی دیال باتیں کیے جارہا تھا لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ چنانچہ جس قدر جلد ہوسکا میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک میں رگھوناتھ کا منتظر رہا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بلا پیاس چپڑاسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی کے آگے کھڑا ہوکر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہوجائے کہ میں اتنا مصروف بھی نہیں وہ چاہے تو آکر مجھ سے بات کر لے۔ اس کے بعد میں کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا...... کھانا بھی دفتر میں ہی منگوالیا۔ لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہوجانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپڑاسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے میں ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں کے قریب سے ہوکر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جارہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپڑاسی نے بتایا کہ بابو رگھوناتھ ابھی کام کر رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کاغذات پر جھک گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت آرام بھی نہیں فرمایا...... اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے......“

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا۔ ”

آپ بزرگ ہیں۔ خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے...... آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے۔ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو تو کل ہوسکتا ہے۔''

''جی بس اب چلا جاؤں گا...... آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟''

''جی ہاں میں ذرا ایک صاحب کا منتظر ہوں۔''

رگھوناتھ ادھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا...... آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہیے تو کرسیاں نکلوا دوں۔''

میں رگھوناتھ کے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا کچھ اس لیے اور کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھی پدرانہ لہجہ میں باتیں کرنے لگتا تھا۔

''نہیں رگھوناتھ جی۔ میں ذرا یہ کاغذات دیکھوں گا۔''

قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی نامکمل عمارت، فرنیچر، ٹھیکیداروں، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اور شیئر کی باتیں کرتا رہا...... بالآخر اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں ہمہ تن گوش تھا''...... اچھا...... تو...... اگر آپ اجازت دیں...... میں جاسکتا ہوں۔''

میں مایوس سا ہوگیا۔'' ضرور ضرور......'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے کھانس کر چھڑی اٹھائی۔ ٹوپی کو سر پر درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''رگھوناتھ جی!''

''جی۔'' وہ واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہوگیا۔

میں نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔'' کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ یوں ہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے ایک مبہم سی آواز نکلی۔

"کہیے نا"

"میں ...... میں ......" اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔" مجھ کو ......"

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ کوئی حرج نہیں تشریف رکھیے۔"

وہ بیٹھ گیا۔ مجھ کو منتظر پا کر وہ آہستہ سے بولا۔" میں بہت شرمسار ہوں۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔" رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کردی...... توبہ"

لاٹھی سے فرش کو بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لے کر بولا" ...... مجھ کو ایک روپیہ درکار ہے......"

"ایک روپیہ؟" میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔" شاید آپ کو یاد ہوگا۔ آپ نے مجھ سے ایک دفعہ ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین ساڑھے تین مہینے پہلے کی بات ہے......"

ایک روپیہ؟ —— وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پر غور و خوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا۔" اس دن بنک کا چپراسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا۔ آپ نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔" اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں...... لیکن کل شام مجھ کو نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آگئی۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ بھولے نہیں ہوں گے۔"

ہاں مجھ کو یاد آگیا۔ رگھوناتھ پر مجھ کو بے اعتمادی نہ تھی۔ لیکن افسوس اس امر کا

تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھولا کیوں؟ وہ روپیہ...... لیکن میرا خیال ہے میں روپیہ واپس کر دیا تھا اسی دن شام کو یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔ رگھوناتھ اس جرأت کے لیے معذرت طلب کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا تھا۔ میں نے یاد داشت کے لیے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا۔ اور اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے انگریزی میں Paid لکھ دیا تھا۔

رگھوناتھ کو میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمہ دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ ''رگھوناتھ جی میں نے وہ روپیہ......''

''میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمایئے۔ شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی...... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی...... ورنہ میں ایک روپیہ کے لیے تقاضا نہ کرتا۔''

میں خاموش ہوگیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر گری ہوئی تھیں۔ جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

''نہیں نہیں رگھوناتھ جی معمولی بات ہے۔'' یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ ''شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلب گار تو مجھ کو ہونا چاہیے۔''

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ ''آپ سے کیا چھپانا...... کل سے گھر پر روٹی نہیں پکی...... آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں...... بس یہ تھی اصل بات...... ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت ہی کیا۔ میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے...... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر مجھ کو واپس دے دیجئے گا۔''

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے آپ کو گھر کی حالت

اس لیے بتائی تھی کہ آپ ایک روپیہ کے لیے تقاضہ کرنے پر مجھ کو اوچھا اور نیچ نہ سمجھنے لگیں۔ یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔'' میں ایک با اصول اور باعزت شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کروں۔ لیکن چونکہ میں نے آج تک نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ کبھی ایک کوڑی کا قرض دار بننا منظور کیا۔ اس لیے آخری عمر میں اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا......''

میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پردہ ہٹا کر لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' افسانہ نمبر جولائی 1945 میں شایع ہوا۔ افسانوی مجموعہ 'تارو پود' میں شامل ہے۔

رنگ

آج ایک پہاڑی اور صحت افزا مقام ہے۔ لوگ تبدیل آب و ہوا کے لیے دو چار ماہ کے لیے اس جگہ چلے آتے ہیں۔ تفریح کرنے والوں میں راجا مہا راجاؤں سے لے کر متوسط طبقہ تک سبھی لوگ شامل ہوتے ہیں۔

یوں تو اس مقام کو پہاڑیوں کی ملکہ کا خطاب دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سال بھر قدرت نئے نئے روپ بھرتی ہے۔ لیکن برسات کے موسم میں یہاں طرفہ تماشا ہوتا ہے۔ خاموش اور جامد پہاڑوں کے پیچھے سے گھٹائیں امنگوں اور ترنگوں کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ بادل سڑکوں پر اڑے پھرتے ہیں۔ مکانوں کے اندر بے اجازت گھس پڑتے ہیں۔ اور پھر رم جھم رم جھم بارش ہونے لگتی ہے — اور عمارتیں جو پہلے ہی اوپر تلے کچھ اس طرح کھڑی ہوئی ہیں۔ جیسے گہری کھڈوں میں گرنے سے بال بال بچ گئی ہوں۔ پانی کے ریلے میں ایسے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جیسے چشم زدن میں بہہ کر لڑھکنیاں کھاتی ہوئی گہرائیوں میں جا رہیں گی...... لیکن وہ نہیں بہتیں...... بادل برس برس کر تھک جاتے ہیں اور آخر کار ہانپ کر چوڑی چوڑی کھڈوں میں دبک کر رہ جاتے ہیں۔ لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ بادل جو سر پر گرجتے، کڑکتے اور برستے تھے۔ اب پالتو جانوروں کی طرح مسکین صورتیں بنائے کھڈوں میں

لوٹتے نظر آتے ہیں..... اس نظارے سے دیکھنے والوں کے پندار کو تسکین سی حاصل ہوجاتی ہے۔

ایلبرٹ بازار ڈھلوان پر واقع ہے۔ لیکن بریگنزا ریستوران دور ہی سے دکھائی دینے لگتا ہے جب لوگ شام کے وقت بازار کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو ڈھلوان پر بنی ہوئی عمارتوں کی چھتوں میں بریگنزا ہوٹل کی سرخ رنگ کی چھت صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اور چھت پر لکھے ہوئے ارغوانی رنگ کے حروف زرد رنگ کے حاشیے سمیت صاف پڑھے جاتے ہیں۔

شام! ہوا نمناک، چٹانوں میں سے پانی رس رہا ہے، ادھر اُدھر پھیلی ہوئی ڈھلوانوں پر بھیگے ہوئے درخت چپ چاپ کھڑے ہیں۔ سڑک، جیسے گہری اور تاریک کھڈوں سے خوف کھا کر چھچھوندر کی طرح پہاڑ کے ساتھ بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی ہے۔ وہ لوگ جو صبح سے بارش کے ہاتھوں لاچار چار دیواری کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ اس عارضی وقفے سے فایدہ اٹھا کر ہم ہما کر گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

بریگنزا ریستوران کا ایک برآمدہ بازار کی جانب ہے۔ اور طویل و عریض برآمدہ پچھلی طرف ہے لوگ ڈائننگ ہال کی بجائے اس برآمدے میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس جگہ سے کھڈوں اور دور تک پھیلی ہوئی ابھرتی پچکتی ڈھلوانوں اور حد نگاہ تک نظر آنے والے پہاڑوں کی رنگ برنگ چوٹیوں کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔

یوں تو بریگنزا والوں کا یہ ریستوران فوجی حدود کے اندر ہے۔ اس مطلب کا سرکاری تختہ بھی ہوٹل کے دروازے کے قریب آویزاں ہے In bounds to british forces یہاں ہر قسم کے فوجی —امریکی، برطانی، چینی، ہندوستانی اور شہری بھی آتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہوٹل کے مالکان کچھ باذوق معلوم نہیں ہوتے۔ کمائی بھی معقول ہے۔ لیکن سازو سامان پرانے فیشن کا ہے۔ یہاں کی مہمان داری بری نہ سہی لیکن اتنی تسلی بخش بھی نہیں۔ البتہ دیواروں پر ہر سال ہلکا طوطیا روغن پھیر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے نقائص کے باوجود یہاں لوگ کافی تعداد میں آتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو اس قدر بھیڑ ہوجاتی ہے کہ جگہ ملنی دشوار ہوتی ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک

تو سامنے قدرتی مناظر کا لطف' دوسرے اس کا پرتگالی مالک جسے کھانا پکانے کے فن میں مہارت حاصل ہے اور جو خود ہی کھانے تیار کرتا ہے۔ مثلاً کافی ہی کو لیجئے۔ ایک انوکھی خوشبو اور لذت کے علاوہ ایک پیالہ پی لینے پر ہلکا سا سرور بھی طاری ہوجاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کافی میں افیون ملا دیتا ہے۔

بارش اگرچہ عارضی طور پر بند ہوچکی ہے۔ لیکن بادل پانی میں تر اسپنج کے ٹکڑوں کی طرح بھرے بیٹھے ہیں لوگ جلد سے جلد اپنی اپنی منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہیں— سرور انگیز قہوہ کے جو پرستار بریگنزا کے برآمدے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ خوش ہیں کیوں کہ سامنے سے ایک بہت بڑا کالے رنگ کا بادل پانی کے بوجھ سے دبا ہوا نیچے اتر رہا ہے وہ اس سیاہ تیندوے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جو کسی درخت کی شاخ پر دبک کر بیٹھا جنگل کے معصوم ہرنوں کے غول کی طرف دیکھ رہا ہو کہ موقع ملے اور جھپٹ پڑے۔

اب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ اجنبی صورت چینی جنہیں بعض ہندوستانی انگریز ہی سمجھتے ہیں بے پردا موٹے تازے کھلنڈرے امریکی اور اینٹھی ہوئی گردنوں والے ٹامی ان لوگوں کے ساتھ کالی پیلی نوجوان لڑکیاں جنھوں نے یورپین عورتوں کا سوانگ رچا رکھا ہے' یانکی اور ٹامی ان ہی کو غنیمت سمجھ کر انہیں بازوؤں میں جکڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وہ بھی میموں کی نقالی کرتی ہوئی " اوو...... اوؤ " کر کے چیخیں مارتی، بات بے بات پر قہقہے لگاتی اور گاہے گاہے ٹانگیں گھما گھما کر اپنی پنڈلیوں کا جائزہ لینے لگتی ہیں۔

ایک کونے میں ایک مدراسی ہلکے سروں میں پیانو بجا رہا ہے۔ عام طور پر کوئی شخص اس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ وہ آپ ہی آپ ہنسے جاتا ہے اور وجد میں آکر سر ہلاتا اور کمر جھٹکتا ہے۔ البتہ کچھ کرسٹان بعض اوقات کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کسی نئی دھن پر ایڑیاں فرش پر پٹخنے لگتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک' ان کے دہانوں کے پھیلاؤ، اور گہرے سانس لینے کے سبب ان کی بڑی بڑی چھاتیوں کے اتار چڑھاؤ سے عجب

وحشت انگیز نفسانیت کا اظہار ہوتا ہے۔

چند ہندوستانی مرد اور خواتین ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ مرد انگریزی بولنے پر مصر ہیں۔ ان میں سے ایک آگے کو جھک کر دوسرے سے پوچھتا ہے۔ ''مسٹر چاولہ مسٹر چاولہ! آئی وینٹ ٹوسی یو یسٹر ڈے...... بٹ یو...... آئی...... گڈ......'' مسٹر چاولہ، مسٹر چوہان کی بیوی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ ''ایم سوری...... ایم سوری...... یو سی...... آئی واز ...... آئی واز......'' پھر مسٹر چوہان موقع کی نزاکت بھانپ کر جلدی سے کہتے ہیں۔ آل رائٹ آل رائٹ...... آئی ایکسپٹ یُر...... وٹ یو کال......'' اب مسٹر چاولہ آڑے آئے۔ '' ایکسکیوز...... ایکسکیوز...... یومین...... قہ قہ قہ''— ان دونوں کی بیویاں انگریزی زبان سے واقف نہیں لیکن دونوں نے گھر پر اے بی سی پڑھنی شروع کردی ہے۔ اور دونوں اپنے شوہروں کو انگریزی میں بات چیت کرتے ہوئے رشک اور فخر سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ بلا تکلف قہقہے لگا رہی ہیں جیسے وہ سب کچھ سمجھتی ہوں۔ انگریزی سے فارغ ہو کر وہ ایک دوسرے کی بیویوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مسٹر چوہان کی بیوی گوری چٹی ہے' موٹی ہے' نرم اور گرم ہے ۔ اور مسٹر چاولہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے دوسروں کی بیویوں کی طرف متوجہ ہونے میں چنداں ہرج نہیں سمجھتے...... اور خصوصاً اس وقت مسز چوہان بھی سرنہیوڑائے سرگیں آنکھیں اٹھائے میٹھی نظروں سے مسٹر چاولہ کی طرف دیکھ رہی ہے......

باہر پہلے آہستہ آہستہ پھوار پڑنے لگتی ہے اور پھر دبیز غالیچے کی مانند ایک بادل کہیں سے آنکلتا ہے اور دوسرے بادل اس طرح پھٹ پھٹ کر پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ جیسے سپاہیوں کے بڑے لشکر میں بھیم کا گرز گھوم جائے...... وہ بادل برکٹرا ہوٹل کے سر پر آن کر نہ صرف گرجتا ہے بلکہ برستا بھی ہے......

کامریڈ ٹپ ٹپ جو گرجتے ہیں۔ لیکن برستے نہیں اور جن کی ٹھوڑی پر لینن کی تقلید میں چند بال اُگے ہوئے ہیں۔ اس وقت پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے مس اپنی

سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ ''مس اینی ڈڈیو ہیئر...... ریومر ہے کہ بریکنترا صرف گوروں کے لیے مخصوص ہو جائے گا......'' لیکن مس اینی کا دھیان دوسری طرف ہے وہ ہاتھ میں قومی جنگ کے پرچے تھامے نئے داخل ہونے والوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ پیچھے کی طرف سے اس کے سر کے بال جو گھما کر اندر کی طرف اڑس دیئے گئے ہیں۔ ایک دائرے کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔ شاید روس کی زارینہ اپنے بال اسی طرح باندھا کرتی تھی...... مس اینی کا چہرہ بیضوی' ہونٹ پتلے' آنکھیں مدھ بھری لیکن ناک کچھ لمبی ہے اس کے دبلے پتلے چہرے پر یہ ناک جچتی نہیں۔ جب کوئی نووارد برآمدے میں دکھائی دیتا ہے تو مس اینی کی کمر میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ قومی جنگ کے پرچے لے کر اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ''ول یو بائی ون؟'' نو وارد پہلے ان پرچوں کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر مس اینی کے چہرے کی طرف۔ وہ مسکرانے لگتی ہے اور...... مسکرائے چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پرچہ خرید لیتا ہے۔ جب پیسے وصول ہو جانے پر وہ فوراً آنکھیں پھیر کر چلی جاتی ہے تو اسے مجبوراً ایسی قومی جنگ کے حالات پڑھنے پڑتے ہیں۔ جیسی کہ پہلے زمانے میں دیوتاؤں اور راکششوں کے مابین ہوئی تھی...... انسانیت کا بول بالا درندوں کا اور حیوانوں کا منہ کالا......

کالے بادلوں کے ٹکڑے اچک اچک کر دامن کوہ کی طرف اترنے لگتے ہیں۔ جیسے زلزلہ آ جانے پر پہاڑ سے چٹانیں لڑھکنے لگتیں۔ سیاہ بادلوں کے ہٹ جانے کے بعد کتھئی رنگ کا ایک بہت بڑا بادل جھومتا اور لڑکھڑاتا ہوا دھم سے پہاڑ کی چوٹیوں پر آن گرتا ہے۔ دوسری جانب سے سرخ و سبز رنگ کا حسین بادل لچکتا اور ہراساں آگے بڑھتا ہے۔ جیسے مہادیو اور پاربتی نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر رقص شروع کر دیا ہو۔ بادل گرج رہے ہیں۔ یا گنیش جی جوش میں آ کر مردنگ بجانے لگے ہیں۔ ان رقص کرتے ہوئے بادلوں میں سے نیلے پیلے، چمپئی اور ارغوانی رنگ اپنی جھلک دکھا کر ایسے غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہوائیاں آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی ستاروں میں گم ہو رہی ہوں......

ستاروں کی طرح جھلملانے والی سفید سفید بندیوں والا پردہ ہلتا ہے اور ایک یورپین جوڑا اندر داخل ہوتا ہے۔ دونوں نوجوان اور حسین ہیں۔ عورت نے مرد کی بغل میں ہاتھ دے رکھا ہے اور مرد نے اس کا نازک ہاتھ اپنے سینے پر دل والے مقام پر...... اپنے ہاتھ سے نہایت ملائمت کے ساتھ چھپا رکھا ہے۔ عورت نے آتے ہی...... نمدار بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا...... اپنے نچلے ہونٹ پر زبان پھیری تو ہونٹ شبنم میں بھیگی ہوئی پنکھڑی کی طرح تر و تازہ نظر آنے لگا۔ وہ ایک میز کے قریب بیٹھنے ہی کو ہے کہ اس کی نظر سامنے والے کرسٹابن پر پڑتی ہے جو منہ کھولے مستانہ وار پیانو کی لے کے ساتھ ساتھ زمین پر پاؤں پٹخ رہا ہے۔ سیاہی مائل گندم گوں چہرہ پالش شدہ بوٹ کی طرح چمک رہا ہے...... انگریز عورت برآمدے کے پرلے سرے پر جا پہنچتی ہے۔ اور ایک میز کے قریب جاکر رک جاتی ہے۔ مرد ہاتھ بڑھا کر اس کی زرد رنگ کی برساتی اتار دیتا ہے۔ اس کی مکھن کی طرح سپید اور ملائم گردن پر سبز رنگ کے موٹے موٹے موتی جھلملانے لگتے ہیں۔ مرد اب بھی اس کا ہاتھ بڑے عاشقانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے۔ وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔ عورت کی آنکھیں شگفتہ نیلے رنگ کی ہیں...... جیسے کہ سامنے تھوڑی سی جگہ سے بادل ہٹ جانے پر اجلے نیلے رنگ کا آسمان! لیکن آسمان کا وہ حصہ زیادہ دیر تک ننگا نہیں رہتا۔ دو گھڑی بعد وہ بادل جو کچھ دیر پہلے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے دم سادھے بے حس و حرکت معلق ہوں۔ دفعتاً آگے بڑھتے ہیں اور آسمان کے اس ٹکڑے کو چھپا لیتے ہیں۔ صابن کے رنگین بلبلوں کی طرح چند بادل گہرے رنگ والے بادلوں میں گم ہوجاتے ہیں جیسے رنگین سنگریزے سطح آب سے ڈوب کر نیچے تہہ تک بیٹھتے چلے جائیں۔ دفعتاً مشرق کی جانب سے نور کا سیلاب سا بڑھتا ہے۔ لیکن گہرے رنگ کے بادل اس نور پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں۔ فیروزی چمپئی، بادامی، طوطیا اور نارنجی رنگ کے بادلوں کے ننھے ننھے لکے چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ مچھلیوں کی مانند سبک رفتاری سے تیرتے

ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یا وہ کمسن رقاصہ لڑکیاں ہیں کہ کولھے مٹکاتی، گردنیں ہلاتی، ہاتھ جھٹکاتی، شاداں و فرحاں و رقصاں چلی جارہی ہیں...... لیکن نسواری بادلوں کا رنگ اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔ چناں چہ نووارد فوجی سکھ کی پگڑی یوں دکھائی دیتی ہے۔ جیسے ان بادلوں کا کوئی ٹکڑا علاحدہ ہو کر اس کے سر پر آن رہا ہو۔ اس کی پگڑی کے بیچوں بیچ تانبے کا گول سا سرکاری تمغہ آویزاں ہے۔ بیچ میں شاہی تاج ہے۔ اس کے ایک طرف ایک گھوڑا اگلے پاؤں تاج پر ٹکائے کھڑا ہے۔ اور دوسری جانب ایک شیر ببر...... اس فوجی کی تنی ہوئی مونچھیں اوپر کی طرف گھوم کر اسی تمغے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ مونچھوں کے نیچے کٹی ہوئی داڑھی کے اوپر اس کے ترشے ہوئے ہونٹ صاف نظر آرہے ہیں۔ گھنی بھنوؤں تلے اس کی دونوں آنکھیں ایسے دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے دو بٹن۔ دو لکڑی کی طرح بے حس اور اینٹھا ہوا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے جو میز پہلے نظر آتی ہے۔ وہ اسی کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ مہکی ہوئی ہوا میں مترنم قہقہوں کا لوچ ہے۔ آنکھوں کے آگے دل آویز بھڑکیلے ملبوسات ناچتے نظر آتے ہیں۔ وہ جیب میں سے رومال نکال کر اپنے ہونٹوں کو جن پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ خوب رگڑ رگڑ کر پونچھتا ہے پھر وہ ادھر اُدھر دیکھ کر آواز دیتا ہے۔ ''بادئے'' بوائے ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہے اور جی بھر کر کالا ہے اور اس کے سفید سفید دیدے خوب چمک رہے ہیں۔ اس کی کمر قدرے جھکی ہوئی ہے اور پھاوڑے کی مانند اس کی بڑی بڑی مونچھیں نیچے گری ہوئی ہیں جن میں سے اس کے ہونٹ دکھائی نہیں دیتے...... وہ بوائے ہے بوائے آواز سنتا ہے اور سیدھا انگریز جوڑے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس جگہ وہ بار بار اپنے سر کو خم دیتا ہے۔ جب لوٹتا ہے تو فوجی سکھ پھر آواز دیتا ہے۔ ''باوئے!'' — بوائے آواز سنتا ہے اور لپکتا ہوا سیدھا ہوٹل کے اندر چلا جاتا ہے...... ایک سترہ اٹھارہ برس کا ہندوستانی لڑکا الگ تھلگ کرسی پر بیٹھا کافی پی رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کی پشت کی جلد خوب تنی ہوئی اور چکنی ہے۔ ابھی اس کی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ اس کے چہرے کا رنگ نکھرا ہوا سرخی مائل گندمی ہے۔ اس

کی مدھ بھری آنکھوں میں نہایت دل فریب سرمئی رنگ کا ہلکا غبار سا پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ بالکل ان بادلوں کی طرح جن کی طرف وہ خواب ناک نظروں سے دیکھ رہا ہے اور جو اس وقت پانی کے ایک بڑے ریلے کی طرح ہوٹل کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ کھڑکیاں بند کردی جاتی ہیں۔ اور ان کے صاف و شفاف بڑے بڑے شیشوں میں سے وہ بادل اور بھی ہلکے ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور پھر ان کے آوارہ ہلکے پھلکے رنگ غبار بن کر اڑتے ہیں اور گھل مل کر قوس قزح کے ساتھ رنگوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس کمان کے دونوں سرے دامن کوہ میں پھیلے ہوئے بادلوں میں کھوجاتے ہیں۔ ان بادلوں سے بھی نیچے...... بہت پرے...... کالے کوسوں دور...... گہرے سبز رنگ کی ایک جھیل ہے جس میں سے یہ کمان اوپر کو اٹھتی ہے۔ اس جھیل کے کنارے پر کھڑے ہوئے رنگ محل میں سے مہکی ہوئی پنکھڑیوں کی مانند جل پریاں نکلتی ہیں اور ہچکورے لیتے ہوئے پانی میں اتر جاتی ہیں۔ وہ سبک رفتاری سے تیرتی ہوئی سات رنگوں والے ستون کے گرد اگرد چکر کاٹنے لگتی ہیں اور اپنے مدھ بھرے گلے سے میٹھے گیت گاتی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے بہہ کر آئے ہوئے سرسبز پتے بھی رقص کرتے ہوئے اسی رو میں تیزی کے ساتھ گھومنے لگتے ہیں۔ سنہری خواب ناک روشنی میں ان کنواریوں کی اچھوتی، چکنی اور اُجلی چھاتیاں نصف پانی کے اندر ڈوبی ہوئی اور نصف بلبلوں کی طرح سطح آب سے باہر...... نسیم سبک رفتار کے مس سے لرزتی ہوئی......

اور پھر یکایک مدراسی موسیقار پیانو پر ایک تیز پلٹا لیتا ہے — اور آن کی آن میں پانچ چھ جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اٹھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے سینے سے سینہ ملائے ایک گرداب رنگ میں کھوجاتے ہیں—

یہ افسانہ پہلی بار 'ادبی دنیا' لاہور، نومبر 1945 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ ''سنہرا دیس'' میں شامل ہے۔

سمجھوتہ

وہ مجھے نئے مکان میں چھوڑ کر دفتر کو چل دیئے۔

سامان ابھی بکھرا ہوا ہی تھا۔ میں ایک کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ سوچا ذرا ستا لوں تو کپڑے بدل کر سامان ٹھکانے سے رکھوں۔

عجب سنسان مکان تھا۔ شہر کی یہ ایک نئی آبادی تھی۔ مکانات کی تعداد نہ صرف کم تھی، بلکہ جو تھے وہ بھی دور دور۔ مجھے تو اُن کے دوست کے ہاں اور زیادہ ٹھہرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مکان کا مسئلہ بھی آج کل ایک معمے سے کم نہیں، انہوں نے کوچہ کوچہ کی خاک چھانی، ہر واقف کار سے کہا۔ ہزار مصیبتوں کے بعد یہ مکان ملا۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری کوارٹرز میں سے کوئی نہ کوئی کوارٹر مل ہی جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی کوارٹر خالی تھا نہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ رہائش کے لیے جگہ ملنے میں اتنی دشواری ہوگی تو وہ مجھے ہمراہ ہرگز نہ لاتے۔

مرد آپس میں گذارہ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن عورتوں کا نباہ ممکن نہیں جس کے ہاں ہم اتنے دنوں تک ٹھہرے رہے وہ دراصل ان کا دوست نہ تھا۔ بس یہی کہ وہ دفتر میں ان کے نیچے کام کرتا تھا۔ بے چارے کی تنخواہ کم، اور ہماری حیثیت بھی افسرانہ سی تھی، ہماری وجہ سے ان کو تکلف بھی کرنا پڑتا تھا۔ اپنے گھروں میں تو ہر کوئی گذارہ کر ہی لیتا

ہے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ گھر کے کام میں میزبان عورت کا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن وہ بے چاری مجھ کو ایسا کرنے کی اجازت کیوں دیتی، ایک تو میں اس کے شوہر کے افسر کی بیوی' دوسرے نئی نویلی دلہن، پھر پڑھی لکھی بھی۔ ادھر میں حساس ان سب باتوں کو سوچتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ ان کے دل کا حال پر ماتما جانے۔

ادھر وہ بھی پریشان، ابھی نو عمر ہی تو ہیں۔ نئی نویلی پیاری پیاری بیوی سے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی کھل کر بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مردانے میں بیٹھے گپ ہانک رہے ہیں۔ کبھی تاش کھیلتے ہیں۔ کبھی شطرنج۔ مگر دل میں بیوی کا تصور، سو سو بہانوں سے آتے ہیں۔ دبی زبان سے کچھ پوچھتے ہیں۔ میں شرماتی ہوں۔ آخر دوسروں کے سامنے شرمانا ہی پڑتا ہے۔ ہوں ہاں کر کے ٹالتی ہوں کبھی کبھی غصہ آنے لگتا ہے۔ کیوں بار بار بے مطلب کی بات پوچھنے یا کہنے کے لیے آجاتے ہیں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کریں بھی کیا۔ ہمارے میزبان بھی حالات سے غافل نہ ہوں گے۔ لیکن ناچار تھے ۔ جگہ تنگ اور کنبہ بڑا۔

اب جو نئے مکان میں آئے تو دفتر جانے سے پہلے مجھ کو گلے سے لگایا اور میرا منہ چوما......'

میں چونکی آخر اب یہ نئے خیالات کیا سوجھنے لگے۔ ہاتھ اٹھا کر لمبی سی جماہی لی۔ پھر اُٹھی، کمروں کا جائزہ لینے کے بعد سوچنے لگی کہ اب ان کی تقسیم کیوں کر ہو دو بڑے کمرے تھے۔ ایک چھوٹا، ایک غسل خانہ ایک کچن، اور پائخانہ سامنے کی چھت پر' سامنے کا حصہ مالک مکان کا تھا۔ مگر تسلی بخش بات یہ تھی کہ مالک نے اس حصہ کو گودام بنا رکھا تھا۔ ورنہ جس مکان میں مالک خود بھی رہے وہاں مجھ کو رہنا پسند نہیں کیوں کہ اس طرح ضرور جھگڑے کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔

کمروں کی بابت تو میں نے یہی طے کیا کہ ایک بڑا کمرہ تو ان کے لیے مخصوص ہوگا۔ دوسرے میں سامان اور ہمارے پلنگ، چھوٹا کمرہ گودام کا کام دے گا۔ چلو چھٹی ہوئی، دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ لیکن مکان ملتے کہاں تھے۔

شام کے پانچ بجے اسٹوو پر پانی ابل رہا تھا، سوچتی تھی وہ آئیں تو چائے ڈالوں۔

ان کو دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ گئی۔ ایک بات سے میں بہت خوش تھی۔ وہ یہ کہ جگہ اگرچہ محدود تھی لیکن تھی ہوا دار۔ ایک تو دوسری منزل پر، دوسرے شہر سے بالکل باہر۔ پرے کھیتوں کی ہریالی تک نظر آتی تھی۔ سوچا وہ آئیں تو کھیتوں کی ہوا کھانے چلیں۔ سامنے لکڑیوں اور کوئلے کی ٹال تھی۔ دوچار کاشمیری کلہاڑیاں لیے گھوم رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی دھوبیوں کے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ بائیں ہاتھ بڑا میدان سا تھا۔ پھر مکانوں کے سلسلے۔ سب سے نزدیکی مکان ہمارے پچھواڑے تھا۔ اس مکان کے مکین ہی ہمارے پڑوسی تھے۔ انہیں سے کچھ بات چیت ہوسکتی تھی۔ حالانکہ میں زیادہ جھک جھک پسند نہیں کرتی۔ عام ہندوستانی عورتوں کی صحبت مجھے راس نہیں آتی۔ لیکن کیا کیا جائے آخر ہماری بہنیں ہی تو ہیں، اور پھر انسان کہاں تک چُپ سادھے رکھے، کتابیں پڑھے تو کہاں تک' سینا پرونا کرے تو کب تک آخر دو باتیں کرنے کو جی چاہنے ہی لگتا ہے۔

''کوئی بڑا کنبہ ہوگا'' میں نے پڑوسیوں کے مکان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ تقریباً آدھا حصہ ادھر سے نظر آتا تھا۔ اور باقی آدھا ہمارے مکان کے عین پچھواڑے تھا۔ اور ہماری اپنی چھت کو سیڑھی تک نہ تھی۔ ورنہ دوسرا حصہ بھی دیکھا جاسکتا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ دروازوں کے آگے چھتیں پڑی تھیں۔ تیسری منزل پر دو کمرے نظر آرہے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ لکڑی کے چوڑے چوڑے تختوں والی سیڑھی سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پر چلی گئی تھی۔ نیچے کا صحن بڑا وسیع تھا۔ صحن میں ہماری طرف کو ایک دستی نل بھی لگا ہوا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ گھر میں نہیں تھے، کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔

میں پھر ان کو دیکھنے کے لیے گلی کی طرف کو جھک گئی۔ ابھی تک نہ لوٹے تھے غصہ آنے لگا۔ پانچ سے اوپر وقت ہوگیا۔ آخر ان کو اتنا بھی خیال نہیں کہ گھر میں اکیلی گھبراتی ہوگی۔ کچھ خاص کام پڑگیا ہوگا۔ ورنہ وہ بے چارے تو پر لگا کر مجھ تک پہنچ

جاتے۔

میں اس وقت سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ ہوا خوش گوار تھی۔ میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لینے لگی جیسے کہ ہمارے اسکول میں ہم کو سکھایا گیا تھا۔ اتنے میں مجھے احساس ہوا کہ کوئی شخص میری طرف دیکھ رہا ہے نظر اٹھائی ہمارے ساتھ والے مکان کے وسیع صحن میں ایک سکھ صاحب زادے کھڑے تھے۔ نظریں ملتے ہی انہوں نے احترام سے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا۔ میں بوکھلا کر بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری اور ادھر سے بڑے زور سے ہو ہو کی آوازیں آئیں۔ اور منہ سے بلّیوں کے لڑنے کی سی آوازیں نکالی گئیں۔

مارے شرم کے فرش پر گڑی جارہی تھی۔ آخر میں کیسی بے شرم دکھائی دیتی ہوں گی۔ بال کھلے ہوئے۔ دوپٹہ نیچے لٹکتا ہوا، اور میں سینہ پھلا پھلا کر گہرے سانس لے رہی تھی۔ پھر ہاتھ سے اپنے پیٹ کو دبا دبا کر اس بات کا جائزہ بھی لے رہی تھی کہ پیٹ کتنا دب رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں کی، بلکہ میں اپنا ہاتھ چھاتیوں کے اوپر سے پیٹ تک پھیرتی جارہی تھی، اور دل ہی دل میں اپنے پھیپھڑوں کے پھلاؤ پر اپنے آپ کو مبارک باد بھی دیتی جارہی تھی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ کوئی شخص مجھے اس حالت میں دیکھتا ہوگا۔

اتنے میں سب سے اوپر والے کمرے کی چھت پر سے کوئی پکار کر بولا۔

"لو بھئی مبارک، پورے پانچ مہینوں کے بعد ہمارا پڑوس آباد ہوا۔"

پھر نیچے کے بڑے صحن سے جواب میں کسی کی تیز سی آواز سنائی دی۔

"خدا کرے ہمیشہ آباد رہے۔ کنواروں کی بھی خدا نے سنی۔"

"کچھ نہ پوچھو غضب ہے غضب۔"

— اور میں دم بخود۔

دوسرے دن ان کے دفتر چلے جانے کے بعد، میں گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر، موزے لے کر بیٹھ گئی۔ برآمدے میں ٹھنڈک تھی۔ سوچا دھوپ میں ہو بیٹھوں پھر خیال آیا کہ اگر دھوپ میں بیٹھی تو ممکن ہے پڑوس سے پھر کچھ داد ملنے لگے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے پڑوسیوں کے مکان پر نظر ڈالی وہاں کوئی نہ تھا۔ اس بات کا تو کل ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہاں بے گھر بار والے ہی رہتے ہیں۔ سوچا ممکن ہے اپنے اپنے کام پر گئے ہوں گے۔ چار بجے سے پہلے تو واپس نہ آتے ہوں گے۔

میں نے صحن کی بجائے چوڑی دیوار پر بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہاں دھوپ سامنے کی تھی۔ احتیاط سے دیوار پر چڑھ گئی اور۔ آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں سے دیوار اُوپر کو اٹھ گئی تھی۔ میں مونڈھے پر بڑی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے بلندی اس قدر زیادہ تھی کہ نیچے دیکھنے سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ میں چست و چالاک لڑکی تھی کوئی بھدّی موٹی عورت تو تھی نہیں۔ یہاں بیٹھ کر میں ایسے محسوس کرتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھی ہوں پہلے تو ادھر اُدھر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر پاؤں شلوار کے پائنچوں سے ڈھک کر میں نے ٹوکری میں سے بجائے موزوں کے کتاب نکالی۔ اور پڑھنے لگی۔

کھانسنے کی آواز آئی۔

چونکی۔ دیکھا کونے کے سب سے اوپر والے کمرے میں ایک صاحب نکلے اور بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑے ہوگئے۔ آپ کی داڑھی بے ترتیب تھی۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے، موٹے بھدّے سے۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ ہاتھوں کے اشارے سے سطحِ زمین اور میرے درمیان کے فاصلہ کو ناپا، پھر ابروؤں کے اشارے سے اس خطرناک حرکت کا سبب پوچھا، پھر ہاتھوں کو جھٹکا کر اور شانوں کو حرکت دے کر تعجب کا اظہار کیا۔ اور قدرے توقف کے بعد غائب ہوگئے۔

میں نے چھوٹا سا گھونگٹ نکالا اور منہ پھیر کر پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اتنے

میں آپ ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا لیے نمودار ہوئے۔ اپنے صحن کی دیوار پر اسے رکھ دیا۔ پھر نچلے بڑے صحن سے اوپر تک کے فاصلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ ایک موٹی سی کتاب نکال کر گھٹنوں پر رکھ لی۔ اور بڑے انہاک سے پڑھنے لگے۔

میں نے بظاہر ان کی حرکتوں پر کچھ دھیان نہ دیا۔

''ارے مر جائے گا بھئی مر جائے گا۔'' کہیں سے آواز آئی۔

''مرنے دو ہمیں، جیتے رہے تو کیا مل جائے گا۔ کسی کی نظر میں سما جائیں گے کیا۔''

میں بڑی زچ ہوئی۔ یک نہ شد دو شد۔ خیر اسی میں سمجھی کہ کھسک جاؤں۔ بوریا بستر سنبھال کر گھسٹتی گھسٹتی اپنے صحن تک آئی — ''ارے پکڑنا بھئی پکڑنا۔''

میں دھڑام سے چھلانگ لگا کر کمرے کے اندر..........

دو تین آدمیوں کے نعرے۔ ''کیا بات ہے، بھئی کیا بات ہے۔'' ارے جو بات ہے خدا کی قسم لاجواب ہے۔

اس کے بعد بے پناہ شور و غوغا۔ وہی منہ سے بلّیوں کے لڑنے کی سی آوازیں۔

یہ تھے ہمارے پڑوسی، سب کے سب سکھ تھے اندازے سے معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ تر طالب علم تھے۔ یا کلرک۔ صبح و شام دھما چوکڑی مچی رہتی۔ دن کے وقت ذرا امن رہتا۔ شام کے وقت پھر وہی ہنگامہ۔

برائے نام ہی سہی۔ لیکن صبح کے وقت تھوڑا بہت پاٹھ کرنا میرا معمول تھا۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہا۔ ادھر صبح کے آثار نمودار ہوئے ادھر پڑوسیوں میں سے کسی ایک نے موٹی سی گالی سے اعلانِ صبح کر دیا۔ پھر عجیب عجیب آوازیں، بھانت بھانت کے لہجے۔ گندے گندے لطیفے، پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ دہرائے جاتے۔ اور وہ بھی اس

شان سے کہ بولنے والا سب سے اوپر والی چھت پر، اور سننے والے نیچے کے صحن میں کھڑے ہائے وائے کے نعرے لگا رہے ہیں۔

پھر داتن کرتے، زور زور سے کھانستے، ہنستے۔'' ہی ہی۔ ہاؤ ہاؤ۔ قہ قہ قہ، کھ کھ کھ کھ......'' اتنی قسم کی اس قدر بے ہودہ ہنسیاں میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ بدن پر مالش کی جاتی، ڈنڈ پیلے جاتے بیٹھکیں لگائی جاتیں، اگر کہیں میری جھلک دیکھ پاتے تو پھر جوش میں اُلٹی سیدھی قلابازیاں کھانے لگتے۔ سیٹیاں بجاتے، چیختے اور آوازے کستے۔

کوئی خوانچے والا، سبزی فروش، یا اخبار والا ایسا نہ گذرتا جس کی آواز کی وہ نقل نہ اُتارتے ہوں۔ اس کھلے میدان میں اگر کوئی مرد پیشاب کرنے بیٹھ جاتا، تو اس پر ڈھیلے پھینکتے، اور گالیاں دیتے۔'' ارے شرم کرو، یہاں عورتیں بھی رہتی ہیں۔''

جیسے خود تو عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

شام کے وقت دوسری مجلس بیٹھتی، ایک دوسرے پر فقرے چست کیے جاتے بے ہودہ گانے گائے جاتے۔

پھر بغلیں بجاتے دس عاشقوں کے کارنامے معشوقہ کی زبانی سنائے جاتے اور دسویں عاشق کی کارستانی پر'' ہو ہو'' کا شور مچاتے، بے ڈھنگے طریقے پر ناچتے، آنکھیں مٹکاتے ایسے موقعوں پر ان کے سر کے بال بکھر جاتے، داڑھیاں بے ترتیب ہوجاتیں، گال دہکنے لگتے اور وہ پسینے میں تر ہوجاتے — تب کوئی نہ کوئی گالی کی ایک پھلجھڑی چھوڑتا۔ اور اس کے بعد بے ہودگی کی انتہا ہوجاتی۔

ایک چھوٹے سے دریچہ میں سے ان کے صحن کا آدھا حصہ بھی نظر آتا تھا۔ اب میں ان کی صورتیں بھی پہچاننے لگی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے نام بھی دھر رکھے تھے۔ ایک تو وہ موٹے، کدّو سے حضرت جو میرے مقابل دیوار پر بیٹھتے تھے۔ داڑھی قینچی سے کتری ہوئی، مونچھیں کبھی ڈھیلی کبھی تنی ہوئی۔ چہرہ گول، آنکھیں چھوٹی۔ سر کے

بال عموماً شانوں پر گرے رہتے، ان میں چکنائی نام کو بھی نہ ہوتی، معلوم ہوتا تھا کہ نہ کبھی بال دھوتے ہیں' نہ تیل لگاتے اور نہ کنگھی کرتے ہیں۔ گردن موٹی اور اس کی لمبائی نہ ہونے کے برابر' جب ہنستے تو کمرو دیوار ہل جاتے۔ کئی قسم کی ہنسیاں ہنسنے میں ماہر تھے، آواز بڑی کرخت، بد زبانی، بے ہودگی، گپ بازی میں سب کے سردار، عموماً بھینسا کہہ کر ان کو چڑایا جاتا تھا۔ کافی بے شرم تھے۔ لیکن زیادہ چڑانے پر چڑ بھی جاتے، کبھی میں اُن کے سامنے آجاؤں تو بڑی بے تکلفی سے رازدارانہ لہجے میں پوچھتے۔ '' صبح سے درشن نہیں ہوئے تھے...... ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا آج۔''

ان کے بالمقابل ایک صاحب تھے لمبے تڑنگے، دُبلے پتلے، صورت سے یرقان کے مریض آواز باریک، چھدری داڑھی، سر پر چھوٹا سا جوڑا اور اس کے بیچوں بیچ سے بالوں کا ایک گچھا اُوپر کو ہوا میں لہراتا ہوا، ان کو ''ککڑ'' یعنی مرغ کہا جاتا تھا۔ ہر آنے جانے والے پر رعب ڈالتے، آوازے کستے، لیکن بک بک پر اتر آئیں تو شیطان پناہ مانگے، جسم کی بناوٹ خوب صورت تھی۔ یعنی '' بھینسے'' کی طرح بے ڈول نہ تھے۔ مجھ کو دیکھ پاتے تو منہ سے کچھ نہ کہتے، آنکھیں مٹکاتے، پہلے سر ہلاتے، پھر شانے، تب کمر اور کولھے اس شدت سے ہلاتے کہ شاید نازک سے نازک لڑکی بھی نہ ہلا سکے اور پھر کمر اور کولھوں کی لرزش ٹانگوں پر سے ہوتی ہوئی پاؤں میں غائب ہوجاتی۔ کلاسیکل ناچ کی دھجیاں اُڑاتے، اس وقت عموماً ''بھینسا'' ستار بجاتے۔ ستار بھی ایسی کہ اس کے تین چار تار ٹوٹ کر ہمیشہ نیچے لٹکتے ہوئے تھے۔

ایک گورا بلّی کی سی آنکھوں والا لڑکا بھی تھا۔ اس کے بال سنہری تھے، داڑھی کے بال بڑے باریک اور غالباً ملائم، اس کا قد بھی ''انکارِ محبوب'' کی مانند مختصر، اس کا ایک دانت سونے کا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ملائم سی ہنسی ہنستا رہتا، اپنی دونوں کہنیاں دیوار پر رکھے ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ مجھ کو دیکھا کرتا، دیر تک میری طرف دیکھتا رہتا۔ اور کبھی کبھی بڑے اہتمام کے ساتھ ایک آنکھ بند کر کے آہ بھرتا اور پھر برش ہاتھ میں لے

کر آہستہ آہستہ تصویر بنانے لگتا۔

ایک تھے باقر ٹیز —عام فہم زبان میں ان کو بکرا کہا جاتا تھا۔ اُن کے سر کے بال بہت لمبے تھے۔ جوڑا اتنا بڑا تھا جیسے "بھینسے" نے سر پر گوبر کردیا ہو۔ ہنستے تو بڑے بڑے دانت نمایاں طور پر نظر آنے لگتے۔ اس رعایت سے کبھی کبھی ان کو "داتئین" بھی کہا جاتا تھا۔ گالوں پر لکیریں بھی بہت پڑتی تھیں، داڑھی دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ یعنی صرف ٹھوڑی پر چند بال، خمیدہ گردن، بہرحال سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ سب سے زیادہ شریف اور نیک دل تھے۔ آسمان کی بادشاہت انہیں کی تھی...... مجھ کو چق کے پیچھے سے دیکھنے کے عادی تھے۔

ایک اور "ڈھل مل" سا شخص تھا۔ اس کی داڑھی عموماً بندھی رہتی تھی۔ رنگ سیاہی مائل گندمی، بڑے ترنم سے بولتے۔ صورت سے متانت ٹپکتی تھی، گال پھولے ہوئے عموماً بڑے وقار سے قدم اٹھاتے، بات کرتے تو ذرا سنجیدگی کے ساتھ مجھ کو دیکھنے کی باقاعدہ کوشش کرتے تھے۔ دیکھ پاتے تو خوب منہ پھاڑ کر ہنستے۔ آوازے کستے، زیر لب ہی رائے کا اظہار فرما کر رہ جاتے، دز دیدہ و زیدہ نظروں سے مجھ کو دیکھتے رہتے۔

کہیں پرلے کونے کے کمرے میں ایک صاحب اور تھے۔ ان کی صورت کا کچھ تعین نہ تھا۔ اور نہ ہی میں ان کو سمجھ سکی، بقول موپاساں سب سے زیادہ دکھی شخص وہ ہے جسے کوئی سمجھ نہ سکے۔ کبھی وہ سکھ ہیں تو کبھی بال انگریزی طرز پر اور داڑھی صفا چٹ اور کبھی فرنچ کٹ بھی، کبھی ایک مونچھ غائب ہے۔ تو کبھی دوسری، سر پر کبھی ٹوپی کبھی پگڑی، کبھی ہیٹ، ہر آن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تھے۔ بات کم کرتے، ہنستے زیادہ، اور ہنسنے سے بھی زیادہ شرماتے۔ کمرے سے باہر ان کو کم ہی دیکھتی تھی۔ جب نکلتے تو شرماتے ہوئے، "بھینسا" سب سے اوپر کی چھت پر کھڑے ان کے شرمانے کی "پیروڈی" کرتے۔ ادھر "بھینسا" شرمانے میں سو سو ڈھنگ سے منہ بناتے، شانوں کو حرکت دیتے، نہ ہل سکنے والی کمر کو ہلاتے سکڑتے، کبھی پہلو بدلتے ادھر ہنسی کے مارے

پیٹ میں دکھن، لیکن شرمانے والے کو اس پیروڈی سے ذرا عبرت حاصل نہ ہوتی، اور وہ شرمائے ہی جاتے مجھے کم دیکھتے، آوازے بالکل نہ کستے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

دو لڑکے اور بھی تھے، گھوڑے کے بچھیروں کی طرح کبھی دُلکی چال سے ادھر آتے، کبھی اُدھر جاتے، مجھے دیکھ کر بڑا مچلتے تھے، ہائے ہائے، مار ڈالا، مار ڈالا کے نعرے لگاتے۔

وہ لوگ مجھ سے عشق جتلاتے وقت اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ سب کے سب بیچ کھیت، ڈنکے کی چوٹ میرے دامِ عشق میں مبتلا تھے۔

مالک مکان کا بوڑھا نوکر کہتا۔ ''اب تو یہ کچھ زیادہ ہی شور مچانے لگے' ورنہ پہلے اتنی وقت بے وقت دھما چوکڑی نہ مچتی تھی۔''

لیکن میں کچھ مانوس سی ہوگئی۔

ایک دفعہ میں ان کی نظروں کی زد سے ہٹ کر صحن میں ایک طرف کو بیٹھی تھی۔

''بھینسا'' چھت پر سے پکار کر بولے۔ ''بھئی ایک بات پوچھوں؟......

''فرض کر لو تم عورت ہو۔''

''میں عورت؟''

''ہاں...... بھئی فرض کر لو۔''

''فرض کر لیا۔''

''...... اور ہم تم کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔''

''بے شک''

''تو ہم دیکھا کریں۔ تمہارا کیا لیتے ہیں۔ یعنی (منہ پھاڑ کر) سونچو۔''

مجھ پر چوٹ تھی۔

بھئی پڑے دیکھیں، پڑے چلائیں، چھت پر نہ جائیں؟ سبزی کے چھلکے میدان

کی طرف نہ پھینکیں؟ کپڑے نہ پہنیں؟

ایک دن مالک مکان کی امّاں چلی آئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد، میں نے دیواروں پر سفیدی کے لیے کہا، پانی کی نالی کی مرمت کی ضرورت کا احساس دلایا، وہ ہامی بھرتی گئیں۔

میں نے چائے پلائی۔ اتفاقاً ہم صحن کے اس حصہ میں چلے گئے جہاں سے وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کپڑے بھی ذرا شوخ رنگ کے پہن رکھے تھے۔

''بیٹی اگر دل نہ لگے تو ہمارے گھر آجایا کرو۔ وہ کونے پر تو گھر ہے۔''

''جی نہیں، دل کا کیا ہے ۔فرصت ہی کہاں، مصروف رہتی ہوں۔''

آواز آئی ۔''بھئی! ہے! ہے! دھرم سے حد ہوگئی۔ آج تو نظر نہیں ٹکتی۔''

میں بدکی۔

بڑھیا نے آواز سنی یا نہیں لیکن بشرے سے اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میرا دماغ کھول رہا تھا نہ معلوم بڑھیا کیا سوچتی ہوگی۔ یہی کہ آخر دل کیوں نہ لگے۔ میری مصروفیات کی ''حقیقت'' بھانپ گئی ہوگی۔

اس کے جانے کے بعد جنون کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ وہ مرض تھا جس کا کچھ علاج نہ تھا۔ کہیں شنوائی نہ ہوسکتی تھی، صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔

جا کھڑی ہوئی۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے۔ غصہ کے مارے میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ مٹھیاں کس کر غضب ناک آواز میں چلاّئی۔ ''تم لوگوں کو واقعی شرم نہیں آتی...... میں آپ لوگوں کے پاؤں پڑتی ہوں......''

میں رو پڑی...... ریت کے گھروندے کی طرح گرنے لگی۔ لیکن بہ مشکل سنبھل کر ہٹ گئی۔

بڑی دیر بعد طبیعت سنبھلی۔ میں نے ہاتھ دھویا۔ اتنے میں ''وہ'' بھی آگئے۔

لیکن میں نے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ آخر ان لفنگوں کا کیا بگاڑا جاسکتا تھا؟ یہی نا! مردوں میں تو تُو میں میں ہوجائے تو پھر بے پر کی بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔

دوسرے دن میں پانی کا لوٹا لے کر چھت پر گئی۔ مجھے دیکھ کر کسی نے چوں تک نہیں کی۔ آتی مرتبہ بھی کوئی نہ بولا میں نے اس طرف دیکھا ہی نہیں۔ نظریں جھکائے کمرے میں چلی آئی۔

دن گذرتے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے پڑوس میں انسانوں کی بستی نہیں مرگھٹ ہے۔ حسب معمول صبح ہوتی۔ شام ہوتی۔ لیکن کوئی آوازہ کوئی بے ہودہ کلمہ سنائی نہ دیتا۔ ہائے دل، جگر کی صدائیں بالکل بند۔ نہ رقص ہوتے، نہ لطیفے کہے جاتے۔ نہ بازاری گانے گائے جاتے نہ منہ سے بلیوں کے لڑنے کی آوازیں ہی نکالی جاتیں۔

پہلے پہل دل کو ایک تسکین سی محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ طبیعت الجھنے لگی۔ کیا یہ بدتمیز اخلاق کے اس قدر ہی قائل ہوگئے ہیں۔ وہ کون سا احساس یگانگی تھا جس کی شدت میں پہلے دن ہی وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہوگئے تھے۔ پانچ مہینوں کے طویل وقفہ کے بعد پڑوس کے آباد ہوجانے پر پہلے پہل انہوں نے اتنی خوشیاں کیوں منائی تھی۔ تعداد میں اتنے ہوتے ہوئے بھی ان میں تڑپتی ہوئی زندگی کے آثار کیوں مفقود ہوگئے تھے۔ وہ اس قدر تنہائی کیوں محسوس کرتے تھے۔ وہ کون سی خلا تھی جو پر ہونے سے رہ گئی تھی۔ یہ کیسے عاشق تھے۔ ان میں کوئی دوسرا رقیب نہ تھا۔ وہ سب جانتے نہ تھے کہ میں اُن کے ہاتھ نہیں آسکتی؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ مشرقی، بالخصوص ہندوستانی لڑکی کن قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ اور اس کا کیا ایمان ہوتا ہے! پھر بھی ان سب کو بلا کسی جھجک کے مجھ سے بے پناہ عشق تھا۔

اب وہ بھوت دکھائی دیتے تھے۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ اب .شریف تھے۔ اب میں اپنے پڑوسیوں پر فخر کرسکتی تھی۔ وہ کس قدر عمر رسیدہ معلوم

ہوتے تھے۔ بوڑھے! ...... بوڑھے!!
جیسے صدیاں گذر چلیں جب وہ جوان تھے۔

ایک اتوار کو ہم دونوں ''ان'' کے ایک دوست کے ہاں چلے گئے۔ وہاں سے سنیما گھر پہنچے۔ سارا دن ہنسی خوشی گذارنے کے بعد لوٹے۔ گھر کے پاس ہی وہ محلّہ کے ایک آدمی سے بات کرنے لگے' میں چلی آئی...... پڑوسیوں کے ہاں آج کچھ شور سا سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

دریچے سے جھانک کر دیکھا۔ دو بڑی بڑی چار پائیوں پر سب کے سب بیٹھے تھے۔ وہ بھینسا دل ککڑ، وہ پچھیرے، وہ باقریز، وغیرہ کیسے معصوم دکھائی دیتے تھے۔ اس آسمان تلے چند بندے تھے پر ماتما کے...... بھینسا آہستہ آہستہ ستار ٹنٹنا رہے تھے۔

جی چاہا وہ مجھے بھی شامل کر لیں۔ کچھ آوازے ہی کس لیں' کچھ شور وغل ہی کر لیں۔ کچھ اُلٹی قلا بازیاں ہی لگالیں......

ہے بے شرمی کی بات' میں باہر صحن میں اس انداز سے کھڑی ہوگئی کہ ان کو نظر آسکوں۔ دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی بات یہ کہ میرے سر سے میرا رنگین دوپٹہ کھسک کر شانوں پر آرہا۔ لیکن میں نے سر نہیں ڈھانپا......

معاً باتیں بند ہوگئیں۔ میں نے چھپی نظروں سے دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے صحن کے اس حصہ کی طرف لپک رہے تھے۔ جدھر نہ وہ مجھے دکھائی دے سکتے تھے اور نہ زمین ہی ان کو نظر آسکتی تھی۔ شام کے دھندلکے میں میلی میلی چادریں لپیٹے، آگے پیچھے سے چارپائیاں اٹھائے...... اور پھر موت کی سی خاموشی طاری ہوگئی۔

نقاہت سے میں نے اپنا سر تھام لیا اور تقریباً لڑکھڑاتی ہوئی واپس کمرے میں آئی۔ بڑے کمرے میں کرسی پر بیٹھی کیا گر پڑی۔ جب میں نے آئینہ میں اپنی صورت

دیکھی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کی شراب غائب ہے اور ہونٹوں کی مٹھاس گم، گالوں کی سرخی ندارد، سینے کی کشش ختم، اور میں بوڑھی کھوسٹ ہوچکی ہوں بڑھیا...... بڑھیا!

رات کو جب ''وہ'' واپس آئے تو میں نے کہا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ گھر جلدی ہی بدل لیں۔ ''کیوں؟''

''میرا جی نہیں لگتا۔''

طے پایا کہ اگلے اتوار کو ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے کیوں کہ اس وقت ایک کوارٹر مل سکتا تھا۔

دوسرے اتوار کو ہمارا سامان ٹھیلوں پر لد رہا تھا۔

وہ سب لوگ چھپی نظروں سے ہمارا سامان لدتا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پڑوس کا مکان پانچ مہینوں کے طویل عرصہ تک خالی رہنے کے بعد مختصر عرصہ کے لیے آباد رہا اور اب پھر خالی تھا......

ان کی صورتیں رنجیدہ ہیں، چادریں لپیٹے کاہلی سے ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ مالش نہیں کرتے، ناچتے نہیں، الٹی قلابازیاں نہیں لگاتے، سب سے اوپر کی چھت پر ''بھینسا'' نیچے...... گگو، بکرانل سے پانی بھر رہا ہے، وہ بلّی کی سی آنکھوں والا گورا سا لڑکا اداس نظروں سے دوسری طرف کو دیکھ رہا ہے......

ہم تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تانگہ والا گھوڑے کو چابک دکھاتا ہے۔

میں محسوس کرتی ہوں۔ جیسے مجھے چاہئے تھا کہ ان کو اپنی حفاظت میں لے لیتی۔ جیسے میں نے ہی ان کو جنم دیا تھا، جیسے میں نے ہی ان کو پال پوس کر ....

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'تارو پود' میں شامل ہے۔

دِیمک

چابیوں کا گچھا زینو کے میلے آنچل سے بندھا لٹک رہا تھا۔ وہ پھونکیں مار مار کر آگ جلانے میں مصروف تھی۔ منہ لال، آنکھیں پُر آب اور بالوں میں راکھ خالد ہاتھ میں یوکلپٹس کی چند سبز پتیاں لیے اپنی ماں کو ان کی خوشبو سنگھانے کی کوشش کر رہا تھا — جب آلوؤں کے قتلے مسالہ اور گھی میں خوب لت پت ہوگئے تو اس نے پتیلی میں پانی ڈال کر اسے ڈھکنے سے ڈھانپ دیا۔ پانی ڈالنے سے جو سوں کی آواز نکلی تو خالد سوں سوں کر کے اس کی نقل اُتارنے لگا۔ اس کے بال آگے کو گرے ہوئے تھے اور آنکھیں بہ مشکل نظر آتی تھیں۔

ناجی، آٹھ سالہ بچی، منی پور ناچ ناچتی ہوئی باورچی خانہ میں آگئی پیچھے پیچھے اس کا بڑا بھائی مجو چھوٹے کنستر کا مردنگ بجاتا داخل ہوا۔ ناجی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بازو اُٹھائے اور آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے آنکھیں مٹکانے لگی۔ گاہے ناک کے ایک نتھنے میں بہت سی بہتی ہوئی ایزش باہر کی طرف جھانکتی۔ لیکن سرڑ کی ایک ہی آواز کے ساتھ غائب ہوجاتی۔ ناجی گردن کو خاص انداز میں گھما گھما کر کولہوں کو بھدّے طریقے سے جھٹکے دے دے کر لٹو کی طرح چکر جو کھانے لگی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ بالٹی میں جاگری۔ خالد ہنس کر آگے کو

جھکا۔ اُس کی ٹیڑھی کمزور ٹانگیں اس کا بوجھ نہ سنبھال سکیں توازن خراب ہوگیا۔ وہ ناک کے بل گرا تو دو تین تھالیاں بھی لڑھک گئیں، ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مجو نے مردنگ بجانا بند کر کے انگریزی ناچ شروع کر دیا۔ جب وہ پتلی پتلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر ناچتا تو اس کے گھٹنے گلے میں لٹکے ہوئے کنستر سے ٹکڑا ٹکڑا کر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور پیدا کرنے لگے۔

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹارز　　　　ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آ

ٹونکل ٹونکل......

ماں کی للکار سنائی دی۔ بچوں کو شور کرنے سے باز رکھنے کے لیے وہ خود ان سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگتی تھی۔

''میں کہتی ہوں تو نے میری ریڈر کہاں رکھ دی؟ ناجی کی بچی؟ سب سے بڑی بہن نجمی آن چلائی۔ ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گردن کی رگیں بولتے وقت ابھر آتی تھیں۔

ناجی کو ماں پچکارنے لگی۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ روئے جاتی تھی۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے دو آنے کا لالچ دیا تاکہ وہ چپ ہوجائے لیکن وہ رضا مند نہ ہوئی۔ ''نہیں میں دو آنے نہیں لوں گی۔ میں تو وہ لال لال پھولوں والا فراک پہنوں گی۔'' گویا یہ ناچ نہ تھا ایک سازش تھی۔ جس میں اماں کو پھنسا کر دراصل پھول دار فراک اینٹھنے کا ارادہ تھا۔

''نجمی مردود تو سارس کی طرح لمبی لمبی ٹانگیں نکالے بے شرمی سے ادھر اُدھر بھاگی پھرتی ہے۔ تجھ کو عقل کب آئے گی؟''

''ہائے اللہ میں کہاں جاؤں۔ میری ریڈر جو چھپا دی ہے ناجی کی بچی نے''

بچوں کے ابا آئے۔ ''پانی گرم ہوگیا کیا؟''

''ہو رہا ہے۔ دیکھیے نا! بچوں نے کیا غدر مچا رکھا ہے؟''

''ارے کم بختو! تم کو آج پڑھنے کے لیے نہیں جانا ہے کیا؟ ایں؟ کیوں بے خالد! تو جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا۔ اپنی ماں کو کام نہیں کرنے دیتا، ہر وقت اس کا آنچل

پکڑے رہتا ہے۔ گدھے کے بچے؟'' اپنی گالی پر خود ہی مسکرا کر اس نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ ''تیرا باپ گدھا اور تیری اماں گدھی۔''

''ہٹائیے بھی۔'' زینو بگڑی۔ ''صبح سویرے اللہ کا نام لیجیے نا! بچے کیا تمیز سیکھیں گے؟''

زینو کو خالد بہت پیارا تھا۔ وہ اس کو نیک بخت سمجھتی تھی۔ اتنا بڑا ہوگیا تھا پر وہ ماں کا دودھ پیے جارہا تھا اور وہ پلائے جارہی تھی۔ اس نے گھسیٹ کر خالد کو گود میں لے لیا۔ قمیص اٹھا، چھاتی اس کے منہ میں دے دی اور اوپر دوپٹے کا سایہ ڈال لیا۔

''بھئی یہ کیا حرکت ہے سو مرتبہ سمجھایا کہ اب اسے اپنا دودھ نہ پلایا کرو۔''

''کہاں پلاتی ہوں۔ یہ تو کبھی کبھار چپ کرانے کا حیلہ ہے۔''

''لاؤ پانی۔''

''ذرا صبر کیجیے نا! بیٹھ جائیے گھڑی کی گھڑی۔''

وہ اسٹول پرٹنڈے کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

زینو نے پانی میں انگلی ڈالی۔ ''نجمی! یوں تو تو بڑی شوقین بنتی ہے۔ ایک کی بجائے دو دو چوٹیاں لٹکائے پھرتی ہے۔ لیکن بال سمٹتے بھی ہیں تجھ سے۔ دیکھ تو بالوں کی لٹیں کیسی الجھ رہی ہیں۔''

''شوقین، شوقین' کہاں ہوں میں شوقین؟ آپ جب کب مجھ پر ہی الزام دھرتی رہتی ہیں۔ دو چوٹیاں نہ کروں تو کروں بھی کیا؟ اتنے گھنے بال ایک چوٹی میں سمٹتے ہی کہاں ہیں؟'' بڑبڑاتی زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی وہ چلی گئی۔

مجو جا میرا بیٹا! چچا سے کہو کھانا کھالیں آکر۔ آج تو یوں بھی دیر ہوگئی ہے۔''

زینو کا دیور بی۔ اے آنرز کا طالب علم تھا۔

مجو چچا کو بلانے گیا۔ چچا کتنے عرصے سے بیٹھا اُبل رہا تھا۔ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھوکا ہی پڑھنے چلا جائے گا۔ تاکہ اس کا بڑا بھائی بھابی پر خفا ہو اور

آئندہ وہ اس کو ایک غیر اہم ہستی سمجھ کر کھانا تیار کرنے میں دیر نہ لگایا کرے۔ چنانچہ اس طرف سے مجو کمرے کے اندر داخل ہوا، دوسری طرف چچا کمرے کے باہر ''چچا! امّاں کہتی ہیں کھانا کھالو۔''

''اب اتنا وقت کہاں ہے؟ کھانا کھا لیجئے اب'' —اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی صورت پر ایسی مظلومیت طاری کر لی جیسے اس گھر میں ہفتہ بھر سے اس کو کھانا نہ ملا ہو اور نہ آئندہ ہفتہ بھر تک کوئی امید ہو۔

مجو خبر لایا۔ ''چچا چلے گئے۔ وہ کہتے تھے اب وقت نہیں ہے۔''

''ہائے میں مرگئی۔ بے چارہ بھوکا چلا گیا۔ سارا دن بھوکا رہے گا۔ اچھا نوکر کے ہاتھ کھانا کالج ہی بھجوادوں گی۔''

''کالج کیا کرو گی بھجوا کر۔ اس نے سو مرتبہ کہا ہے اس کو کھانا کالج نہ بھیجا کرو۔ سب کے سامنے کھانے سے اس کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ لاؤ مجھے پانی دو کہیں میں دفتر سے نہ رہ جاؤں۔''

''یہ لیجئے پانی تو ہوگیا گرم ...... اچھا میں کہتی ہوں دوست کو بلا لو۔ کھانا کھالے اسے بھی جانا ہوگا۔''

''بہت اچھا پکاؤ روٹی۔''

وہ اٹھا، اسٹول اندر کے برآمدے میں رکھا اور ایک کرسی کھسکا دی۔

''مجو میرا اچھا بیٹا! جانا جی کو ساتھ لے جا۔ اپنا منہ بھی دھو اور چھوٹی بہن کا منہ بھی دھو ڈال۔ پھر آکر کھانا کھا لو۔ تب میں تم کو اچھے کپڑے پہناؤں گی۔''

''کم بخت نوکر کہاں ہے؟''

''وہ دودھ لینے گیا ہے۔ جہاں جاتا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ آپ نہا لیے کیا؟''

''صابن کا پتہ نہیں تولیہ ملتا نہیں۔''

''ٹھہریے میں نکالے دیتی ہوں نیا تولیہ۔'' خالد کو چھاتی سے ہٹایا تو وہ ٹھنکنے

لگا۔ ارے ہٹ بیٹا! ماں کو نوچ کر کھا ہی جائے گا کیا؟''

شوہر کو صابن اور تولیہ دینے کے بعد وہ پھر چولھے کے آگے آن بیٹھی۔ مجو اور ناجی بھی منہ دھو کر آ گئے۔

''شاباش شاباش کتنے اچھے بیٹے ہیں۔ لو بیٹھو اب کھانا کھا لو...... مجو بیٹا تمہاری آپا کہاں ہے؟''

''آپا نجمی اندر کے کمرے میں کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی ہیں۔''

زینو نے جلدی سے اُن کے آگے کھانا رکھا۔

''مجو چھوٹے بھیا کو بھی بٹھا لو اپنے پاس۔ اس کو بہت چھوٹا لقمہ شوربے میں خوب بھگو بھگو کر دینا۔ جھگڑنا نہیں۔ روٹی کی ضرورت ہو تو رکابی میں سے لے لینا — میں ابھی آئی۔

اندر والا کمرہ جہاں ''آپا نجمی'' کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی تھیں۔ نسبتاً تاریک تھا۔ وہاں بہت بڑے بڑے ٹرنک پڑے تھے۔ جو زینو کو آج سے قریباً چودہ برس پہلے شادی کے موقع پر جہیز میں ملے تھے۔ ان کے علاوہ قیمتی کپڑوں کے ٹرنک، لوہے کی پیٹی، گہنے نقدی وغیرہ سب کچھ اسی کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ آپا نجمی بقول مجو کے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ اس کی گدرائی ہوئی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ چہرہ بالوں کی گھٹاؤں میں پوشیدہ تھا۔ اس نے اماں کے پاؤں کی چاپ سنی لیکن سر اُوپر نہ اٹھایا اور نہ رونا بند کیا۔ وہ تسلسل کے ساتھ ہچکیاں لیتی رہی۔ جب وہ گہری گہری سسکیاں لیتی تو اس کے بازوؤں اور کمر میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ زینو چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ چندے سکوت کے بعد وہ بیٹھ گئی۔ اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اور بھی شدت کے ساتھ رونے لگی۔ زینو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

''نجمی رانی! کیا بات ہے؟ میری بچّی تو میرے کہے کا بُرا مانے گی؟ تُو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میری آنکھوں کا نور ہے۔ پگلی تجھے اتنا بھی معلوم نہیں تمہاری امّاں تجھے کتنا پیار کرتی ہے۔ میری رانی! تیرے ہی دم سے تو اس گھر کی رونق ہے۔ تجھے کیا تکلیف ہے۔ تیرے پاس اچھے اچھے کپڑے نہیں' یا خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں، یا خوب صورت گڑیا نہیں کوئی لڑکی ہے اڑوس پڑوس میں جس کے پاس تجھ سے زیادہ کپڑے ہوں۔ تو میری سیانی بیٹی ہے۔ تو اُس دن فاطمہ کی امّاں سے کہہ رہی تھی کہ ہماری امّاں جی ہم کو فضول پیار نہیں کرتیں۔ وہ تہ دل سے ہم سے محبت کرتی ہیں۔ بتا تو میری لاڈلی آج تجھ پر کیا وہم سوار ہوگیا کہ تیری امّاں تجھ کو پیار نہیں کرتی۔ کیوں تو اس کال کوٹھڑی میں پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ تیرے روئیں دشمن۔ دشمن تیری بلا جانے یہ رونا دھونا کیا ہوتا ہے۔ کیا اب تو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تیری امّاں بے انصاف ہے۔ جابر ہے۔ بے رحم ہے؟

نجمی سسکیاں بھرتی رہی۔

زینو نے گھسیٹ کر بیٹی کو گود میں لے لیا۔ میری لاڈلی! اب تو سیانی ہوگئی ہے۔ جانتی ہے۔ اب تیری عمر کیا ہے۔ اب تجھ کو تیرھواں برس شروع ہو چکا ہے۔ میں پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی تھی۔ تجھے کیوں کر سمجھاؤں۔ تو خود ہی سمجھ لے۔ اب تو دودھ پیتی بچّی نہیں رہی۔ اچھا تو ہی بتلا کہ تیری عمر کی لڑکی ایک تنگ، فراک اور ایک جانگیہ پہنے، رانوں تک ننگی ٹانگیں نکالے گھومتی اچھی معلوم ہوتی ہے؟ مانا کہ تو اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ لیکن اب تیری عمر گھر میں اس طرح گھومنے کی نہیں ہے۔ میری بچّی! یہ باتیں والدین کو اشارتاً کنایتاً کہنی پڑتی ہیں۔ عقل مند اور سگھڑ بیٹیاں تھوڑے کہے کو بہت سمجھتی ہیں۔ ابرو کے اشارے سے مطلب کو پالیتی ہیں — اپنے بال دیکھ۔ رانی! بالوں کی دیکھ بھال کیا کر۔ کتنے لانبے، کتنے کالے، کتنے گھنے اور کس قدر بوجھل ہیں تیرے بال— میں تجھے تو دو چوٹیاں گوندھنے سے منع نہیں کرتی اور نہ ہی اس کو برا سمجھتی ہوں۔

لیکن میری لاڈلی یہ بھی تو درست نہیں کہ تیرے بال ہر پابندی سے آزاد ہوا میں لہراتے رہیں اور تو سر پر چندریا تک نہ رہنے دے۔ تو کنواری ہے۔ اب تو کمسن بھی نہیں کہ تیری حرکات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اتنی سی بات تھی جو میں نے تجھ سے کہی۔ میں سمجھتی تھی میری بیٹی میرا کہنا مان جائے گی۔ لیکن تو بجائے میری نصیحت پر عمل کرنے کے رونے لگی۔''

نجمی نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔

''اری دیکھ تو، اب تو میرے برابر ہونے کو ہے۔ اب تو تیرے بوجھ تلے میری ٹانگیں دُکھنے لگتی ہیں۔ جب بیٹی ماں کے برابر ہوجائے تو وہ بیٹی نہیں رہتی بلکہ بہن بن جاتی ہے۔ میری نازوں پلی بٹیا! تجھ کو چاہئے کہ اب تو ہر کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ گھر کے معاملات میں اپنی رائے دے۔ میں اب تھک گئی ہوں میرا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ تو پرائی دولت ہے۔ لیکن جب تک میرے پاس ہے اس وقت تک تو میرا سہارا بن کر رہ۔ میں تو تجھ سے ان باتوں کی امید رکھتی ہوں اور تو نہ معلوم کون سی دنیا میں بستی ہے۔ اب تو سیانی بیٹی بن۔''

زینو کی رانیں سچ مچ دُکھنے لگیں۔ نجمی کو دیکھ کر اسے خوف معلوم ہوتا تھا۔ کس قدر بڑھ گئی تھی کم بخت! قد و قامت میں پوری عورت معلوم ہوتی تھی۔ اور دو ڈھائی برس تک تو اس پر نظر ہی ٹھہر سکے گی۔ وہ نجمی کے جسم کو غور سے دیکھنے لگی۔ کس قدر بھرا ہوا، لچک دار، بے عیب، بے داغ، تنی ہوئی جلد، مہکا ہوا جسم جیسے کھیت کی صاف ستھری نم دار مٹی کی بو یا جیسے جنگل میں خود رو سرسبز گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو — وہ اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ کس قدر خوب صورت، مکمل، دل فریب، جاذبِ نظر، بال بل کھاتے اور لہراتے ہوئے جیسے سر کی جلد میں سے فوارے کی طرح پھوٹ کر لاوے کی سی تیزی کے ساتھ بہ نکلے ہوں۔ جیسے وہ آگے ہی بڑھتے چلے جائیں گے...... اس کے بازوؤں میں جکڑا ہوا نجمی کا جسم کس قدر جان دار، کسمسایا ہوا، بل کھاتا

اور لچکتا ہوا سا تھا۔ اس بات کا احساس کر کے کہ یہ جسم اسی کے خون کا پروردہ ہے، اس کو عجیب قسم کی راحت سی محسوس ہونے لگی۔ جب اس نے نجمی کے نصف کے قریب بال مٹھی میں لیے تو اس کی مٹھی بھرپور ہوگئی۔ وہ ان کو مٹھی میں آہستہ آہستہ دباتی رہی...... اُس نے نجمی کا منہ اُوپر اٹھایا اور اُس کے نم دار رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ کتنی لذت تھی۔ وہ فخر کرنے لگی۔ اسی نے اس جسم کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا — وہ نجمی کو از سرِ نو دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے اس کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ اس کے لیے وہ ایک عجوبہ تھی۔ ایک طلسم تھی۔ جوں جوں نجمی جوان ہوتی جارہی تھی۔ توں توں اپنی ماں کے دل کے قریب ہوتی جارہی تھی — وہ اپنی کنواری بیٹی کے اچھوتے جسم کو چومنے لگی۔ جب اس نے اس کی گردن پر اپنے لب رکھے تو وہ کسمسا کر ہنسنے لگی۔ ''مجھے گدگدی ہوتی ہے۔''

''شریر کہیں کی لے اب اُٹھ میں اور کام بھی کرلوں۔''

''نہیں میں نہیں۔'' یہ کہہ کر نجمی ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور جیسے ماں کے کان میں جادو پھونک رہی ہو۔'' امّی! اب میں کبھی نہ روؤں گی۔ نہ کبھی سارس کی طرح ٹانگیں نکالے پھروں گی۔ اور نہ سر کو ننگا رہنے دوں گی۔''

''میری لاڈلی بیٹی! میری لاڈلی بیٹی!!''

''اور امّی! آپ ناجی اور مجو کے کپڑے نکال دیں میں ہی ان کو کپڑے پہناؤں گی۔''

''میری سیانی بیٹی! اچھا تو چل میں تجھ کو کپڑے نکال دوں۔''

''اور امّی!'' نجمی نے اور بھی لپٹتے ہوئے کہا۔'' آج میرے لیے دو انڈے منگوا لینا۔ جب میں اسکول سے واپس آؤں گی تو انڈوں کی سفیدی میں دودھ ملا کر اپنے بالوں کو گھنگریالے بناؤں گی۔''

گھر کے بیسویں چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت زینو رسوتی، دھاگہ اور پٹاری سنبھال ڈرائنگ روم میں کوچ پر جا بیٹھی۔ رسوتی پر جھکے جھکے وہ رونے لگی۔

''چچی آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟''

اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔''آ سلمٰی! میرے پاس بیٹھ جا۔ تو کب آئی چپکے سے دبے پاؤں مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔''

''آپ رونے میں اس قدر محو تھیں کہ میری آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔''

''اوہ! میں چھوٹی بہن کو یاد کر کے رو رہی تھی، بچاری......''

سلمٰی کے چہرے کی سب سے زیادہ دل کش چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے ہنستی، آنکھوں سے روتی، آنکھوں سے سنتی اور آنکھوں ہی سے باتیں کرتی...... چنانچہ اب اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

زینو نے بات کا رخ بدلنا مناسب سمجھا۔

''تمہاری امّاں کیا کر رہی تھیں۔''

''کچھ بھی نہیں بس لیٹی تھیں۔''

''ہمارے ہاں کیوں نہیں چلی آتیں۔''

''نہ جانے''

کچھ دیر سکوت رہا۔

''سلمی اب میرا جی نہیں لگتا۔''

''کیوں؟''

''نہ معلوم''

سلمٰی فرش کی طرف دیکھنے لگی' جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ......''

''کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟''

''یہی کہ تم جلد دلہن بن کر ہمارے ہاں آجاؤ۔''

سلمیٰ نے شرما کر برقع کے آنچل میں چہرہ چھپا لیا۔ سوائے آنکھوں کے حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ آنکھیں چھپا لیتی۔ باقی چہرہ خواہ کھلا رہنے دیتی۔ زینو کے دیور سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

زینو ہمیشہ کی طرح سلمیٰ کو بحیثیت دُلہن کے جانچنے لگی۔ سلمیٰ اور زینو کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ سلمیٰ نے اپنی امّاں کو جتا دیا تھا کہ وہ زینو چچی ہی کے ہاں دلہن بن کر جائے گی۔

''جب تو میرے پاس آجائے گی سلمی! تو میرے آدھے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ تو آکر اس گھر کو سنبھال لے۔ پھر میں آرام سے کھاٹ پر پڑی رہا کروں گی۔ رانی اپنے گھر کی آپ دیکھ بھال کر لیا کرے گی۔''

سلمیٰ کو چچی کی گفتگو کا یہ انداز بہت پسند تھا۔ اس کی اس میٹھی زبان اور دل نشین حرکات پر وہ فدا تھی۔

قدرے توقف کے بعد سلمیٰ بولی۔ چچی اب تو نجمی بھی جلد ہی دلہن بنے گی۔''

''دیکھ تو کتنی بڑھ گئی ہے کم بخت۔ خدا میری لاڈلی کو نظر بد سے بچائے۔ اس کی جوانی ہے یا جوار بھاٹا۔ اللہ سب کی آبرو رکھنے والا ہے۔ سلمیٰ بیٹی اب تو بھی خیر سے جوان ہے۔ صحت ور ہے۔ لیکن وہ موئی ہاتھ پاؤں کی کتنی مضبوط کس قدر تیز اور تند مزاج ہے۔ اس کے لیے تو کوئی ایسا دلہا چاہیے جو اُس کو ہر طرح سے قابو میں رکھ سکے۔ ورنہ وہ سب کا ناک میں دم کر دے گی — لیکن میری بیٹی دل کی بُری نہیں۔''

''ہاں چچی! یوں تو بات بے بات پر مجھ سے الجھ پڑتی ہے۔ لیکن چچی سچ کہتی ہوں اگر کبھی میں خفا ہو جاؤں تو پھر سو سو طرح سے مناتی ہے مجھ کو...... ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلی ہیں۔ شادی ہو جانے پر نہ معلوم کہاں جائے گی۔ ہماری نجمی!''

''بیٹی یہی دستور ہے دنیا کا۔ کیسی کیسی سہلیاں تھیں میری۔ میں تصور میں سب کی صورتیں دیکھ سکتی ہوں۔ کیسی شوخ، کھلنڈری، ہنس مکھ، البیلی ہائے ایک دفعہ بچھڑ کر پھر ہم سب ایک مرتبہ بھی پہلے کی طرح یکجا نہ ہوسکیں۔ اپنے اپنے دھندوں میں پھنس کر رہ گئیں سب، ان کو یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ وہ جھولے، وہ چرخے......

''ایک بات اور کہہ دوں بچی! آپ ابھی بالکل نوجوان دکھائی دیتی ہیں۔ نجمی نے تو یوں ہی بڑھ کر آپ کو آن لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کی ماں تو معلوم ہی نہیں ہوتیں۔ آپ تو اس کی بہن دکھائی دیتی ہیں۔''

زینو ہزار سنجیدہ اور سگھڑ سہی لیکن یہ بات سن کر پھول گئی۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔ اُس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بھئی میری عمر بھی کیا ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ پندرہ برس کی عمر میں میری شادی ہوئی — اور بھئی ایک سال بعد نجمی پیدا ہوئی۔ یعنی میں اس وقت سولہ برس کی تھی۔ اور اب نجمی خیر سے سات مہینہ اُوپر بارہ برس کی ہے۔ اب حساب لگاؤ تو — ہوئی نا میں اٹھائیس برس کی...... پہلے تو شادیاں بھی چھوٹی سی عمر میں ہوجایا کرتی تھیں۔ بیٹی اب تیری عمر بھی خیر سے سترہ سے اوپر کی ہے۔ تین برس سے پہلے تیری شادی کیا ہوگی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ شادی کے سات آٹھ سال بعد تو بوڑھی بھی ہوجائے گی۔''

بار بار اپنی شادی کا ذکر سن کر سلمیٰ خوش بھی ہوتی تھی۔ اور جھینپتی بھی تھی — اب پھر بے چاری کو تھوڑی دیر کے لیے زمین کی طرف دیکھنا پڑا...... ''چچی! ایک بات اور بھی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی طبیعت، ناساز رہتی ہے۔۔ آپ کچھ غم کرتی رہتی ہیں۔''

''غم کیا سلمیٰ! یہی چھوٹی بہن کے مرنے سے دل دُکھی رہتا ہے۔ بے چاری کی یاد آتی ہے تو بے اختیار رو دیتی ہوں۔''

نہیں چچی یہ تو ایک مہینہ پہلے کی بات ہے نا! لیکن میں آپ کو قریباً ڈھائی مہینے سے یوں ہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں...... اچھا بتایئے چچا نے آبائی مکان کیوں بیچا؟...... میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں؟

نہیں بیٹی! میں اکیلی جان اور اس پر اتنی پریشانیاں۔ چھوٹے چھوٹے بچے دیور بچوں کے ابا سبھی کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ گھر کے بیسیوں چھوٹے موٹے کام تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمدردی کا ایک کلمہ تک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا البتہ میری بوٹیاں نوچنے کو سب تیار۔ یہ گرہستی بھی جان جوکھوں کا کام ہے اور تو اور نوکر تک نہیں کہ ہاتھ ہی بٹائے۔ لے دے کر وہ چندھی آنکھوں والا چھوکرا ہے۔ نوکر ہیں کہ ٹکتے ہی نہیں کم بخت فاقے کرتے چیتھڑے لٹکائے آتے ہیں۔ اچھا کھانے کو ملتا اور اچھا پہننے کو۔ آنکھوں پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ پھر تو اونچے اڑنے لگتے ہیں۔ کہاں یاد رہتی ہے۔ ان کو اپنی حیثیت۔''

کم بخت نوکروں کا بھی کال پڑ گیا۔ ہمارے گھر میں بھی یہی حال ہے۔ تبھی تو ہم نے بھینس بیچ ڈالی۔ اب کون کرے دیکھ بھال...... چچی آپ دوپہر کے وقت ہمارے گھر آجایا کریں۔ ہمارے بنگلوں کے درمیان ایک باڑ ہی تو ہے کون سا کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ دیکھئے نا میں دن بھر میں ایک دو چکر ضرور لگاتی ہوں...... اگر آپ وہاں آجایا کریں تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔ اکیلے میں آپ رونے لگتی ہیں مفت میں صحت برباد ہوتی ہے۔''

''میرا نکلنا بھی ہو۔ گھر اکیلا چھوڑ کر کہاں جاؤں جب تک بچے گھر پر رہتے ہیں۔ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی...... اے لو آگیا غریب کالج سے۔ آج صبح کھانا بھی نہیں کھا کر گیا تھا، اُٹھوں اب دوں کچھ بے چارے کو۔''

ادھر تو سلمٰی کے ہونے والے شوہر بھوکے مرغ کی طرح چونچ کھولے لڑکھڑاتے اندر داخل ہوئے اُدھر ان کی ہونے والی بیوی برقع جھپٹ بگولے کی طرح کمرے سے

باہر نکل گئی۔

صبح کے ہنگامے کے بعد شام کے ہنگامے کا دور شروع ہوا، رونا دھونا ، چیخنا چلّانا، مارنا پیٹنا، کھانا پینا، ناچنا گانا، پیار، دلاسا — سب کچھ ہو چکا تو بچے پڑ کر سو گئے۔ کالی رات...... زینو طویل و عریض کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹیکے اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے تھکی ماندی سی کھڑی تھی۔ ساتھ کے کمرے سے بچوں کے ہلنے جلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب سے پرلے کمرے میں کتھئی رنگ کے سمٹے ہوئے پردے میں سے اُس کو اپنا دیور نظر آرہا تھا جو کھانا کھانے کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سرکنڈوں کی بنی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا ریڈیو سننے میں محو تھا — زینو نے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔ وہ شوہر کی منتظر تھی۔

''ابھی ابھی دہلی سے آپ استاد عبد الستار سے ٹھمری سن رہے تھے۔ اس وقت گیارہ بجنے کو ہیں۔ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔ ہم کل صبح آٹھ بجے تک آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ آداب عرض۔''

جواب میں'' آداب عرض'' کہہ کر — اس کے دیور نے ریڈیو بند کر کے روشنی گل کردی اور کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

یہ آخری آواز تھی — اس کے بعد خاموشی ہی خاموشی — تاریکی ہی تاریکی۔ لامتناہی کس قدر وسیع آسمان کس قدر پھیلی ہوئی تاریکی۔ پرے کھیتوں کے سلسلے۔ تاریکی میں اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے بھٹے کے آثار، اس سے بھی پرے گارے کے بنے ہوئے مکانوں والا گاؤں، تاروں کی چھاؤں میں ایک دھبّے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

پاؤں کی چاپ سنائی دی — وہ اس آواز سے آشنا تھی۔ یہ اس کے شوہر کے پاؤں کی چاپ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا اس نے چند فائلیں میز پر پٹخ دیں۔ اور اس کے قریب چلا آیا۔

کھانا وہ باہر ہی سے کھا کر آیا تھا۔ اس نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ کیوں کہ آج اس کو ایک دوست کے ہاں برج کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ لیکن اس وقت وہ تھا خوش، از حد خوش......

چنانچہ جب وہ چلا گیا تو وہ کھڑی رہی حرکت کرنے کی سکت باقی نہ تھی۔ دماغ مضمحل تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی۔

کھڑکی میں سے اُوپر کو اٹھی ہوئی ہری ہری بھنگ کے پودوں کی نازک نازک کونپلیں ...... خود رو اونچے پودوں کے ہلکے نیلے رنگ کے پھول — ساکن' چپ چاپ۔

برج؟؟

کیا واقعی وہ اس کو دودھ پیتی بچّی سمجھتے تھے۔ کیا ان کا یہ خیال تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھتی تھی؟

کس قدر وسیع آسمان تھا — آنکھ جھپکاتے ہوئے سے تارے کس قدر دھندلے گدلے، پھیکے، مٹیالے............

یہ افسانہ، افسانوی مجموعہ' تار و پود' میں شامل ہے۔

کسبی

برف کے تودے روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔

پہاڑوں، درختوں اور مکانوں ان دونوں کے کندھوں اور ان کے پیچھے پیچھے آنے والے قلیوں کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان پر برف ہی برف۔

ان کے سفر کی یہ آخری منزل تھی۔ وہ بہت تھک گئے تھے۔ انہوں نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ بس خاموشی سے، تھکے ماندے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے قلی بوجھ تلے دبے ہوئے پسینہ میں تر تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی۔

دونوں خوش پوش تھے۔ ایک دراز قد، نازک اندام اور حسین نوجوان دوسرا قدرے پستہ قد کچھ موٹا اور بھدّا سا لیکن دونوں کے بشرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ حسین نوجوان نے اوورکوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر اپنی ناک کو چھوا۔ ارے میری ناک! کیسی سرد جیسے برف کی ڈلی۔ بالکل سن گویا ہئی نہیں۔

دوسرا ہنسنے لگا۔ اپنی ناک پر سے پانی کا قطرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم کس جگہ پٹ اَپ کر رہے ہیں۔''

جواب ملا۔'' سیوائے ہوٹل۔(Savoy)

سیوائے ہوٹل کی وسیع سیڑھیوں کے دونوں طرف برقی روشنی ہو رہی تھی۔ ہنڈے ڈے لائٹ رنگ کے تھے۔ دھند میں اوپر کو اٹھی ہوئی محراب پر گہرے نیلے رنگ کے انگریزی حروف چمک رہے تھے۔ ''ڈے لائٹ ہنڈوں کی روشنی برف سے ڈھکی ہوئی سڑک تک پڑ رہی تھی۔ اس وقت بڑی گہما گہمی تھی۔ خوش پوش حسین عورتیں' مرد' بچے، بوڑھے، اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ رکشاؤں کی ریل پیل تھی۔

ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ ٹُولی ! ــــ ستون کے قریب سے تین چار قلی ٹاٹ اوڑھے کھڑے تھے۔ انہوں نے بیڑیاں مسل کر جیب میں رکھ لیں۔

ایک سرخ رنگ کا پستہ قد گٹھیلا شخص ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''دِش سائید پلیسز۔''

وہ دونوں نوجوان آگے بڑھے۔ ایک نے اوورکوٹ کے اُلٹے ہوئے کالر میں سے چونچ نکال کر پوچھا۔ ''ازاٹ سیوائے۔''

''اش شر'' ــــ انہوں نے '' اش شر'' کہنے والے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر چمک تھی اور اس کی پیشانی اور کنپٹیوں پر نیلی و سرخ رگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔

''آریو...... اس شخص نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔'' اش شر آئی ام دی گائیڈ آف دِش ہوٹیل۔''

ہوٹل کے قلیوں نے سامان اٹھایا۔ اور وہ تینوں ہوٹل کی اجلی اجلی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ہوٹل کا اندرونی حصہ برف کے گرتے ہوئے تودوں کی وجہ سے صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ کہرے میں چھپی ہوئی برف پوش دھندلی دھندلی عمارتیں ٹمٹماتے کھوئے کھوئے سے لیمپ رکشا کھینچنے والے قلیوں کی کالی کالی پھرتیلی ٹانگیں۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب سے نسبتاً تاریک سی ایک گلی جاتی تھی۔ گلی کے اندر روشنی بہت مدھم تھی۔ برف کو چھو کر آنے والی ہوا میں سڑے ہوئے تیل اور تلی ہوئی مچھلی کی تیز بو ملی ہوئی تھی۔ اس پُر اسرار گلی میں سے دبی ہوئی سی آواز اٹھی:

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے
جلد آجا کہ جی ترستا ہے

قدم بہ قدم وہ آگے بڑھے جا رہے تھے۔ انہوں نے گائیڈ سے پوچھا — یہ گلی کیسی ہے؟''

گائیڈ نے ٹھٹکتے ہوئے جواب دیا — '' کچھ نہیں سر! ادھر یوں ہی کچھ ڈانسنگ گرلز رہتی ہیں۔''

ڈانسنگ گرلز!! جلد آجا کہ جی ترستا ہے...... جلد آجا کہ جی ترستا ہے...... جلد آجا کہ ...... آہستہ آہستہ آواز مرگئی۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی پہاڑ کی ہر غار آواز کو دگنے سوز کے ساتھ واپس لوٹا رہی تھی......

دوسرے دن چار بجے بعد از دوپہر حسین نوجوان باہر نکلا۔ ان کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے ہوٹل کا وسیع صحن تھا۔ اس نے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ صحن میں خوب رونق ہو رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے موسم خوش گوار تھا۔ لوگ ٹولیوں میں کھلے صحن میں ہی بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ایک طرف ایک بھاری بھرکم سکھ رئیس' دوہری انگزی باندھے چائے پینے میں مصروف تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان عیسائی لڑکی بڑے گملے کے قریب کھڑی نوکر سے بات کر رہی تھی۔ اس کی صورت خچر کی سی تھی۔ ٹانگیں لمبی اور پنڈلیاں فربہ اور چمکتی ہوئی چھاتیاں نوک دار اور بے تحاشا ابھری ہوئی۔ منہ لمبوترا سا۔ رنگ جیسے زیادہ پکی ہوئی اینٹ۔ مگر گال خوب سرخ رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ پرے منیجر فون کے قریب بیٹھا نیم باز آنکھوں سے حاضرین کا جائزہ لے رہا تھا۔ صحن کے پرلے سرے تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی۔ رنگ برنگ کے دوپٹوں اور پگڑیوں، اور فراکوں کی وجہ سے صحن پھولوں کی کیاری سی بنا ہوا تھا۔

اندر سے آواز آئی ۔'' دیوندر! دیوندر!! تم باہر ہو؟''

''ہاں۔''

''ادھر آؤ ایک چیز دکھائیں تم کو۔''

ساتھ والے کمرے سے ایک چودہ سالہ لڑکا نکلا۔ ٹخنوں پر گھنگرو بندھے ہوئے، وہ ریڈیو کی گت پر پاؤں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ سر پر دو پلّی ٹوپی، آنکھوں میں کاجل، ململ کی قمیص۔ تنگ پائجامہ ٹوپی میں سے نکلے ہوئے سیدھے بُرش کی طرح بال اس کی چکنی کنپٹیوں تک پہنچتے تھے۔

''اونہہ'' ایک کالے سے آدمی نے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''کولھے بھی تو ہلاؤ۔ یوں دیکھو۔ اس جگہ ہاتھ رکھو — یہ — بس اب کولھے بھی تو ہلاؤ۔ اور آں ہاں — جھٹکا بھی دو۔''

دیوندر کے ساتھی نے سر دروازے سے باہر نکال کر کہا۔ '' ارے بھائی ابھی چپکو......''

دیوندر اندر گیا۔ ''توبہ'' اس کے ساتھی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''گئی بس گئی۔ کب سے بلا رہا ہوں سرکار کو...... یہ ساتھ کے کمرے میں ہمارے پڑوسی جانتے ہو کون ہیں؟''

''ناچنے والوں کی پارٹی ہوگی۔ ابھی ابھی ایک لڑکا باہر کھڑا ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

'' او ہو تو میں غلط سمجھا۔ میں شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں سمجھے بیٹھا تھا۔ حد ہوگئی۔ آج کل دونوں میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔''

نوکر چائے کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔

دیوندر نے دریافت کیا۔ کیوں بھائی یہ بغل کا دروازہ بند کیوں ہے؟

حضور! مسافر اپنی مرضی سے بند رکھتے ہیں۔ اُدھر کچھ ہے بھی نہیں۔ ایک گلی ہے۔''

دیوندر نے اپنے ساتھی کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بے شک مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے سامنے کا دروازہ کھول دینا ہی کافی ہے۔'' — نوکر چلا گیا۔

دیوندر نے بند دروازہ کھول دیا۔ گویا یہ بازارِ حسن ہے خوب!''

وہ دروازے کے قریب ہی رضائی لپیٹ کر کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی کیلاش نے چائے کی پیالی بڑھائی۔ دیوندر نے پیالی ہونٹ سے لگاتے ہوئے کہا۔'' کیوں بھئی! ہم اس جگہ اس شرط پر تو نہیں آئے تھے کہ چائے پی پی کر سینہ جلائیں۔ کیوں یاد ہے کچھ؟''

کیلاش نے مسکرا کر ٹرے ایک طرف کو سرکا دیا۔ اور شیشے کی لمبی گردن کی صراحی اور وہ خوش وضع پیالے میز پر رکھ کر گھنٹی بجا دی۔ کیلاش نے دیوندر کی طرف دیکھا دیوندر نے آرڈر دیا:'' چار انڈوں کا آملیٹ ۔ بھنی ہوئی مچھلی اور تلی ہوئی کلیجی۔''

بادلوں نے گھاٹیوں سے اوپر اٹھنا شروع کیا۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ برف پوش چوٹیاں دھند میں روپوش ہوگئیں۔ ریڈیو پر ستار کی گت بجنے لگی۔

دیوندر نے تین جام پی کر رضائی اتار کر علاحدہ رکھ دی۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے۔ وہ شاعر تھا۔ زندگی کی سہولتیں مہیا تھیں۔ یوں تو بحیثیت ایک بے کار شخص کے بھی اس کو شاعر بننے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ متمول بھی تھا اور پھر شاعر بننے کی اہلیت بھی تھی —— اخلاق اور انصاف کا پابند۔ لیکن کبھی کبھار دل کو دماغ کی حکومت سے آزاد کر دینے میں وہ چنداں ہرج نہ سمجھتا تھا۔ شراب کا ہلکا نشہ اس کے لیے از حد سرور انگیز ہوتا تھا۔ علاوہ بریں اس کے ذہن میں گناہ اور ثواب کا تصور بھی وہ نہیں تھا جو عام لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ انسان کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا جس قدر شدید احساس اس کو تھا شاید ہی کسی کو ہو۔ وہ نیکی میں یقین رکھتا تھا۔ ایک مکمل اور پرامن دنیا میں ایمان رکھتا تھا۔ زندگی میں تعمیری عناصر کو ابھارنا اور اپنی اردگرد کی دنیا کو سنوارنا اور قدم قدم پر پھیلے ہوئے دکھوں کو ہر ممکن طریقہ سے دور کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بنی نوع انسان میں مذہب اور ملک کی حد بندیوں سے وہ متنفر تھا۔ اس کی فکر بلند تھی، ذہن رسا اور دل پرجوش......

وہ کوچ سے اٹھا اور اوور کوٹ کھونٹی پر سے اُتار کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور بغل کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں پر پانی کے قطرے لرزنے لگے کیلاش میز پر طبلہ بجا بجا کر ساون کے نظارے ہیں گا رہا تھا۔

دیوندر نے ہاتھ کے اشارے سے کیلاش کو بلایا۔ دونوں دروازے میں سے گردنیں بڑھا کر دیکھنے لگے۔ سامنے کی عمارت کے بڑھے ہوئے چھجے پر نیچے کی طرف ایک لڑکی کی صورت نظر آئی۔ کیلاش نے آہستہ سے کہا۔ ''حسین!''

''جانتے ہو یہ بھی ڈانسنگ گرلز'' میں سے ایک ہے۔''

''بڑی حسین ہے یار۔''

دیوندر دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کیلاش کرسی پر آن بیٹھا اور بے معنیٰ نظروں سے دیوندر کی طرف دیکھنے لگا جو یک بیک سنجیدہ ہو کر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ پھر وہ ایک لحہ کے لیے دروازے کے آگے پہنچ کر رک گیا۔ '' اس عورت کی چھاتیاں شرمناک طور پر عریاں ہیں۔''

کیلاش خاموشی سے بیٹھا رہا۔ وہ پھر ٹہلنے لگا۔

اتنے میں مینہ بڑے زور شور سے برسنے لگا۔ بڑے صحن کے لوگ اٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ اور فرنیچر کے کھسکنے اور گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد دیوندر نے کہا۔ ''تم شاید اندازہ نہ لگا سکو کہ میں اس وقت کیسے ذہنی کرب میں مبتلا ہوں —— ان عورتوں کا وجود ''انسانیت'' کی توہین ہے۔ یہ اس جہان کی غلاظت ہیں۔''

کیلاش نے بے رخی سے سگریٹ سلگایا۔

دیوندر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ '' اس کمرے پر نگاہ ڈالو۔ ہر چیز میں سلیقہ، کوچ، یہ کرسیاں، یہ پلنگ، یہ میزیں اور پھر صفائی۔ دری ، قالین، فرنیچر سب چیزیں کس

قدر صاف ہیں۔ صرف ایک چیز ایسی ہے جس پر ہم کبھی توجہ نہیں دیتے۔ وہ چیز ہے یہ ردّی کی ٹوکری میز کی بغل میں پھلوں کے چھلکوں، پھٹے پرانے کاغذوں سے پر، کیا اس ٹوکری کا صدقہ نہیں کہ کل کمرہ صاف نظر آتا ہے۔"

کیلاش نے گل جھاڑتے ہوئے کہا۔"ارے یار! کوئی کام کی بات کہو۔"

دیوندر نے مسکرا کر جواب دیا۔" تم اس طرح سوچنے کے عادی نہیں ہو۔ غور کرو۔ بار بار ہم سڑک پر جاتے ہوئے جب سڑک کے کنارے پڑے ہوئے غلاظت سے لبریز ڈھول کے قریب سے گذرتے ہیں تو اس وقت اپنی ناک رومال سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ غلاظت کا وہ ڈھول اس جگہ نہ ہوتا تو وہی غلاظت سڑکوں پر پھیلی نظر آتی...... یہ بھی زندگی کی ایک ٹریجڈی ہے..... ان میں کتنی عورتیں ہیں جنھوں نے یہ پیشہ اپنی خوشی سے اختیار کیا ہوگا۔ وہ بھی تعداد میں کم، ہوں گی جن کو دنیا نے ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا..... ایک پہلو سے دیکھا جائے تو یہ دیویاں ہیں۔ یہ وہ زخم ہیں جن کی بقا کے ہم خواہاں ہیں اور جن کو تازہ رکھنے کے لیے ہم اپنی سیاہ اور پرسکون راتوں کی نیند حرام کرڈالتے ہیں...... دوست اتنا تو تم کو بھی ماننا پڑے گا۔"

کیلاش نے مسکرا کر دھوئیں کے چکّر سے بناتے ہوئے کہا۔" بکے جاؤ۔"

دفعتاً تاریکی سے روشنی میں آنے پر دیوندر کی آنکھیں چندھیاں گئیں۔ کچھ شراب کا نشہ بھی تھا۔ کیوں کہ کیلاش کے ساتھ رات بھیگ جانے تک شراب کا دور چلتا رہا۔ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ اندر داخل ہوئی۔

دیوندر اس کو آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگا۔ عام لوگ اسی کو رنڈی کہہ کر پکارتے تھے۔ نام کس قدر مکروہ تھا۔ حالانکہ صورت کے لحاظ سے وہ دیویوں کو بھی مات کرتی تھی۔ اس نے معصومیت سے ہنس کر کہا۔" آداب عرض! آپ تشریف لے آئے مجھ کو یقین تھا کہ آپ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔"

دیوندر کا جی چاہا کہ وہ بھاگ نکلے۔

''آپ کے ایک اور ساتھی بھی تھے۔ وہ کون صاحب تھے؟''

دیوندر کنواری لڑکی کی طرح شرما گیا اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔'' وہ میرے دوست ہیں۔''

دوست ؟ خوب! وہ کیوں نہیں آئے۔''

''وہ سوئے ہوئے تھے۔''

عورت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

دیوندر کچھ سمجھ کر جھینپ گیا۔'' میں ان سے کہہ کر نہیں آیا۔ بلکہ ان سے چوری آیا ہوں — میں نے آج دوپہر کو جب آپ کو دیکھا......''

''اوہ! یہ بتلانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ شاید آپ بھول رہے ہیں ہمارے پاس بہت لوگ آتے ہیں......''

دیوندر شراب کے نشے میں تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ یہ بات چھپا نہ سکا کہ وہ پیئے تھا۔

جتنی دیر تک وہ خاموش رہا۔ وہ اس کو دیکھتی رہی۔ اسے وہ پسند تھا۔ بہت پسند دیوندر کو اور کچھ نہ سوجھا۔'' .... میں نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔''

عورت یہ سن کر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ وہ ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ اس نے اپنا پیٹ تھام لیا۔ مگر دیوندر بالکل سنجیدہ تھا اور حیران۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ عورت چاہتی تھی کہ جواب دے مگر ہنسی روک نہ سکی۔ بہ مشکل ہنسی روک روک کر بولی۔''اچھا تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔''

دیوندر خود کو بے وقوف محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بات دہرا دی۔'' شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔ میں کنوارا ہوں۔''

عورت نے بہ صد کوشش سنجیدہ بن کر کہا۔'' میں آپ پر یقین کرتی ہوں۔''

دیوندر بغلیں جھانکنے لگا'' میں آپ کے پہلے گاہکوں سے قطعاً مختلف ہوں۔''

عورت نے اس کے حسین خدو خال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔'' میں آپ کی یہ بات بھی تسلیم کرتی ہوں۔ پھر اس نے دِل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اس نوجوان سے ایک دمڑی بھی وصول نہ کرے گی۔

دیوندر نے حوصلہ پاکر بات چھیڑ دی۔''جب میں نے آج شام کے وقت آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی ذات سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔''

عورت نے اس نوعمر چھوکرے کو رحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیا۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ از حد ہمدردی ہے۔''

دیوندر کو عورت کا یہ اندازِ تحکم مارے ڈالتا تھا۔

وہ اپنے خیالات کو یکجا کرنے لگا۔ اس کی سوچنے کی قوت سلب ہوچکی تھی۔ وہ جوشِ اصلاح اور لمبے چوڑے الفاظ غائب ہو رہے تھے۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔'' آپ لوگوں کی زندگی بھی کس قدر پُر الم ہے۔ آپ کا دل تو بہت کڑھتا ہوگا۔''

عورت کے چہرے پر اداسی آگئی۔''آپ درست فرماتے ہیں' آپ جیسے ہمدرد دل رکھنے والے لوگ بہت کم آتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو واسطہ پڑا نہیں۔''

دیوندر نے سوچا کس قدر حسین ہے یہ لڑکی...... بے چاری...... وہ اس کے قریب چلا گیا۔ عورت کچھ آگے کو جھک گئی۔ وہ سمجھا شاید وہ گرنے کو ہے۔ اس نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے سینہ سے لگ گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئی بولی۔''بعض وقت تو ایسے لوگ آتے ہیں کہ ان کی مونچھیں میرے نتھنوں میں گھس جاتی ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔'' پھر اس نے سر اٹھا کر دیوندر کی طرف دیکھا۔

''تم کتنے اچھے ہو۔''

دیوندر کے جسم میں برقی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کے جسم کی قوت مدافعت ختم

ہوتی جارہی تھی۔ نوجوان عورت اس کے ساتھ لپٹی جارہی تھی۔ دیوندر پر دو آتشہ نشہ طاری تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے از حد کوشش کے بعد بچنے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''تم میری ماں ہو۔''

عورت نے اس کے رخسار پر رخسار رکھ دیا۔ ''معلوم ہوتا ہے ۔ زیادہ پی گئے ہو۔''

وہ اس کو سہارا دے کر پلنگ پر لے گئی۔

دیوندر کے دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے وہ بادلوں میں اڑا جارہا ہو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہ سکتا تھا۔ وہ خلا میں بے بسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اب بھی اگر وہ کوشش کرے تو وہ کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ یاد کرنے لگا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا۔

''تم دیوی ہو۔''

عورت ہنس پڑی۔ اس کے رس بھرے ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ذرا اور قریب آجاؤ......تم دیوتا ہو۔''

عورت نیچے تک اس کو رخصت کرنے کے لیے آئی۔ اس نے از حد محبت اور خلوص سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اوور کوٹ کے بٹن بند کیے۔ اس کا بٹوا جو پلنگ پر گر پڑا تھا۔ اس کی اندر کی جیب میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''بٹوا سب سے اندر کی جیب میں سنبھال کر رکھ لو۔ یہ بدمعاشوں کا محلہ ہے۔ سنبھل کر جانا۔ رستہ میں کوئی نکال نہ لے۔''

یہ کہہ کر اس نے سکوت کیا۔ پھر مسکرا کر اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا دیئے......

اچھا اب رخصت، کوٹ کے کالر دہرے کر کے سینہ ڈھانپ لو کہیں سردی نہ کھا جانا۔''

دیوندر لرزاں ہاتھوں سے کالر ٹٹولنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے کالر دہرے کر دیئے۔ اس کے رخسار پر ہلکا سا چپت جماتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل لڑکے ہو — تبھی تو اتنے پیارے لگتے ہو۔''

صبح جب دیوندر کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا کہ کیلاش چائے پی رہا ہے۔

وہ کاشمیری چادر لپیٹتے ہوئے اٹھا۔ اور بغل والے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تیز اور چمک دار دھوپ میں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں' برف سے لدے ہوئے درخت، اور برف سے اٹی ہوئی چھتیں چمک رہی تھیں۔ رکشا کے اڈے پر قلی بغلوں میں ہاتھ دبائے کھڑے تھے۔

دیوندر نے یہ پر کیف منظر دیکھ کر پاؤں پھیلا کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور گہری سانس لی۔

آہستہ آہستہ رات کے واقعات یاد آنے لگے۔ اس کے ذہن میں ایسی کشمکش شروع ہوگئی۔ جیسے وہ کسی بھولے بھٹکے خواب کو یاد کرنے کی کوشش میں ہو۔

اس نے گردن بڑھا کر نیچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے وہ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ بال الجھے ہوئے ۔ کپڑے بے ترتیب۔ کاجل آنکھوں کے اردگرد پھیلا ہوا۔ کل کی طرح نیم عریاں سینہ......

اتنے میں عورت نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دل فریب انداز سے مسکرا کر بڑے ناز کے ساتھ لمبا کش کھینچا اور آنکھ مار کر دھواں ناک کے رستہ اڑا دیا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''تار و پود'' میں شامل ہے۔

کمپوزیشن ٹیچر

پرشوتم نے ایک مرتبہ پھر چونک کر آنکھیں کھول دیں چلچلاتی دھوپ پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک' جیسے اس کے سر پر ہتھوڑے کی ضربیں لگائی جارہی ہوں...... کتنی دیر سے ایسا ہو رہا تھا۔ پہلے تو اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ میں ان گنت ڈورے یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہے ہوں۔ پھر جیسے یکلخت کسی مضبوط کمان کی تانت ٹوٹ جائے۔ اور کمان کے دوسرے سرے پوری قوت کے ساتھ اس کے دماغ کے اندر سیدھے ہو جائیں۔ اس کا دماغ بھنا جاتا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگتیں۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اسی طرح ہوا۔ ابھی ابھی وہ بخار سے اٹھا تھا۔ کھچڑی کھاتا تھا اور روٹی سے پرہیز۔ دماغ میں کونین کی خشکی تھی...... اس نے کروٹ بدلی۔ اور تکیے سے لپٹ کر وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی سارے جسم پر مرہم مل کر' روئی لپیٹ دے۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ اگر اس کی نیند سورج نکلنے سے پہلے کھل جاتی تو وہ فرحت محسوس کرتا۔ لیکن دھوپ نکل آنے کے سبب اس کے دل کو کس قدر کوفت ہو رہی تھی۔ دن کی روشنی سے آنکھ ملانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب نیند کیا تھی بس ایک غنودگی سی تھی۔ دماغ کمزور' دل میں دھڑکن، جسم تکان زدہ...... اس نے پھر گنتی شروع کر دی۔

ہزاروں ، لاکھوں، اربوں، کھربوں تک ...... اور پھر بوجھ ہی بوجھ، بادل ہی بادل، کالے، بھدّے، بے کنار، بے شمار، ٹھوس، سیاہ پہاڑوں کی طرح، بڑھتے ہوئے اچکتے ہوئے، وہ آنکھ کھولنا چاہتا تھا لیکن آنکھ نہیں کھلتی۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ کروٹ بدلنا چاہتا تھا۔ لیکن جنبش نہ کرسکتا تھا۔ پھر دماغ میں ڈورے ٹوٹتے ہیں آخر کمان کی تانت تڑاق سے ٹوٹ جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگتی ہیں۔ وہ پپوٹوں کو جھپکنے لگتا ہے اس نے آنکھیں کھولے رکھیں۔ اگرچہ بستر میں سے نکلنا تکلیف دہ تھا لیکن اس قسم کی نیند اور بھی اذیت رساں تھی وہ اٹھ بیٹھا اور پھر پاؤں لٹکا کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی لرزتی ہوئی اُنگلیوں سے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

آج سے دس ماہ پیش تر تک اس کا بڑا بھائی اس کا کفیل تھا۔ ہر چند وہ اس بات کے لیے اپنے بھائی کا شکر گذار تھا کہ اس نے اسے بی اے تک تعلیم دلوائی لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ اس کے بھائی نے اپنا احسان جتلانے میں کبھی سنجیدگی سے کام نہیں لیا۔ جب کبھی کتابوں، یا فیس وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو اس کا بھائی فوراً کہتا۔ آج کل تو مٹھیاں بھر بھر روپے دے ہیں۔ دیکھیں اب ہمارے بھیا مٹھیاں بھر کر واپس کب لاتے ہیں۔ امتحان کے قریب وہ بیمار پڑ گیا تھا۔ پرچے اچھے نہ ہوئے تھے اسے خوف تھا کہ وہ فیل نہ ہوجائے۔ لیکن پرماتما کا ہزار ہزار شکر کہ بے چارا پاس ہوگیا ورنہ بقول شخصے۔ ''بی اے پلکڈ'' ہو کر رہ جاتا۔ اور پھر عمر بھر بی اے پاس کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے پر اس کا ان پڑھ بھائی حقہ تازہ کر کے گلی والے دروازے میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ آتے جاتے لوگ مبارک دیتے تو وہ ان کو چارپائی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا۔ اور پھر ان مشکلات کا ذکر کرتا جو عام طور پر بی اے تک پڑھانے میں پیش آسکتی ہیں۔ پھر وہ اپنے نجی حالات کا نقشہ کھینچنا شروع کرتا۔ ''پرماتما کا دیا سب کچھ ہے۔ لیکن چودھری سوچونا! میں بال بچے دار آدمی اور یہ لڑکیاں ابھی بچیاں ہیں، لیکن تم جانو ان کو بڑھتے کیا دیر لگتی ہے' اور پھر بھائی! برادری میں ملنا جلنا دکھ سکھ، بھائی ایشور جانتا ہے۔ ہم سے جو بن پڑا کیا۔ پرشوتم نے ایک کارڈ

لکھ دیا شہر سے اتا روپیہ فوراً بھیجو۔ منی آرڈر کردو — چودھری جی! یہاں بھائی موجود تھا نا!..... اب لاکھ لاکھ شکر پر ماتما کا ۔ پاس ہوگیا بی اے ہم تو سرکھ رو ہوگئے ۔ دیکھیں اب ہمیں یاد بھی رکھتا ہے یا نہیں۔''

بی اے پاس کرنے کے بعد اس کا گھر میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ نوکری کا مطالبہ ہونے لگا۔ چنانچہ وہ پریشانی میں گھر سے نکل آیا۔ لیکن گاؤں سے خط پر خط چلے آتے تھے کہ نوکری ملی یا نہیں۔ اگر ملی تو کیا تنخواہ مقرر ہوئی...... اور ہاں پچھلوں کا بھی خیال رکھنا۔ پہلے تو وہ ایک ٹھیکیدار کے پاس کلرک ہوا۔ لیکن وہاں اس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ آخر اس کو استعفیٰ دینا پڑا۔ پھر ایک فرم میں نوکری ملی۔ صبح سات بجے سے غروب آفتاب تک کام کرنا۔ تنخواہ چالیس روپے ۔ لیکن عمر عزیز اس طرح گنوانے کی بجائے اس نے نوکری چھوڑ دی۔ پھر اپنے پرانے دوست کے ہاں دن کاٹنے لگا۔ وہ دوست اس کی قابلیت کا معترف تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ اور اب ایم اے کا طالب علم — موسم خراب تھا۔ وہ ملیریا میں مبتلا ہوگیا ۔ ساتھ آٹھ دن چارپائی پر پڑے پڑے گذار دیئے۔ بخار اُترا ہی تھا کہ اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا۔ مقامی ہائی اسکول میں کمپوزیشن ٹیچروں کی ضرورت تھی۔ وہ کمزوری کی وجہ سے جا نہ سکا۔ لیکن اس نے عرضی بھیج دی۔ آج اس کا خیال تھا کہ وہ ہیڈ ماسٹر کو ملے۔

وہ دبلا پتلا، تندروں کی روٹیوں پر پلا ہوا زرد رو نوجوان تھا۔ بخار نے رہی سہی صحت بھی برباد کر دی تھی۔ خیر اس نے منہ ہاتھ دھوکر۔ پہلے کا سلا ہوا ایک سوٹ نکالا۔ ٹائی لگائی۔ ہیڈ ماسٹر کے ہاں پہنچ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ہیڈ ماسٹر نے اندر بلوایا۔ اس نے بتایا کہ بیماری کے سبب حاضر خدمت نہیں ہوسکا۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہیڈ ماسٹر نے اسے دوسرے دن اسکول میں بلوا لیا۔ وہ خوش تھا۔ واپس آیا۔ کپڑے اُتار کر آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ اب اس کو اطمینان تھا۔ دوست کے ہاں بے کار پڑے روٹیاں کھاتے۔ اس کو شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کم از کم کچھ تو سہارا ملا۔

دوسرے دن جب وہ دس بجے کے قریب ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں پہنچا۔ تو ہیڈ ماسٹر نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کو پچاس روپے دے سکیں گے۔ اگر آپ ٹرینڈ ہوتے تو کچھ زیادہ مل سکتا تھا — یہ دیکھیے ان صاحب کو بھی ہم آپ کے برابر تنخواہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی گریجویٹ ہیں۔" پرشوتم نے تنخواہ منظور کر لی۔ اب چپراسی نے کمپوزیشن سٹاف کا کمرہ بتا دیا۔ ہیڈ کلرک کے کمرے کے اوپر یہ کمرہ تھا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو شیروانی پہنے سر پر بڑا سا پگڑ باندھے ایک حضرت کھڑے تھے اس نے قریب جا کر پوچھا۔ "کیوں جناب! آپ ہی مسٹر رام سہائے گوہل ہیں؟"

"جی ہاں۔" پرشوتم نے کوٹ کی شکن درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے اسٹاف میں ابھی ابھی شامل ہوا ہوں۔" کمپوزیشن اسٹاف کے ہیڈ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی۔ آپ سے مل کر۔ قدرے توقف کے بعد بولے۔ "اچھا آپ تشریف رکھئے۔ میرا ایک پریڈ (Period) ہے۔

مسٹر گوہل کی صورت دیکھ کر پرشوتم کے دل کو ایک گونا تسکین سی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا۔ کم از کم یہاں سب لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اگر تنخواہ زیادہ نہیں تو کام بھی زیادہ نہیں اور پھر سب لوگ مہذب طریقے سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں کام کرنے پر انسان بے عزتی محسوس نہیں کرتا۔ پھر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ خوب بڑا سا کمرہ تھا ایک بھاری اور لمبی میز کمرے کے درمیان میں رکھی گئی تھی۔ یہ میز پنگ پانگ کھیلنے کی میز کی مانند تھی۔ میز کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ لکڑی کی بڑی الماری تھی۔ اس میں کئی خانے تھے جن میں غالباً لڑکوں کی کاپیاں رکھی جاتی تھیں۔ خانوں کے اوپر جماعت اور سیکشن درج تھے۔ کمرہ خوب ہوادار تھا۔ ایک تو دوسری منزل پر تھا اور دوسرے کئی دروازے اور کھڑکیاں بھی تھیں۔ اتنے میں باہر میدان میں سکول کے لڑکوں کی پرارتھنا شروع ہوئی۔

ہم بالکوں کی اور بھی بھگوان تیرا دھیان ہو۔

چار لڑکے گیت کے بول مترنم آواز میں بولتے۔ ان کے پیچھے سب لڑکے گاتے۔
پرشوتم کو اپنے اسکول کے دن یاد آگئے اور بڑی پر لطف بات یہ تھی کہ وہ اس اسکول میں بھی کچھ عرصہ پڑھ چکا تھا۔ اس کو یہاں کی ہر شے اچھی طرح سے یاد تھی۔ ان دنوں بھی وہ اسی قسم کے گیت گایا کرتے تھے۔ آج وہ اسی اسکول میں ٹیچر بن کر آیا تھا۔ اب لڑکے اس کو نمستے کیا کریں گے۔ اس کو معلوم تھا کہ کمپوزیشن سٹاف کو لڑکوں سے براہ راست واسطہ نہیں پڑتا۔ سوائے ہیڈ کے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ کیوں کہ اس نے لڑکوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ لڑکوں کو قابو میں رکھتے ہوئے۔ ان کا بہترین استاد ثابت ہوسکتا تھا۔
پرارتھنا گانے والے پہلے چار لڑکوں کی مجموعی آواز بہت صاف اور دل کش تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اتنے میں اسے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ سبز رنگ کا چار خانوں والا کوٹ پہنے ہوئے، پتلون کی جیب میں ہاتھ ٹھونسے، آنکھوں پر چشمہ لگائے ایک حضرت اندر آئے اور بڑی میز کا سہارا لے کر کھڑے ہوگئے۔ قدرے سکوت کے بعد سنجیدہ لہجہ میں بولے۔ ’’ کیوں جناب آپ کمپوزیشن اسٹاف میں شامل ہوئے ہیں۔‘‘ — ’’ جی ہاں۔‘‘ وہ خفیف طور پر مسکرائے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ پھر اِدھر اُدھر کے سوالات پوچھتے رہے۔ میں بھی کمپوزیشن اسٹاف میں ہوں۔ میرا نام گوبند کمار چوپڑا ہے...... دیکھیے نا! مسٹر پرشوتم! اس جگہ کام مشکل نہیں۔ کام نہ صرف تھوڑا ہے بلکہ آسان بھی۔ اس لیے ایک نوجوان کو اپنی ساری قوتیں اس جگہ خرچ نہ کردینی چاہئیں۔ آپ سمجھے نا! میرا جو مطلب ہے یعنی کہ یہ کام کسی محنتی نوجوان کی شان کے شایاں نہیں ۔ یہ عارضی کام ہونا چاہیے۔ ہمارے اسٹاف کے ہیڈ — مسٹر گوہل! آپ ملے نہیں ان سے ؟ — جی ہاں بڑے شریف آدمی ہیں یعنی انہیں کی شرافت کی وجہ سے ہم لوگ یہاں پڑے ہوئے ہیں......‘‘

اتنے میں ایک کالا شخص اندر داخل ہوا۔ یوں تو سارے ہندوستانی کالے آدمی ہیں۔ لیکن وہ کالے آدمیوں میں بھی کالا آدمی تھا۔ اس کے دانت ذرا آگے کو نکلے ہوئے اور ٹیڑھے میڑھے سے داڑھی مونچھ صفا۔ اس کے باوجود چہرہ اس کے دلی جذبات چھپائے رکھنے میں سو فیصدی کامیاب تھا۔ ''یہ ہیں ہمارے...... کیا کہوں میں کو ورکر' کیا میں درست ہوں؟...... دیوان جسونت لعل...... دیوان صاحب ! ان سے ملیے ۔ یہ ہیں مسٹر پرشوتم داس...... نوگرفتار...... میری بے تکلفی، معاف فرمایئے گا ۔ ہم ...... آخر ہم لوگ اب ساتھی ہیں......''

کمپوزیشن اسٹاف روم (کمرے) کی فضا کالج کے ہوسٹل کی سی تھی۔ یعنی مکمل آزادی۔ مسٹر گوہل کی موجودگی سے بھی فضا ویسی ہی رہتی لیکن ان کی غیر حاضری میں تو سبھی لڑکوں کی طرح کھل کھیلتے۔ ان میں زیادہ تعداد بھی انہیں لوگوں کی تھی جو ابھی ابھی کالجوں سے نکلے تھے۔ صرف ایک صاحب عمر رسیدہ تھے۔ مسٹر نندہ! ان کو سب ہیڈ ماسٹر صاحب کہتے تھے۔ ان کو کئی طریقوں سے بنایا جاتا۔ سادہ لوح شخص تھے۔ فوراً جھانسے میں آجاتے کبھی کسی مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ بس اب ان کو ہیڈ ماسٹر کا لقب عطا کر دیا گیا۔

مسٹر گوہل کے علاوہ اسٹاف میں چھ اشخاص اور تھے۔ گوبند کمار' دیوان صاحب' ہیڈ ماسٹر صاحب' بال کرشن سریواستوا، مسٹر بھاٹیہ اور چھٹا وہ خود سریواستوا ابھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ہر وقت لڑکوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ چنانچہ اگرچہ وہ شادی شدہ لیکن بڑا چونچال اور کھلنڈر رہ تھا۔ مسٹر بھاٹیہ ایک عجب شے تھے۔ آم کی گٹھلی کی طرح ان کا سر تھا۔ بالوں کی حالت بھی عجیب تھی۔ آگے کو گھرے ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے وہ کئی فنون میں تاک تھے۔ ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ علم موسیقی سے بھی کچھ دلچسپی تھی۔ فلسفہ سے بھی شغف تھا۔ روحانیت میں بھی دخل تھا۔ یوگ آسن بھی کر لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ ایک وقت میں دس سیر پانی پی کر فوراً منہ کے رستہ خارج کر سکتے ہیں۔

دن بھر میں تقریباً تیس چالیس کاپیاں درست کرنی پڑتی تھیں۔ ہر شخص کو علاحدہ علاحدہ سیکشن ملے ہوئے تھے۔ کام اگرچہ خشک تھا لیکن اس قدر سخت نہ تھا۔ دوسرے ہنسی مذاق اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ کام کا پتہ نہ چلتا تھا۔ نشست و برخاست کی بھی کچھ پابندی نہ تھی۔ جب چاہو اُٹھ کر چل دو۔ لائبریری تک گھوم آؤ یا ٹک شاپ (Tuck Shop) میں جاکر کچھ کھا پی آؤ۔ پوری ، گلاب جامن، قلا قند، لسی، چائے وغیرہ مل سکتی تھی۔ یوں تو ٹک شاپ بڑے اہتمام سے تیار کی گئی تھی۔ دروازوں پر جالی، کھڑکیوں اور روشن دانوں پر بھی لوہے کی جالی منڈھی ہوئی لیکن اندر بے شمار مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جالی اس لیے نہیں لگائی گئی تھی کہ باہر کی مکھیاں اندر نہ آئیں بلکہ اس لیے کہ اندر کی مکھیاں باہر نہ جاسکیں۔

کبھی کبھی جب مسٹر گوہل کی کلاس ہوتی تو ان کی غیر موجودگی میں کھانے پینے کا سامان کمرے میں ہی منگوا لیا جاتا۔ درحقیقت اک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق...... ہنسی مذاق میں سب سے بڑھ کر گوبند کمار حصہ لیتے تھے۔ بلکہ انہیں کے دم سے ساری چہل پہل تھی۔ وہ دلیل بازی خوب کر لیتے تھے ٹھٹھول بھی طفلانہ ہوتے تھے۔ سب لوگ اس بات کو بخوبی محسوس کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہنستے جاتے تھے گوبند کمار کے ساتھ دیوان صاحب کا جوڑ تھا۔ دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دوسرے پر آوازے بھی کستے تھے۔ وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی اپنے مذاق کا نشانہ بناتے تھے۔ ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ مسٹر گوبند کمار ہنس کر بولے۔ بھئی ہم تو ہیڈ ماسٹر صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دیوان صاحب بولے۔ ارے بھائی تمہارے ہاتھوں کسی کی پگڑی محفوظ نہیں۔ اس بات پر تکرار ہوئی۔ لیکن کم از کم ہیڈ ماسٹر صاحب کو ہم بزرگ سمجھتے ہیں۔ اور تہ دل سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ دیوان صاحب بولے۔ مثلاً کہو نا، کس قسم کا ادب؟ مسٹر گوبند کمار بولے مثلاً آپ کچھ ہی سمجھ لیں۔

دیوان صاحب نے کہا سمجھ کیسے لیں۔ تم منہ سے کہو دراصل دیوان صاحب اس

کے منہ سے کچھ کہلوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ گوبند کمار نے سب کی طرف شرارت اور شوخی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مثلاً گرز بھگوان یعنی میرا مطلب ہے جیسے ہم ہندو گرز بھگوان کی عزت کرتے ہیں...... اس بات پر سب لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہوگئے۔ دراصل ہیڈ ماسٹر صاحب کی صورت بھی اس پرندے سے ملتی جلتی تھی۔ ان کی بڑی سی مڑی ہوئی ناک گرڑ کی چونچ سے مشابہت رکھتی تھی...... ان کی سنجیدگی اور گرڑ کی خاموشی ایک سی چیزیں تھیں...... چنانچہ باوجودیکہ ہیڈ ماسٹر صاحب زود رنج شخص نہ تھے اس بات پر بگڑ گئے۔ گوبند کمار کو نصیحت فرمانے لگے کہ بزرگوں کی عزت کا کچھ پاس تو ہونا چاہئے —
اس کے بعد دوسرے دن سے یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مسٹر گوبند کمار اپنے کیے پر اس قدر پشیمان ہیں کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی طرح فاقہ کرنا شروع کردیا ہے......
ان دنوں مسٹر گوبند کمار کی صورت بھی کچھ اتری ہوئی سی تھی۔ اب بے چارے ہیڈ ماسٹر صاحب ان کی خوشامد کرنے لگے کہ آپ برت توڑ دیجئے اس وقت خصوصاً بہت لطف آتا جب وہ چپکے سے گلاب جامن منہ میں رکھ کر کہتے......'' نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب! جب تک آپ مجھے سچے دل سے معاف نہ کردیں گے۔ میں برت نہیں توڑوں گا۔'' —
دیوان صاحب کہتے ۔'' بھئی اب توڑ ڈالو برت...... ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار ہیں۔ غلطی ہوگئی ان سے ...... انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے کیوں ہیڈ ماسٹر؟''
بے چارے ہیڈ ماسٹر نے تسلیم کر لیا کہ غلطی دراصل ان ہی کی تھی۔ دیوان صاحب نے لقمہ دیا۔'' بھئی گوبند کمار! کیوں اپنا خون خشک کر رہے ہو...... اب تو ہیڈ ماسٹر صاحب ٹک شاپ میں تم کو کچھ کھلانے کو بھی تیار ہیں۔'' ہیڈ ماسٹر اس بات پر بھی آمادہ ہوگئے اس دوران میں سب آستینوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنستے۔ ان کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی جیب خالی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

پرشوتم کے پہلے چند دن اچھے گزر گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس ہنسی مذاق کے پس

پردہ جو بے بسی تھی اس کا احساس ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسکول کے دوسرے ٹیچر کمپوزیشن ٹیچروں سے بات کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ کبھی کسی کمپوزیشن ٹیچر سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرتے۔ خالی گھنٹوں میں بڑی رعونت سے لان میں کرسیوں پر بیٹھے آپس میں گپ ہانکتے۔ یوں ہی چلتے پھرتے کبھی مل جائیں تو اس بات کی توقع رکھتے کہ کمپوزیشن ٹیچر ان کو سلام کریں گے۔ ایک دن پرشوتم کے پندار کو سخت دھکا لگا۔ جب اس نے ایک لڑکے کی کاپی پر لکھا۔ بہت عمدہ۔ اس پر بے ہودہ کلاس ٹیچر نے ایک اور لڑکے کے ہاتھ وہ کاپی واپس بھیج دی۔ اور کہلا بھیجا کہ یہ بتائیں کہ اس لڑکے کے مضمون میں کیا خوبی ہے جو اس کے نیچے'' بہت عمدہ لکھ گیا ہے۔ اس پر اسے بہت طیش آیا۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

یہی نہیں بلکہ اسکول والے کمپوزیشن اسٹاف کو یوں ہی سا سمجھتے تھے۔ انہیں طویل چھٹیوں کی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ اپنے کام کے علاوہ بھی اسکول کا کوئی فالتو کام ہوتا تو وہ کمپوزیشن ٹیچروں کو کرنا پڑتا۔ اگر کسی جماعت کا امتحان ہوتا تو کمپوزیشن ٹیچر کی ڈیوٹی لگا دی جاتی کہ وہ لڑکوں کی دیکھ بھال کرے۔ یا شہر کے کسی برانچ اسکول میں اگر کوئی ٹیچر کسی دن غیر حاضر ہوتا تو کمپوزیشن اسٹاف میں سے کسی کو بھیج دیا جاتا۔ بے چارے کمپوزیشن ٹیچر جوتیاں چٹخاتے جاتے۔ سارا دن ان سے بے گار لی جاتی۔

کمپوزیشن ٹیچروں کی لڑکوں کے دلوں میں بھی کچھ عزت نہ تھی۔ کلاس ٹیچر اپنی جماعت کے لڑکوں کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ دیتے جس سے ان لڑکوں کو اپنے کلاس ٹیچروں کی برتری کا احساس ہو اور کمپوزیشن ٹیچر ان کی نظروں سے گر جائیں۔ کمپوزیشن ٹیچر کو کسی دن کی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اگر وہ ایک آدھ چھٹی لینے پر مجبور بھی ہوتو اس کی عرضی ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچنا لازمی تھی اس کے باوجود چھٹیوں کے دنوں کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک نیا آڈر جاری کیا گیا۔ اس کی رو سے کوئی کمپوزیشن ٹیچر اسکول کے وقت میں، اسکول کی حدود سے باہر نہ جاسکتا تھا۔ اس کے

محرک بھی کلاس ٹیچر تھے۔ کیوں کہ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ اسکول ٹائم میں اسکول سے باہر نہ جاسکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے دباؤ ڈالا کہ کمپوزیشن اسٹاف کی یہ رعایت جبراً روک دی جائے جس دن یہ آڈر نکلا۔ کمپوزیشن اسٹاف میں کافی لے دے ہوئی۔ لیکن یہ کھچڑی اندر ہی اندر پک کر رہ گئی۔

کلاس ٹیچر' کمپوزیشن ٹیچروں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی سبب نہ بھی ہو تو وہ پیدا کر لیتے۔ سینکڑوں کاپیوں میں سے ایک آدھ غلطی درست ہونے سے رہ جاتی تو فوراً اتنی سی بات کا پراپیگنڈا شروع کر دیتے اگر زیادہ غلطیاں نکالی جاتیں تو اعتراض کرتے کہ اتنی غلطیاں نکالنے سے کیا فائدہ؟ لڑکے نہ اتنی غلطیوں پر غور کرتے ہیں نہ ان کو اس قسم کی درستی سے کچھ فیض ہی پہنچتا ہے اور اگر غلطیاں کم نکالی جاتیں تو پھر کہتے صاحب! بڑے ست ہیں۔ یہ کمپوزیشن ٹیچر مفت کی کھاتے ہیں۔ غلطیاں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ آخر کاپیاں دیکھنے سے فائدہ ہی کیا۔ اگر غلطیاں جوں کی توں موجود رہنے دی جائیں۔

پرشوتم نے ''ضرورت'' کے اشتہار از سرِ نو دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس کا دل اس جگہ سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں میں رہ کر وہ خوشی کے دن بسر کرے گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ نام نہاد تعلیم یافتہ ان پڑھوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ ان کے ہتھیار زیادہ اوچھے ہیں۔

ایک مرتبہ اس نے ایک کاپی میں بے شمار غلطیاں دیکھیں۔ اس نے مسٹر گوہل سے کہا۔ جناب اس کاپی میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ اس کو درست کرنے کے معنی تو یہ ہیں کہ از سرِ نو ایک مضمون لکھ دیا جائے۔ گوہل صاحب بظاہر تو یوں دکھائی دیتے تھے۔ جیسے ان کے منہ میں دانت ہی نہیں ہیں لیکن جب ہنستے تو یہ بڑے بڑے دانت نمایاں ہوجاتے۔ چنانچہ آپ ہنس پڑے۔ ارے صاحب! کیے جایئے۔ اگر ایسے لڑکے نہ ہوں تو ہم آپ کو کون رہنے دے یہاں پر۔ انہیں کی تو کمائی کھاتے ہیں دو ایک نے اور

ہاں میں ہاں ملائی۔ پرشوتم کے دل میں یہ بات ترازو ہو کر رہ گئی پیٹ بھرنے کا مسئلہ جس قدر سیدھا سادا تھا ان اشراف المخلوقات کے بچوں نے اسی قدر زیادہ دشوار اور پے چیدہ بنا دیا تھا۔ اس دن وہ دیر تک دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

دسویں جماعت کے سالانہ امتحان قریب آرہے تھے۔ لڑکوں کے فارم وغیرہ بھیجنے کا کام تھا۔ اس کے لیے سوائے کمپوزیشن ٹیچروں کے اور کون موزوں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انہیں کے سپرد کیا گیا۔ سارا کام معمول کے کام کے علاوہ یہ بیگار بھی انہیں کے حصہ آئی۔ ہیڈ کلرک بھی آن بیٹھتا کچھ ہاتھ بٹاتا کچھ جلی کٹی سناتا۔ اس کی صورت منحوس اور بات چیت ہمیشہ گستاخانہ ہوتی تھی۔ بھاٹیہ' مسٹر گوہل اور پرشوتم ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ فارموں کے اندراجات رجسٹر میں نقل کیے جارہے تھے۔ ہیڈ کلرک باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ ''ارے صاحب! اب تو کمپوزیشن ٹیچر مزا کرتے ہیں مزا۔ جب دیکھو ادھر اُدھر مٹر گشت کرتے پھرتے ہیں۔ جب جی چاہا اسکول آگئے۔ جب دل چاہا گھر کو چل کھڑے ہوئے۔ پہلے ان سے بہت سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر کلاس سے خود کاپیاں لاتے تھے۔ اور درستی کے بعد خود کلاسوں میں جاجا کر کاپیاں بانٹتے تھے۔ اور اگر ذرا سی غلطی ہوجاتی تو فوراً جواب طلبی ہوتی...... اور صاحب اب؟......''

جب ہیڈ کلرک اس طرح بک رہا تھا پرشوتم کا خون کھولنے لگا۔

ایک دن کمپوزیشن اسٹاف کے ٹیچر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اتنے میں چپراسی کاغذ کا پرزہ لے کر آیا۔ مسٹر گوہل چند لمحوں تک اسے دیکھتے رہے پھر چپراسی کے چلے جانے کے بعد آپ نے یکایک دانت نکال دیئے۔

کیوں جناب کیا بات تھی۔ نیا آرڈر تھا۔

ہاں نیا آرڈر — آپ کو معلوم ہے کہ دسویں جماعت کے لڑکوں کے امتحانات نزدیک آرہے ہیں۔ اس لیے کمزور طلبا کی جماعت شام کو ہوا کرے گی۔ اب چھٹی پانچ

کے بجائے ساڑھے چھ بجے ہوا کرے گی۔ آپ لوگوں میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی لگا دی جائے گی۔ نوٹ کرلیں۔''

کیوں جناب یہ زائد کام کس سلسلے میں لیا جائے گا۔ کیا ہم کو تنخواہ بھی زیادہ ملے گی۔

نہیں صاحب! تنخواہ ونخواہ وہی پرانی ہوگی۔

تو یہ زائد کام کیوں؟

یہ ہیڈ ماسٹر سے پوچھئے۔

اس پر ہنگامہ پیدا ہوا۔ خوب بحث ہوئی۔ زور شور سے احتجاج کیا گیا۔ لیکن صرف کمرے کے اندر اور اس لہجے میں کہ آواز باہر نہ جائے۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ' تار و پود' میں شامل ہے۔

جنگل میں منگل

موسم سرما کی صبح۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی کہرے میں چھپا ہوا تھا۔

وہ کس قدر خوش تھی۔ زندگی میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں۔ یوں تو ہفتہ بھر سے گھر میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ خوب چہل پہل تھی۔ لیکن کل شام کیپٹن جاوید کی آمد تو گویا سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔

پہلے پہل جب اس نے سنا کہ اس کے چچا زاد بھائی سے اس کی بابت بات چیت ہو رہی ہے۔ اس وقت نہ تو وہ خوش تھی اور نہ مایوس۔ آخر شادی تو کسی نہ کسی سے ہونی ہی تھی۔ جاوید کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلتی رہی تھی۔ کیا بہ لحاظ صورت کیا بہ لحاظ عادات وہ ایک معمولی لڑکا تھا۔ لیکن اب کنگز کمیشن لے کر وہ لفٹنٹ بنا تو اس نے اپنا فوٹو بھیجا۔ افوہ! چار برس کے قلیل عرصہ میں وہ کس قدر بدل گیا تھا۔ اب تو وہ اچھا خاصہ حسین نظر آتا تھا۔ جسم بھی بھر گیا تھا۔ کاندھے چوڑے۔ سینہ ابھرا ہوا۔ گردن خوب اکڑی ہوئی۔ فوٹو میں وہ سنجیدہ اور متین شخص نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ اچھا خاصہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ یہ خواہ مخواہ کی اینٹھ ذوقِ سلیم پر گراں ضرور گذرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود فوٹو دیکھتے ہی وہ اس کی تسبیح پڑھنے لگی۔ کل شام جب جاوید کیپٹن بن کر چھٹیوں کے چند دن گذارنے کے لیے ان کے ہاں پہنچا تو وہ اس کو ڈرائنگ ہال کی کھڑکی میں سے دیکھتی رہی تھی۔

موٹر پورچ میں آ کر رکا۔ اندر سے کیپٹن جاوید ہاتھ میں بید لیے برآمد ہوئے۔ آنکھوں پر ہلکے سیاہ رنگ کا چشمہ بغل میں ٹوپی پاؤں میں کچر مچر بولنے والے بوٹ ٹھاٹھ سا ٹھاٹھ تھا...... آتے " ہلو شمی!" ...... سب دم بخود کیپٹن صاحب کے سامنے کون دم مار سکتا تھا۔

بعد میں ماں نے ہدایت کردی بیٹی! زیادہ شرمانے کی ضرورت نہیں۔ انگریز لوگوں میں رہتا ہے یوں چھوئی موئی سی بنی رہو گی تو برا مان جائے گا...... اور بھئی! بڑا آدمی ہے اب موم کی ناک کی طرح جدھر گھمائے گھوم جاؤ قیاس سے معلوم ہوتا ہے تمہاری ہی جانچ پڑتال کرنے آیا ہے۔

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا...... کیپٹن جاوید بات بات میں " بھئی شمی" کا استعمال فرماتے ہیں اور بی شمی چون و چرا حکم بجا لاتی ہے۔ باتوں کا مسکرا کر جواب دیتی ہے۔ تولیہ بڑھاتی ہے' سونے کے کمرے تک چھوڑ آتی ہے۔ اپنے ہابی (مشغلے) بتاتی ہے اوہ وہ کس قدر خوش تھی!!

وہ باورچی خانے میں کھڑی گھر والوں کی باتوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ آج سبھی جلدی سے اٹھ بیٹھے تھے پکنک پر جانے کا پروگرام تھا۔ تین چار میل پر گندھک کے پانی کا چشمہ تھا۔ بڑی پر فضا جگہ تھی ایک اونچا آب شار' قریب ہی ایک شوریدہ سر نالہ وہاں کئی لوگ جایا کرتے تھے بعض تفریح کے لیے بعض علاج کی غرض سے رستہ بھی پہاڑی تھا۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی' پہاڑی نالوں' ڈھلوانوں، کھڈوں' اور کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی اور پھر سب مہمانوں'...... خصوصاً کیپٹن جاوید کے ساتھ پکنک کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

شمی کے لبوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ اس نے توے پر گھی ڈال کر پراٹھا الٹا دیا۔ ابھی نوکر سو کر بھی نہ اٹھے تھے بے چارہ پہاڑی لڑکا برآمدے میں پڑا تھا۔ اس کو جگایا۔ دونوں نے مل کر سب مہمانوں کو چائے پلائی۔ رات بھی دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ صبح مرغ نے بانگ بھی نہ دی تھی کہ چچا رفیع یوں ہی باہر نکلے' شمی کی ماں کے کھانسنے کی آوازیں سن کر ادھر چلے آئے۔ اماں نے شمی کو بھی جگا دیا۔ اس کے بعد اس کی بوا' دادی اماں' پھوپھا ڈاکٹر منظور' ایک دور کے رشتہ دار حامد ریٹائرڈ پی سی۔ ایس ......

غرض بچوں سمیت سبھی جاگ اٹھے۔ البتہ کیپٹن جاوید اپنے کمرے میں پڑے سوتے رہے...... بجلی کی روشنی میں، سب لوگ رضایاں لپیٹ، بستروں میں ہی گھس کر بیٹھ گئے بات شروع ہوئی تھی۔ شمی کے مرحوم ابا کے اوصاف سے ...... پھر بات جو چلی، تکی بے پر کی اڑنے، لطیفے پہ لطیفہ، قہقہے پر قہقہہ۔ چچا رفیع بڑی بے تکلف ہنسی ہنستے تھے۔ ان کی عام بات چیت بھی بلند آواز میں ہوتی تھی۔ پولس انسپکٹر رہ چکے تھے۔ رسی جل گئی۔ بل نہ گئے۔ آواز میں رعب اور صورت سے دبدبہ ٹپکتا تھا۔ وہی روائتی مونچھ والے مرد تھے، بھاری ٹھڈی، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مضبوط اور خوب صورت دانت، پھیلی پھیلی بھنویں، باتیں کرتے تو دور سے سننے والے کو یوں معلوم ہوتا جیسے جھگڑ رہے ہوں قہقہہ لگاتے تو اس زور سے کہ کھڑکیوں کے شیشے لرز اٹھیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر گویا ان کی ضد تھے۔ یوں مونچھیں تو ان کی بھی بچھو کے ڈنک کی طرح تھیں لیکن رعب خاک بھی نہ تھا۔ ان کو کوئی لطیفہ نہ سوجھتا تھا۔ دوسروں کے چبھتے ہوئے فقروں یا رمزوں کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر ہنس پڑتے تھے لیکن اس انداز سے جیسے معذرت کر رہے ہوں۔ دھیرے دھیرے رک رک کر جیسے کہہ رہے ہوں کیوں ہنساتے ہو مجھ کو۔ مجھے ہنسی آتی تو ہے نہیں۔ ہنسنے کی بات ہی کیا ہے آخر لیکن حامد صاحب بڑا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ کم گو تھے۔ لیکن نکتہ رس اور رمز شناس۔

پراٹھے پر پراٹھا پک رہا تھا۔ سب ایک ایک پیالہ چائے پی چکے تھے۔ بے چارے جاوید رہ گئے وہ پڑے سوئے رہے ورنہ ان کو بھی چائے مل جاتی۔ اب تو شاید جاگ اٹھے ہوں۔ باتوں کی آواز سن کر ممکن ہے اماں کے کمرے میں جائیں اور اس کو وہاں نہ پا کر......

"بھئی شمی!"

شمی نے آنچل سنبھالا۔

"آپ یہاں ہیں؟ کب سے ڈھونڈھ رہا ہوں — کیا بن رہا ہے یہ؟"

"جی پراٹھے ہیں، قیمے والے....." وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

"پراٹھے؟ او ہو پکنک کی تیاریاں ہیں..... نوکر کیا ہوئے۔ آپ کیوں پکا رہی ہیں۔ میں کچھ مدد کرسکتا ہوں آپ کی ؟"

"شمی کے سر سے آنچل کھسکا جارہا تھا..... بہ مشکل بولی" پک جانے دیجئے۔ پھر ضرورت ہوگی آپ کی۔" گال سرخ ہوگئے۔

"ہو ہو ہو" جاوید نے قہقہہ لگایا۔ اس کے گون کے اونی پھندنے ہلنے لگے۔ ہمیں ایک پیالہ چائے دیجئے نا!"

چائے کا پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں اسے پینے لگا۔" تو بھئی کیا پراٹھے ہی رہیں گے! کچھ اور نہ ہوگا کھانے کے لیے ؟"

"فہرست تو کافی بڑی تھی....."

"مثلاً ؟"

"پھل' مربے' پیسٹری، مٹھائی، مچھلی....."

"مچھلی! ..... کیوں نہ وہاں مچھلیاں پکڑنے کا شغل رہے۔"

"بڑی نہیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں....."

"تو ان ہی کو پکڑیں گے۔"

شمی خاموش رہی۔

"فہرست مکمل نہیں ہوئی۔"

"نوکر جاگیں تو کسی کو بازار بھیجا جائے رات پروگرام بہت دیر سے بنا اب اگر نوکر سائیکل پر جائے تو بھی ڈھائی میل جانا، ڈھائی میل آنا۔ بازار نزدیک تو ہے نہیں۔"

"تو بھئی سرونٹ کوارٹرز میں جاکر کسی نوکر کو بلا لاتا ہوں۔ آخر دیر بھی کیوں کی جائے؟" جاوید خالی پیالہ میز پر رکھ کر شمی کے قریب کھڑے رہے۔

شمی نے چھپی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''شمی!'' وہ آگے کو جھک گئے۔ شمی کا دل دھڑنے لگا۔

'' آپ کے لیے ایک چیز لایا ہوں۔'' جاوید نے گاؤن کی جیب میں سے دمکتے ہوئے موتیوں کا ایک ہار نکالا۔ ''اجازت دیجئے میں یہ ہار آپ کے گلے میں پہنادوں۔'' — اور پھر بلا اجازت جاوید نے آگے بڑھ کر ہار پہنا دیا۔'' پکنک پر اس کو پہن کر چلیے گا۔'' پیش تر اس کے کہ اس کا گداز سینہ موتیوں کی ٹھنڈک کو محسوس کر سکے جاوید کچن سے باہر نکل گیا۔

شمی امیر گھر کی بیٹی تھی۔ وہ ان موتیوں کی قیمت کا اندازہ لگا سکتی تھی...... اوہ! اس نے موتیوں کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ان پر اپنا رخسار رکھ دیا......

کوٹھی کے باہر ایک بڑا چوکور چبوترا تھا۔ گرمیوں میں شام کے وقت بڑے پھاٹک والا لان ''مردانے'' کا کام دیتا اور کوٹھی کے اس جانب چبوترے پر عورتیں جمع ہوجاتیں۔ یا اگر گھر کے سب لوگ مل بیٹھنا چاہتے تو یہی موزوں جگہ ہوسکتی تھی۔

چونکہ اب دھوپ اچھی خاصی نکل آئی تھی۔ اس لیے گھر کے لوگ بے ترتیب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سوائے شمی کے سب لوگ ایسے بے فکر تھے جیسے کہیں جانے کا خیال ہی نہ ہو۔ ادھر اُدھر کی ہانک رہے تھے۔ لیکن جب نوکر بازار سے لدا پھندا لوٹا تو پھر ہر کوئی اچک اچک کر چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ پھلوں کی ٹوکریاں' مچھلی کے ڈبے، پیسٹریاں' اچار' مربّے' ڈبل روٹیاں' گرم گرم سموسے' رس گلوں اور بنگالی مٹھائی سے لبریز آب خورے......دادی نے اور ضروری چیزیں منگوائیں — اسٹو' تھرماس' چورا چائے کا ڈبہ' شکر' پلیٹیں وغیرہ ...... اتنے میں ان کے پڑوسی' پارسی میاں بیوی آن پہنچے۔ وہ بھی مدعو کیے گئے تھے۔ مسٹر گز درجن کو لوگ مذاق سے گز بھر بھی کہا کرتے تھے ٹھگنے سے ادھیڑ عمر کے شخص تھے۔ شہر میں ان کے دو سنیما ہاؤس تھے۔ ایک اسکیٹنگ رنک' ایک موسیقی کے سازوں کی دوکان — صحت مند' چست و چالاک نوجوانوں کو مات کرتے

تھے۔ بات کرتے وقت ان کی بھنویں خوب حرکت کرتیں ان کی بیوی شیریں بلا کی حسین عورت تھی اونچی ایڑی کی گرگابی پہن کر وہ خاوند سے بلند قامت نظر آتی تھی۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود خوب رو اور طرح دار — بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ خوش ادا، نفاست پسند اور ہنس مکھ — ان کی اولاد بھی خوب صورت اور سمجھ دار تھی۔ سب سے چھوٹے دو بچے ان کے ساتھ تھے۔ آتے ہی محبوب کو ڈھونڈنے لگے محبوب جس کو پیار سے ''بوبی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا شمی کا پانچ سالہ بھائی تھا۔ وہ طوطے کی طرح بات کیے جاتا تھا اور شمی اس کی ہر بات کا جواب آج بہت ہی پیار سے دے رہی تھی۔ کتنا پیارا بچہ تھا شمی نے اس کو گلے سے لگا کر بھینچا۔

ناشتہ کا سامان پہلے کھانے کے کمرے میں لگایا گیا۔ پھر تجویز یہ ٹھہری کہ باہر چبوترے پر ہی ناشتہ کیا جائے۔ سب انسپکٹر صاحب خوب زور سے ہاتھ ملتے ہوئے کرسی کھسکا کر آگے بڑھے۔ انہوں نے ساقی کا کام سنبھالا۔ غلاف میں لپٹی ہوئی بطخ سی چائے دانی کا ڈھکنا اٹھا کر ———— اندر جھانکتے ہوئے بولے۔ چائے اسٹرانگ رہے گی کچھ۔''

بڑی اماں لاکھ بوڑھی سہی لیکن ان کا دل جوان تھا۔ جوان کیا بلکہ بچہ تھا۔ کیا مجال جو سیر و تماشے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے دیں۔ ادھر بچوں کے لیے دو ٹٹو سج دھج کر آئے تو ادھر بڑی اماں کے لیے ڈانڈی بھی آن پہنچی۔ بچے مارے خوشی کے ٹینس کورٹ میں دوڑ لگاتے رہے پھر باغ کے گرد اگر دگھنی باڑ کے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول اور زرد زرد دانوں کے گچھوں کی کلغیاں بنا کر ٹوپیوں میں ٹھونس لیں۔ بزعمِ خود بادشاہ اور نواب بنے ہوئے آئے۔ ان کو دیکھ کر کیپٹن جاوید نے گٹار بجانی شروع کر دی۔

خدا خدا کر کے یہ قافلہ روانہ ہوا۔

ڈانڈی پر بیٹھی ہوئی دادی اماں سب سے بلند گویا سالارِ قافلہ تھیں۔ ان کے

چہرے پر باوجود بڑھاپے کے بہترین صحت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بار بار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتیں اور مسکراتیں۔ ان کا دم بھی غنیمت تھا۔ ایسی کئی پکنکوں میں حصہ لے چکی تھیں۔ اس لیے کل انتظامات کرنے میں بڑی ماہر تھیں کیا مجال جو کوئی بھی ضروری شے ان کی نظر سے بچ جائے یا کوئی شے منزلِ مقصود پر پہنچ کر یاد آئے۔ چھوٹے چمچے اور جھاڑن تک لے جانا نہ بھولتی تھیں۔

مسز گزور سب انسپکٹر صاحب کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مسٹر گزور ہاتھ میں چھڑی لیے حامد کے ساتھ گپ اڑا رہے تھے۔ اماں' پھوپھی' اور شمی کی علاحدہ ٹولی تھی۔ کیپٹن جاوید شمی کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر منظور ایک نوکر سے کرید کرید کر سوالات پوچھ رہے تھے۔'' کیوں بے تیری شادی ہوگئی کیا؟ پھر کہاں گئی بیوی؟ ابے تونے اسے چھوڑ دیا اس نے دی لات......'' اور بچے ٹٹوؤں پر سوار ٹھک ٹھک کر چلے جارہے تھے۔ بوبی چھوٹی بہن کو ساتھ بٹھائے ایک ذمہ دار شخص نظر آتا تھا۔ مسٹر گزور کے دونوں بچے بھی اپنے ٹٹو پر سوار تھے۔ بچوں میں بحث ہو رہی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ ان میں کون سا ٹٹو اصلی پٹیو تھا۔

گزور صاحب کی نیوفونڈ لینڈ نسل کی کتیا بھی زمین سونگھتی چلی جارہی تھی۔

پہلے وہ اکیلی وکیلی کوٹھیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے تھوڑی دور تک چھوٹی نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس نہر کا پانی نہایت صاف تھا۔ چھوٹے چھوٹے مختلف ڈیل ڈول کے رنگ برنگے پتھر پانی میں سے جھلک رہے تھے۔ پانی کے کنارے لمبی ہری ہری گھاس لہلہا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں پیپر منٹ کی سی خوشبودار بوٹی اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں گول گول پتوں والی برہمی بوٹی بھی نظر آجاتی تھی۔ سب سے بلند کتا گھاس تھی۔ اگر کسی کا کپڑا اس سے چھو جاتا تو اس کے دانے کپڑے سے چپک کر رہ جاتے۔ نہر چھوڑ کر وہ پگڈنڈی پر ہولیے جو ڈھلوانوں میں سے ہوتی ہوئی چائے کے باغ میں غائب ہو جاتی تھی۔

ابھی دھند صاف نہ ہوئی تھی۔ جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا دھند بھی غائب ہوتی جارہی تھی۔

قہقہوں پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ باتوں میں چچا رفیع سے کون بازی لے جاسکتا تھا۔

دادی اماں نے گزدر صاحب کو پکار کر کہا۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ بڑے لڑکے کو بھی ساتھ لے آتے کیا نام...... بھلا سا نام ہے اس کا۔

گزدر صاحب ہنسے ان کے مضبوط دانت اور سرخ مسوڑھے نمایاں ہو گئے 'سوبی؟ آپ کو معلوم نہیں سوبی نے موٹر سائیکل خریدی ہے۔ آج کل اسی دھن میں ہے جب سے میں نے لائسنس لے دیا ہے تب سے دن رات موٹر سائیکل کا بھتنا سر پر سوار ہے۔ اگر موٹر سائیکل اس رستہ سے جاسکتی تو وہ ہمارے ہم راہ ضرور آتا...... اماں بولیں ''موٹر سائیکل کس خوشی میں خرید دی آپ نے۔''

'' میں کاہے کو خرید کر دیتا۔ یہ تو ایسی بدبخت سواری ہے کہ میں عمر بھر اس کو خرید کر نہ دیتا۔ خود چار پانچ ماہ کا جیب خرچ جمع کر کے خریدلی شریر نے۔''

شیریں نے دادی اماں سے پوچھا۔'' آپ اب نئی کار کب خرید رہی ہیں؟

'' نئی؟ نئی کا کیا ہوگا؟ پہلے جو ایک موجود ہے۔''

'' رہنے دیجئے اب اس میں کیا رکھا ہے۔ پرانا ماڈل ہوا اور پھر فورڈ۔''

'' تو فورڈ کچھ بری تو نہیں ہے۔''

''آپ کو تو رولز رائیس رکھنی چاہئے۔''

شمی کی اماں بولیں۔'' رولز رائیس خریدنے کا دم تو حامد صاحب میں ہے۔ دیکھو تو کیسے دم سادھے جارہے ہیں۔ بنکوں کے مالک ہیں......''

شیریں لبوں پر دل فریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔'' کیوں مسٹر حامد کچھ فرمایئے نا! آپ کار لیجئے تو ہم بھی فخر سے گھومنے جایا کریں گے...... وہ کون سے بنک کے مالک

ہیں آپ ہم کو تو آج تک پتہ ہی نہ چلا۔''

''بانو آپ تو مجھ کو بنا رہی ہیں۔ آپ بھی ان کی باتوں میں آگئیں۔''

اماں بولیں۔ لیجئے اور سنئے۔ کہئے نا وہ کازمو پالٹین بنک۔''

''واہ صاحب واہ! آپ نے مجھ کو مالک کب سے بنا دیا۔ میرا نام حصہ داروں میں لیجئے نا!''

اب پارٹی چائے کے باغ میں داخل ہوگئی۔

دادی اماں نے کاشمیری چادر کندھوں پر ڈالتے ہوئے پکار کر کہا۔'' ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ چائے کی سبز پتیاں ہماری چورا چائے میں کیوں کر تبدیل ہوجاتی ہیں۔ کیوں نہ پتیاں توڑ کر لے چلیں اور سکھا کر چائے بنائیں اور دیکھیں کیا لطف آتا ہے۔''

رفیع صاحب آگے بڑھ کر بولے ۔''لیجئے میں سمجھاتا ہوں آپ کو۔ اس پودے کی ساری پتیاں کام میں نہیں لائی جاتیں۔ صرف کونپلوں کی تین یا ڈھائی پتیوں کی چائے بنتی ہے۔''

سب لوگ کھڑے رفیع صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ شمی اماں کے پاس گھسی کھڑی تھی۔ جاوید نے پیچھے سے برقعے کا دامن کھینچ دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا بڑی دیر بعد شرارت کو بھانپ سکی۔ رفیع صاحب کا لکچر ختم ہوا اور سب لوگ آگے چل کھڑے ہوئے۔

چائے کا باغ ختم ہونے پر تھوڑی سی ہموار جگہ آئی۔ آگے برسات کا پانی کھڑا تھا۔ کنارے پر ہری بھری لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ سرسبز جھاڑیاں۔ قریب ہی ایک گھراٹ اس کے بعد جنگل چھوٹی چھوٹی حسین پہاڑیاں۔

تھوڑی دیر تک قافلہ گھراٹ کے قریب رکا۔ پانی تیزی کے ساتھ نیچے گر رہا تھا جگہ تنگ تھی۔ پانی کلبلاتا، شور مچاتا، جھاگ اڑاتا بہہ رہا تھا۔

شمی کی اماں نے پھر بات چھیڑی۔" بانو! آج آپ کی ساڑی غضب ڈھا رہی ہے۔ کتنے کی ہے؟"

شیریں مسکرائیں۔"سستی ہے ڈیڑھ سو کی لی تھی۔"

" اللہ میرے" دادی اماں پکاریں۔" مسٹر گزدر! یہ کیا ظلم ہے۔ اب آپ کنجوس ہوتے جا رہے ہیں۔"

" جی نہیں۔ شیریں بولیں۔ ساری کنجوسی میرے لیے ہے۔ ورنہ بیلے کا جیب خرچ ملاحظہ ہو۔ چار مہینے میں موٹر سائیکل خرید لی۔ خود پرسوں کار نیوال میں پانسو سے اوپر کھڑے کھڑے ہار گئے۔"

گزدر صاحب اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے بولے۔" دیکھو بانو! اگر آپ نے ہمارے بھید کھولے تو ہم آپ کے راز بھی افشا کر دیں گے...... کہو بتادوں؟"

شیریں بانو چھا گئیں ۔ نیچی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔" کہہ ڈالیے نا! چھپاتے کیوں ہیں؟"

ایسی مسکراہٹ کے بعد بے چارے گزدر صاحب !

" کس قدر خوب صورت جگہ ہے ونڈرفل!! " جاوید ایک جگہ اسکول کے چھوکرے کی مانند اکڑ کر رک گئے۔

انسپکٹر رفیع بولے۔" تو کپتان صاحب! یہاں ایک کوٹھی بنوا ڈالیے نا؟"

" درحقیقت میرا دل تو یہی چاہتا ہے۔ اگر...... اگر......" انہوں نے شمی کی طرف چھپی نظروں سے دیکھا ــــ سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رستہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سب لوگ اس جگہ ٹھہر گئے۔ ایک طرف ایک دوکان تھی۔ جسے جنرل مرچنٹ کہنا چاہیے۔ دودھ' دہی، مٹھائی، پکوڑوں کے علاوہ آٹا دال، موم بتی، سگریٹ ، ماچس، پان، صابن، ازار بند، آئینے، غرض ہر قسم کا سامان اس جگہ سے مل سکتا تھا۔

انسپکٹر رفیع پکار کر بولے۔ '' بھئی اس جگہ پان کھائے جائیں گے۔''

حامد صاحب کہنے لگے۔ '' لیکن پانوں کے خرچ کا بار کون اٹھائے گا۔''

'' ڈاکٹر منظور! '' سب لوگ بول پڑے۔ سب کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ '' ڈاکٹر منظور ساری پارٹی کو پان کھلائیں گے۔ وہی سب سے موٹی اسامی ہیں۔''

ڈاکٹر منظور حسب معمول بڑی مشکل سے ہنسے جیسے ہنسنے سے معذور ہوں۔ وہ تھے صاحب ثروت لیکن کنجوس بھی پرلے درجے کے۔ باریک آواز میں بولے۔ '' پان کھلانا تو بسروچشم قبول...... لیکن صاحب میں موٹی اسامی کیوں کر ہوا؟''

'' بھئی وہ سٹے میں جو تم نے لاکھوں روپے پیدا کیے ہیں اور یہ جو گھوڑ دوڑ کے لیے بمبئی بھاگے جاتے ہو...... '' رفیع نے آوازہ کسا۔

منظور کچھ جھینپے۔

'' پولس انسپکٹر ہوں اڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔''

لاکھوں روپے کا نام سن کر دو ہٹے کٹے گورکھے جو دوکان پر کھڑے سوڈا پی رہے تھے ڈاکٹر منظور کی طرف دیکھنے لگے۔

پان کھانے کے بعد پارٹی روانہ ہوئی۔

ایک جگہ بڑی بے ڈھب اترائی تھی۔ بعض لوگ بھاگے، بعض پھسلے، بعض چاروں شانے چت۔

رستے میں کمہاروں کے چند گدھے بجری سے لدے ہوئے اوپر آرہے تھے ان ہنستے کھیلتے ہلڑ مچاتے اشخاص سے جو مڈبھیڑ ہوئی تو بدک کر بھاگے۔ یہ طرفہ تماشہ ہوا۔ غرض اترائی اترتے وقت سارا قافلہ منتشر ہوگیا۔ نیچے پہنچ کر سب لوگ مارے ہنسی کے دہرے ہو ہو گئے۔ عورتوں کے سروں سے برقعے کھسک کھسک گئے۔

آگے بلند پہاڑیوں کے دامن میں بھدّی بھدّی جھونپڑیاں نظر آنے لگیں۔

چند پہاڑی کاٹھ کے مرتبان نما برتنوں میں دہی بھرے شہر کی طرف لپک رہے

تھے۔ ان سے دو مرتبان دہی خریدا گیا۔

اب وہ بڑی ندی کے کنارے کنارے چل کھڑے ہوئے جو جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے بیچ میں سے بہتی ہوئی آ رہی تھی۔

ایک طرف پہاڑی کے اوپر پانی کا چشمہ تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھڑے کولہوں پر رکھے سست قدموں سے پہاڑی چڑھ رہی تھیں۔

میل بھر چلنے کے بعد آب شار کا شور سنائی دینے لگا۔

سب کے دل اُچھلنے لگے۔ ذرا آگے بڑھے تو آب شار دکھائی دینے لگا۔ سب لوگ ٹھٹک کر رک گئے۔

پانی بڑی بلندی سے ندی میں گر رہا تھا۔ رستہ میں جہاں کہیں بھی ٹکراتا وہاں متواتر چھینٹے اڑنے سے بادل سے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ گہرے سبز رنگ کی جھاڑیوں کے بیچ میں پانی کی سفید سی لکیر کھینچی ہوئی جیسے بالوں کے درمیان مانگ۔

مسٹر حامد کو آرٹ سے دلچسپی تھی۔ قدرت کے نظارے بھی کس قدر پرعظمت ہوتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ اب پرانا مندر بھی نظر آنے لگا۔ وہ کھوہ بھی دکھائی دینے لگی۔ جہاں ہر وقت پہاڑ میں سے بوندیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا مسافر خانہ تھا جو مریض زیادہ دن ٹھہرنا چاہتے وہ اسی میں قیام کرتے۔

سب سے پہلے گندھک کا چشمہ دیکھا گیا۔ ایک چٹان کی دراڑ میں سے گندھک کا پانی اُبل رہا تھا۔ صاف و شفاف جن پتھروں کو چھو کر پانی گذرتا تھا۔ ان پر سفید رنگ کی ایک موٹی سی لجلجی تہ چڑھ گئی تھی۔ گندھک کی بو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

چشمے سے ذرا ہٹ کر، لوگوں کی نظروں سے دور، چٹائیاں بچھا دی گئیں۔ گراموفون ایک ہموار پتھر پر رکھ دیا گیا بے ترتیب سامان کے درمیان عورتوں نے برقعے اتار

پھینکے، مردوں نے پیٹیاں ڈھیلی کر دیں۔

دم لینے کے بعد مرد کپڑے اتار ندی میں کود پڑے، دادی اماں کے دو پٹے سے مچھلیاں پکڑی گئیں۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالا گیا کارڈ بجائے گئے، تاش کھیلی گئی، لطیفے سنائے گئے، کپتان جاوید نے گٹار بجائی۔ اس قدر ہلڑ مچا کہ توبہ ہی بھلی۔ آخر تھک ہار کر شام کے وقت سب لوگ ایک ایک پتھر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ اب صلاح یہ ٹھہری کہ چائے تیار کی جائے اور چائے پینے کے بعد واپسی کا بگل بجے۔ اس بات کی فکر نہ تھی کہ رات ہو جائے گی۔ چاندنی راتیں تھیں۔ سفر کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

اسٹو پر پانی کا پتیلا رکھ دیا گیا۔ نوکر اُبلے ہوئے انڈے چھیلنے لگا۔ شمی کو پیاس محسوس ہوئی۔ دن بھر سب لوگ گندھک کا پانی پیتے رہے تھے۔ لیکن اس کو بو بری معلوم ہوتی تھی۔ جاوید نے اس کی بات سن پائی۔ بولا۔ ''چلو میرے ساتھ پانی پلا لاؤں قریب ہی تو چشمہ ہے۔ دس منٹ کا رستہ۔''

وہ آزاد گھرانا تھا لیکن اس حد تک آزادی مناسب تھی یا نہیں شمی کی اماں فیصلہ نہ کر سکی۔ لیکن کیپٹن جاوید کی بات کو رد کیوں کر کیا جائے۔ دادی امّاں نے بگڑی بات بنائی۔ ''جاؤ شمی! پی آؤ نا پانی۔''

شمی نے برقعہ سر پر ڈال لیا۔ اور سمٹی سمٹائی پہلے جاوید کے پیچھے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہولی۔ اس نے چہرے کے آگے کا نقاب اُلٹ رکھا تھا۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ تنہائی میں کیپٹن جاوید کا حلق بھی خشک ہو رہا تھا۔ پہاڑی کے موڑ پر وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ گاہے شمی دانتوں تلے ہونٹ دبا لیتی۔ سیاہ برقعے میں سے اس کا دمکتا ہوا مکھڑا!!!

چشمے کے قریب پہنچ کر جاوید نے پانی کا پیالہ بھرا اور شمی کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پینے کے بعد جب وہ لوٹنے لگے تو جاوید رک گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی الوداعی کرنوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو

سنہری رنگ سے رنگ دیا تھا اونچے اونچے پر وقار درخت جیسے آسمان کے سینہ میں گھس گئے ہوں۔ درختوں کے بیچ میں سے نکل کر آنے والی دھوپ جیسے آری سے چرے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے تختے۔ یا جیسے دریا کا بند ٹوٹ جانے سے برساتی پانی کی مٹیالی چادر سی بہہ نکلی ہو۔ ہر چہار جانب پر اسرار خاموشی تھی۔ ان بلند قامت درختوں کے قدموں میں کھڑے ہوئے جاوید نے کہا۔ ''کس قدر حسین منظر ہے شمی!''

''جی'' شمی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

''تم ...... تمہیں وہ ہار پسند بھی آیا'' — کس قدر پھسپھسا سوال تھا۔ اس نے شمی کا ہاتھ تھام لیا۔ شمی تیز تیز سانس لینے لگی۔ اس کی چھاتیوں میں سمندر کی لہروں کے مد و جزر کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔

''بھئی یہ برقعہ بھی کیا۔'' جاوید نے آناً فاناً برقعہ جھپٹ کر اچھال دیا اور وہ ایک شاخ سے الجھ کر لٹکنے لگا۔ شمی نے اس کو روکنے کے لیے ہاتھ اُوپر اٹھائے۔ جاوید کو اس کی کمر بازوؤں میں جکڑ لینے میں آسانی ہوگئی۔ اس نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔

اس نے سہمی ہوئی کبوتری کی متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا...... ہائے اللہ! کوئی دیکھ نہ لے...... کوئی دیکھ نہ لے......''

کون؟ —؟

کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں۔

گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے ایک لڑکی تیز تیز قدم بڑھاتی چلی جارہی تھی۔ پاؤں میں چاندی کے پازیب' کھیتوں پر میل...... شہر کی گھاس منڈی ابھی بہت دور تھی۔ اس کا سر گھاس کے گٹھے میں اس قدر دھنسا ہوا تھا کہ وہ چار قدم سے آگے کچھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کا چہرہ تک چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی سرمئی رنگ کی گول چکنی ٹھڈی دکھائی

دے رہی تھی جس جگہ اس کے لہنگے کا ازار بند بندھا ہوا تھا اس جگہ اس کے جسم کی جلد کی تنی ہوئی تکون سی نظر آ رہی تھی...... عظیم الشان آب شار کی عظمت سے بے خبر...... رواں دواں ......

اس سے پرے گھاس کا گٹھا اٹھائے ایک اور لڑکی...... اس سے پرے اک اور...... پرے اک اور ...... اک اور...... اور...... اور......

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'تار و پود' میں شامل ہے۔

اُس کی بیوی

سب کی آنکھ بچا کر وہ کھسکا...... آخر وہ تھک گیا تھا۔ شادی کے موقعہ پر جو شور غل ہوتا ہے۔ اس سے کون واقف نہیں اور پھر دلہا بچارے کی وہ مٹی پلید ہوتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ موسم گرم، سالیوں کی چھیڑ چھاڑ گرم تر۔ آخر وہ دلہن لے بھاگا۔ اب ایک مرحلہ رہ گیا تھا۔ وہی روایتی پہلی سنہری رات ،ہنی مون...... لیکن اس سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ اس کے حواس درست ہوجائیں۔ اس لیے وہ دوستوں اور عزیزوں کے جھرمٹ میں سے جو بھاگا تو پرانی کتابوں کی دوکان پر جا کر دم لیا...... اور ''خونی کتیا'' دیکھنے لگا۔ بوسیدہ سی کتاب کانن ڈائل کے جاسوسی ناول ہاؤنڈ آف بیسکر وائلز کا ترجمہ تھی — دوکان دار نے سفید پوش گاہک کو تاڑ کر آٹھ دس ناول اس کی طرف دھکیل دیئے...... ڈاکٹر نکولا، سنہری بچوں، بہرام کا ٹولہ، خون آشام محبوبہ، ہائے میری جان! زندہ مردہ کفن پوش، بے گناہ قیدی، سلطانہ ڈاکو عرف شیرِ بجنور ...... اب وہ جاسوسی ناولوں سے کس قدر نفرت کرتا تھا۔ لڑکپن میں اس کو جاسوسی ناول پڑھنے کا اس قدر شوق تھا کہ اس نے ''چندر کانتا'' کے کل حصے چار مرتبہ پڑھ ڈالے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کو ہر نیا ناول پرانے کی نقل معلوم ہوتا تھا...... تو پھر وہ وقت گذارنے کے لیے کیا خریدے۔ ''بھئی کوئی نئی چیز!''

''نئی چیز؟'' — دوکان دار نے دُو ما کا ''تھری مسکٹیرز بڑھایا۔ اس'' نئی چیز'' کی بجائے کیوں نہ وہ مین اونلی (Men Only) خرید لے۔ ہر اشاعت میں دو عریاں عورتوں کی تصویریں' ہر تصویر کے نیچے عنوان' جو نیم شاعرانہ طبیعتوں پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتا ہے...... خوب یاد آیا۔ شاید وہ مرکری کے پرچے موجود ہوں خالص ادبی رسالہ۔ وہ اس کونے کی طرف بڑھا۔ معاً ایک بہت ہی فربہ اور دیو پیکر کتاب نظر آئی۔ اس پر لکھا تھا گھوسٹ اسٹوریز (Ghost Stories) یعنی بھوت کہانیاں۔ لفظ بھوت تو خوب بڑے بڑے حروف میں لکھتا تھا اور اس کے نیچے لفظ Stories بہت چھوٹے حروف میں جیسے وہ لفظ بھوت کی ٹانگیں ہوں نیچے سچ مچ کے بھوت کی تصویر...... اس کا جی متلانے لگا۔ آخر ان حرکتوں سے کیا حاصل؟ وہ کچھ پڑھنے کے موڈ میں کہاں تھا؟ غیر شعوری طور پر وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا۔ لیکن بھوت کہانیاں دیکھتے ہی اس کی قوت ارادی مضبوط ہوگئی۔ وہ الٹے پاؤں دکان سے نکل آیا۔

اب وہ بیئر پینا چاہتا تھا۔

چار بجے کے قریب گاہکوں کے آنے کا وقت نہیں لیکن گاہک اور موت کے وقت کا تعین نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ دوکان دار دوکان پر موجود تھا۔ وہ بھنبھناتی مکھیوں کے درمیان کچھ بھناّیا سا بیٹھا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے دوکان دار کی مونچھیں متحرک ہوئیں اور وہ پانی میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف گھورتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ گاہک اس کی دوکان میں داخل ہو چکا ہے تو اس نے منہ پھیلا کر نوکر کو آواز دی۔'' ابے چل سور کے بچے۔ تیری......'' نوکر بھی دبّو نہ تھا معمولی زق زق بک بک کے بعد وہ گاہک کے پاس پہنچا۔

جاسوسی ناولوں میں کسی مڑے ہوئے ہونٹ والے مجرم کا سراغ لگانے کے لیے جب کوئی جاسوس کسی ہوٹل میں جاتا ہے تو اس ہوٹل کا حلیہ بالکل اس سے ملتا جلتا بیان کیا جاتا تھا۔ تاریک کمرہ' بڑے بڑے پروں والے چھت کے پنکھے مدھم روشنی، شراب اور گوشت کی ملی جلی بو، مختلف میزوں پر متجسس صورتیں، پلیٹیں چاٹتے ہوئے کتوں کی چپڑ چپڑ کی آوازیں...... یہ احساس اس وقت اور بھی تیز ہو جاتا جب اس کے سامنے ہُو بَہُو

بیٹھا ہوتا۔ اسے سب جو جو کہتے تھے۔ ہُو ہُو کے معنی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ یعنی یہ بے معنی لفظ با معنی معلوم ہونے لگتا۔ جو جو کی پیشانی تنگ، چہرہ سر سمیت ایک تنے ہوئے گھونسے کی طرح، اس کے چہرے پر بال بہت تھے۔ پیشانی پر، گالوں پر، کانوں پر حد یہ کہ ناک پر بھی بال تھے۔ جس جگہ بال نہ ہونے چاہئے۔ وہاں وہ استرا پھیر لیتا۔ شیو کے بعد معلوم ہوتا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر کالک مل دی ہو۔ پھر' اس کی گھنی بھنوؤں تلے اس کی اندر کو دھنستی ہوئی چمک دار تیزی سے، گھومنے والی متجسس آنکھیں...... لیکن وہ اس کے ساتھ کبھی خوش نہ ہوا تھا۔ اب اور کوئی نہ ملے تو لاچاری کی بات دوسری ہے۔ اگر کہیں ہُو ہُو سے ملاقات ہوجاتی تو جو جو اپنے مخصوص انداز سے پوچھتا۔ ''ہوسکتا ہے؟''

''ہاں ہوسکتا ہے۔''

''تو ہوجائے۔'' — اور باتیں تو غنیمت تھیں لیکن اس کے لیے سب سے نفرت انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ پینے کی تیاری کرتا تو حلوائی کے ہاں سے تلی ہوئی دالیں خرید لیتا۔ نہ گوشت نہ کباب۔

اگر شراب پینا حرام ہے تو تنہا پینا حرام تر۔ بعض لوگوں کی صحبت اس قدر اچھی ہوتی ہے کہ پلّے سے پلا کر بھی دل خوش رہتا ہے بعض منحوس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں انہیں کی گرہ سے پی کر بھی دل کو فرحت حاصل نہیں ہوتی۔ جگندر پال کو ہی لیجئے آخر تک کس تمکنت سے بیٹھا رہتا ہے۔ ہنستا ہے تو سنبھل کر۔ بات کرتا ہے تو تول کر۔ ممکن ہے اس کے بھاری بھرکم جسم پر چار پانچ پیگ کا اثر ہی نہ ہوتا ہو۔ بے چارا کھیل کھیلے بھی کیوں کر کہاں وہ پیارے لعل یک مشت بال و پر۔ گلہری کی طرح چونچال اور نچلا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو شراب کا نام ہی سن کر سرور میں آنے لگتے ہیں۔ اور بوتل سے کاک اڑتا دیکھ کر بہکنے لگتے ہیں۔ جہاں ایک پیگ پیا لگے کلبلانے، لہک لہک کر لگے ٹھمری کے بول سنانے اور پھر قہقہہ جو لگایا تو چھت صاف اڑ گئی۔

سب سے افضل بات تو یہ ہے کہ کوئی محشر خرام پری چہرہ ساقی ہو۔ پھر اللہ دے بندہ لے..... مگر ساقی دستیاب ہی کہاں ہوتے ہیں۔ یہاں اگر ساقی ملنے کی امید ہو سکتی ہے تو شادی ہونے پر۔ وہ بھی اگر بیوی منظور کر لے اور پھر سوسائٹی کے دوسرے افراد کو بھی پتہ نہ چلے..... بیوی..... کتنی ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک عورت کا شوہر تھا، واقعی؟

وہ ان اشخاص میں سے تھا جو شادی کے معاملہ میں از حد محتاط ہوتے ہیں۔ کس کس طرح سے اس کو پریشان کیا گیا۔ اس پر کیسے کیسے دباؤ ڈالے گئے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ شادی اس نے تبھی کی جب اس نے دیکھا کہ وہ گھریلو اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کی طرف سے سب انتظامات ہو جانے پر بھی شادی اس کے لیے لاٹری ہی رہی۔ بیوی صاحبہ اس کی ماں کا انتخاب تھیں.....

اس نے جنسیات پر بیسیوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ کل رموز حفظ کر لیے۔ وہ کم از کم بدصورت نہ تھا، صحت بھی اچھی تھی اور پھر ''کماؤ'' بھی تھا۔ وہ ہر طرح سے مکمل شوہر تھا۔ اس قدر صبر آزما طویل کنوارپن کے بعد اگر بیوی بے کار ثابت ہوئی.....؟

کڑوی کسیلی بیئر کے دو گھونٹ پی کر اس نے منہ بگاڑا۔ پلیٹ میں سے کوفتہ اٹھایا..... پتھر کی طرح سخت۔ اس نے کوفتہ کو انگلیوں میں دباتے ہوئے نوکر کو ڈانٹا۔ ''کیوں بے یہ کوفتہ ہے۔ اسی کو تم لوگ کوفتہ کہتے ہو؟''

رات۔

وہ آرام کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس کی تکان زدہ پھیلی ہوئی ٹانگیں تپائی پر ٹکی تھیں۔ پاؤں دکھ رہے تھے اور تلووں میں جلن۔ دل دھڑک رہا تھا اور بیوی کا انتظار..... دماغ میں خیالات خلط ملط ہو رہے تھے۔ ایک بڑا حادثہ پیش آنے والا تھا۔ بیوی! ..... تیری اچھوتی چھاتیاں! میری فاختہ! میری کبوتری!!..... یہ الفاظ نامعلوم اس

نے کہاں پڑھے تھے۔ یا سنے تھے۔ کس قدر رومنٹک!!

"لوافیموں کی مانند پڑے ہیں پینگ میں...... جاؤ دلہن تمہارے فراق میں گھل گھل کے ہاتھی ہو رہے ہیں بے چارے۔"

وہ پلٹا۔ لڑکیوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ دلہن کمرے کے اندر، شریر سہیلیاں باہر، دروازہ بند...... "اندر سے چٹخنی چڑھانا نہ بھول جانا" پھر قہقہہ پر قہقہہ...... رفتہ رفتہ۔ قہقہے مدھم پڑ گئے۔

تین برس گذر گئے...... ماضی مبہم، غیر اہم، حقیر، بے معنی...... دھندلا، دھندلا۔

بعض عورتیں پہلے دن ہی پھول کی طرح کھل جاتی ہیں...... بعض پہلے تو بند کلی کی طرح سمٹی رہتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کے جوہر کھلنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کی بیوی ان دونوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ وہ محض ایک عورت تھی۔ اس کی حیثیت ایسی تھی جیسے میونسپلٹی کی لالٹین...... وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی تیتری کی طرح اڑتی پھرے، اگر وہ ہلکے پھلکے لباس میں، چونچال سی، اٹھکیلیاں کرتی کبھی ادھر کو نکل جائے اور کبھی بادِ بہاری کی طرح ادھر کو۔ تو وہ کیسی رومنٹک دکھائی دے۔ کبھی وہ ناز سے بل کھا کر کہے۔ "یہ ٹائی آپ کو کس قدر بھلی معلوم ہوتی ہے۔" اگر وہ گھر دیر سے پہنچے تو کہے۔ "کوئی جان سے جائے آپ کی بلا سے"۔ وہ رقصاں و شاداں، پھولوں کی مہک کی طرح سبک رفتاری سے گھر میں چلتی پھرتی نظر آئے۔ برعکس اس کے وہ حد درجہ کی غیر رومنٹک تھی۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے کس قدر اہتمام سے کام لیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد وہ اس کو تنہا اپنے ہمراہ لے کر چلا آیا تھا۔ علاحدہ مکان، متوسط گھر کی ہر ممکن آسائش اس کے باوجود اس کے خواب شرمندۂ تعبیر تھے......

وہ کہتا۔ "کمل! تم روٹی مت پکایا کرو۔ اس کے لیے نوکر رکھ لیتے ہیں۔" لیکن اس نے یہ بات کبھی قبول نہ کی۔ ایک عورت آ کر برتن صاف کر جاتی تھی دو وقت۔ اس سے زیادہ وہ کسی مدد کی ضرورت ہی نہ سمجھتی تھی۔ اس کو ہمیشہ اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا

کہ نوکر مزید ار کھانا نہ پکا سکے گا۔ وہ یہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ اس کے خاوند کو اگر نوکر کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہی کھانا پڑا تو پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آٹا، دالیں، چاول گھی وغیرہ سب بقدر ضرورت خرچ ہوں۔ یوں ہی بے کار نہ جائیں۔ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر کہتا۔ لیکن کما کر میں لاتا ہوں۔ محنت مجھ کو کرنی پڑتی ہے۔ جب مجھ کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر کیوں اس فکر میں مری جاتی ہے۔ کمل منطق سے واقف نہ تھی۔ بحث تو نہ کرتی۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ آخر گھر لٹانے میں کیا مصلحت ہے۔ کمل کا خیال تھا کہ دھوبی کو سب کے سب کپڑے دینے کی ضرورت نہیں۔ جو کپڑے گھر پر دھل سکتے ہوں وہ دھوبی کو کیوں دیئے جائیں۔ شوہر یہ بات اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی ہر وقت مہندی رچائے گدیلوں پر ایرانی بلّی کی طرح بیٹھی رہا کرے۔ اس کو اس کے جسم کی مضبوط اور صحت ور جلد ہرگز پسند نہ تھی۔ وہ نازک اور زردی مائل رنگ کی عورتوں کو پسند کرتا تھا۔

یہی نہیں' زن و شوہر کے تعلقات وغیرہ پر بھی ان میں اختلاف تھا۔ اس کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ ہندوستانی عورت مرد کی محبت کا جواب دینا نہیں جانتی۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر جاہل ثابت ہوئی ہے کہ پاکیزہ ذوق رکھنے والے خاوند کے حسین تصورات خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ اس کی یہ کتنی خواہش تھی کہ ازدواجی زندگی کا ایک خاص پروگرام مرتب ہو۔ ایک ایسی رومنٹک فضا پیدا ہوجائے جس میں نون تیل، لکڑی ––– جیسے حقائق کا ذکر نہ ہو۔ بس سرمستی ہو، سکون ہو اور رنگ و بو محبت کی پینگیں بڑھیں، چنگ و رباب کی تانیں بلند ہوں۔ زندگی ایک ورق رنگین بن جائے ––– اس نے کتنی مرتبہ سمجھا۔ '' کمو! سنو محبت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن تم محبت کے لفظ سے ناآشنا ہو۔ تمہاری نظر تمہارے پاؤں سے آگے نہیں بڑھتی۔ تم نے چیزوں کی غلط اقدار قائم کر رکھی ہیں۔ تمہارا زاویہ...... پھر سوچ کر کہ وہ اتنی گہری باتیں نہ سمجھ سکے گی وہ کہتا۔ '' میں جب بھی گھر سے باہر جانے لگوں تو تم سب کام چھوڑ کر میرے قریب آجایا

کرو۔ تا کہ جانے سے پہلے میں تم کو پیار کرسکوں۔ اور جب میرے آنے کا وقت ہو۔ تو تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ اس وقت منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ اور دروازے پر میرا انتظار کرو تا کہ......'' اگر وہ یہ باتیں بڑے پیار سے سمجھاتا تو وہ ''اچھا جی'' کہہ کر تہ دل سے اس بات کا ارادہ کر لیتی اور اگر وہ خفگی سے بات کرتا تو وہ جھنجھلا کر خاموش ہو جاتی۔ لیکن ہوتا یہ کہ وہ بہت کم اس کے حکم کی تعمیل کرنے میں کامیاب رہتی۔ جب شوہر کے آنے کا وقت ہوتا تو ظاہر ہے پیار کرنے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ لیکن اس کو اس بات کی فکر لاحق ہوتی کہ انہیں بھوک لگی ہوگی۔ وہ چائے بنانے لگتی۔ توس سینکتی۔ وقت کا خیال نہ رہتا۔ اتنے میں اس کے شوہر کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی۔ خاوند اپنی بیوی کی محبوب مٹھائی، بنگالی رس گلے' آبخورے میں لیے اندر داخل ہوتا۔ وہ بھاگی بھاگی جاتی کچھ محجوب سی ہو کر کہتی۔ ''جی بھول گئی۔'' یا ''جی دیر ہوگئی۔'' پہلے پہل تو اس نے نظر انداز کیا۔ لیکن بعد میں وہ آپے سے باہر ہو جاتا — کبھی وہ پراٹھے پکانے کے لیے آٹا گوندھتی ہوتی تو وہ پہنچ جاتا۔ وہ آٹے سے بھرے ہوئے ہاتھ لٹکائے ہوئے آتی۔ یہ پوچھتا۔ ''ابھی آٹا گوندھا جارہا ہے۔ کمل شوہر کے لہجہ میں سختی محسوس کرتے ہوئے شرم سے سر جھکا لیتی۔ ''جی بھول گئی۔'' یہ کہہ کر وہ منہ آگے بڑھا دیتی اور وہ جلدی سے ایک بوسہ جھپٹ کر اندر چلا جاتا۔

اس قسم کی سینکڑوں چھوٹی موٹی باتیں تھیں جو بے چاری کمل کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ہزار سمجھانے پر بھی وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ شوہر کی آمد پر اس کے ہاتھ پاؤں دھونے کے لیے پانی' کھانے کے لیے توس یا پراٹھے' پینے کے لیے چائے تیار کرنا ضروری ہے یا سج دھج کر آتے ہی لاڈ بگھارنا لازمی ہے۔ وہ اس طرح سوچتی تھی۔ بحث نہ وہ کر سکتی تھی اور نہ کرتی تھی۔ کبھی جب وہ چائے کا ٹرے اٹھائے جاتی تو شوہر منہ پھلائے بیٹھا ہوتا۔ وہ غرا کر کہتا۔ ''میں چائے نہیں پیوں گا۔''

وہ سبب پوچھتی وہ کہتا۔ ''میں پی آیا ہوں۔''

پہلے پہل اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی اس کی خوشامد کرے گی۔ کہے گی۔'' ناتھ! شما کیجئے۔ داسی سے بھول ہوگئی۔'' لیکن وہ ٹرے اٹھا کر لے جاتی۔ اور سب کچھ چپٹ کر جاتی۔ پھر رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوجاتی۔

اس نے بیوی کو سنیما بھی دکھایا۔ تاکہ وہ رومان کا مطلب سمجھ سکے۔ اور اس موقعہ پر جب کہ ہیروئن چھوئی موئی کی طرح سمٹی جاتی اور ہیرو پریم رس میں ڈوبے ہوئے الفاظ کہتا ہوا اس پر جھکا جاتا کمل کو دفعتاً اس چھوٹے کمرے کا خیال آتا جس میں نقدی اور گہنے پڑے تھے۔'' جی میں پوچھتی ہوں۔ چھوٹے کمرے کو تالہ لگا دیا تھا آپ نے؟''

اس پر وہ چڑ جاتا۔ بھاڑ میں گیا وہ کمرہ اور اس کے گہنے کپڑے۔ وہ سنیما کیوں نہیں دیکھتی۔ کمل بے چاری کی عقل بھی کام نہ کرتی۔ وہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر تماشہ دیکھتے وقت اپنے گھر کا خیال کیوں نہ آئے۔ تماشہ آخر تماشہ ہے۔

رفتہ رفتہ اس کو اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ اس کی ازدواجی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی۔ پہلے پہل اسے نہایت نرمی اور محبت سے کام لینے کی کوشش کی۔ پھر کچھ درشتی سے پیش آنے لگا۔ کبھی وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح اپنی بیوی کے خیالات سمجھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن سب بے سود۔ خانہ جنگی بڑھی تو وہ گالی گلوچ اور بعض اوقات ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ آتا۔ لیکن بہتری کی صورت نظر نہ آئی۔ آخر کار وہ قطعاً ناامید ہو بیٹھا۔ وہ بیوی اور اپنے گھر سے لاپرواہی برتنے لگا۔ صبح کھانا کھا کر وہ دفتر کو چل دیتا۔ شام کو چائے پینے کے بعد بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے کلب کی راہ لیتا۔ راتیں رنگ رلیوں میں گذرنے لگیں۔ ادھر اس کی بیوی نے بھی کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہتی۔ کبھی گیت گنگناتی کبھی اڑوسیوں پڑوسیوں کے ہاں بیاہ شادی کے موقع پر ڈھولک بجا بجا کر گاتی۔ کبھی منڈیر پر بیٹھی مداری کا تماشہ دیکھا کرتی۔

شوہر زندگی سے بے زار ہوگیا۔ اس کی صورت سے وحشت ٹپکنے لگی۔ وہ اپنی دانست میں '' دیوداس'' بن گیا۔ دکھ کے اب دن بیتت ناہیں...... شراب پیتا، رقص و سرور کی محفلوں میں شامل ہوتا۔ بازار حسن میں کوٹھوں پر راتیں بسر ہونے لگیں لباس سے بے پروا مستقبل سے ناامید' نفس کی آمد و رفت سے متنفر...... جیسے اس کو بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہو۔

بیوی گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مگن رہتی اگر وہ اس کو زیادہ دق کرتا تو رو دیتی، اس کے بعد اپنا مزے سے نہا دھو کر پھر نئی نویلی بن بیٹھتی۔ گھر کی چیزیں بنائے جارہی تھی۔ بستروں کی چادریں تیار کی جارہی ہیں' غلافوں پر پھول کاڑھے جارہے ہیں' میز پوش میں جالی بنی جارہی ہے۔ شوہر کی پگڑیاں رنگی جارہی ہیں۔ بڑے اہتمام سے نیبو اور آم کا آچار ڈالا جارہا ہے۔ محلے کی عورتوں سے اچھے پیمانے پر لڑائی جھگڑے مول لے کر پھر چکائے جارہے ہیں۔ وہ زندگی کے دن اس طرح بسر کر رہی تھی جیسے کوئی خاص بات پیش نہ آئی ہو جیسے جو کچھ ہو رہا تھا۔ بالکل اس کی امیدوں کے مطابق......

ایک مرتبہ جب وہ آدھی رات کے وقت گھر لوٹا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی وہ حسب معمول اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب بیوی نے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ کھانا باہر سے ہی کھا کر آیا تھا۔ اس پر بیوی نے نرم لہجہ میں احتجاج کیا۔ بات معمولی تھی۔ لیکن وہ طیش میں آگیا۔ منہ سے کف اڑنے لگی۔ '' تو میرے پلے بندھی میرے نصیب پھوٹ گئے۔ اب میرا کوئی نہیں۔ میرے لیے گھر اور ویرانہ ایک برابر ہے یہ میرے کرموں کا پھل ہے کہ تو مجھ کو ملی۔ میں تیری صورت سے بے زار ہوں۔ اور تو اس قدر ڈھیٹ ہے کہ نہ تو مرتی اور نہ اس گھر سے منہ کالا کرتی ہے تاکہ میری جان تو چھوٹے عذاب سے۔''

کمل زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ نہ جانتی تھی کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔

ایسے وقت میں پڑوسیوں کے کانوں تک شور پہنچنا بھی مناسب نہ تھا۔ اس لیے وہ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے جان بوجھ کر خاموش رہی۔ لیکن شوہر پر تو بھوت سوار تھا۔ کم بخت تو جانتی ہے کہ تیرے پھوہڑ پن نے میری زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں۔ گانا سنتا ہوں اور...... اور ...... اب میں رنڈی بازی کرتا ہوں۔ سمجھی؟ آج تجھ کو بتائے دیتا ہوں۔ تو نے میری تمناؤں کا خون کیا، میرا گھر برباد کیا۔ تو نے مجھ کو شراب کی پناہ لینے پر مجبور کیا۔ تو نے مجھ کو بازاری عورتوں کے گھر کا رستہ دکھایا۔"

اس کا خیال تھا کہ یہ باتیں سن کر اس کی بیوی کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی اور وہ شدت غم سے بے ہوش ہو کر گر پڑے گی...... لیکن اس کی بیوی نے سب باتوں کے جواب میں تھالی اٹھائی اور چلی گئی۔

وہ ذہنی اذیت میں مبتلا کمرے میں وحشی درندے کی طرح ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گلی میں بلی کے بچے کھیل رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے پر لپکتے ہوئے چاندنی میں نظر آنے لگتے اور کبھی دیوار کے سائے تلے چلے جاتے وہ یوں ہی دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف گیا۔ چپکے سے جھانک کر دیکھا کہ اس کی بیوی خلاف امید روٹی کھا رہی ہے۔ اس کو اطمینان سے روٹی کھاتے دیکھ کر وہ اور بھی جل بھن گیا۔ اس کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ جھلایا ہوا واپس کمرے میں آیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کرسی پر گر پڑا۔

دن گذرتے گئے۔

گرمیوں کا موسم' دوپہر کے وقت وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ معاً شور وغل سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ عورتوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی بیوی کا پڑوسیوں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ عین اس وقت جب کہ جنگ زوروں پر تھی۔ وہ جاگ اٹھا۔

اُدھر سے آواز آئی۔...... اور وہ جو تمہارے بابو جی گانا سننے جاتے ہیں۔ بازاری عورتوں سے پریم بڑھاتے ہیں...... کیا یہ شرافت ہے؟''

اس کی بیوی چمک کر بولی۔ تو اس میں بدمعاشی کی بات کیا ہے۔ سبھی مرد ایسا کرتے ہیں...... لیکن تم کو آگ کیوں لگی۔ کیا تمہاری لڑکی کو اٹھا لائے تھے۔ یا جن کے پاس وہ جاتے ہیں تم ان کی سوکن ہو؟ آخر کیوں جلی مرتی ہو تم؟''

''مر جاؤ نہ شرم سے...... لے دے کے یہ رہ گئی شرافت۔''

اب لڑائی اور تیز ہوئی۔ اس کی بیوی بپھر کر چلائی۔'' جب تم ہی شرم کے مارے نہ مریں تو میں کیوں مروں؟ کیا تیرے باپ کا دیا کھاتی ہوں؟''

عورتوں کی لڑائی میں بھی خاص گُر برتے جاتے ہیں جو عورت دوسری کے زیادہ سے زیادہ بھید جانتی ہو وہی بازی لے جاتی ہے۔

پڑوسن نے قہر آلود آواز میں کہا۔''ہمیں کیا شرم ...... ہم نے کیا بدمعاشی کی؟''

''بدمعاشی؟ ...... وہ لمبے لمبے پٹوں والا جو تمہاری رنڈوی بہن کے پاس آتا ہے کون ہے۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو۔ اور وہ جو تمہاری چندرا بھاگ گئی تھی موٹر ڈرائیو۔ کے ساتھ...... اور جناب دو رات گل چھرے اڑانے کے بعد آئی واپس......''

پڑوسن کی یہ سب سے زیادہ دکھتی رگ تھی۔ اس بات پر تو وہ روہنکی ہوگئی۔

''تو جو ہے نا بدمعاش ...... سب کو وہی کچھ سمجھو گی......''

معلوم ہوتا ہے اس وقت پڑوسن کے شوہر باہر نکل آئے۔ وہ ناک میں بولتے تھے نہ معلوم انہوں نے ناک میں گنگنا کر کیا کہا۔ اس کی بیوی نے بھی کچھ جواب دیا۔ تب بابو ذرا بلند آواز میں بولا۔''گوں زارش یہ ہیں کہ آخر آنپ......''

اس پر اس کی بیوی کو اور طیش آیا۔ خبر دار! جو تو نے عورتوں کی لڑائی میں دخل دیا۔ یہ ''گوں زارش'' اپنی میّا سے کہیو جا کر۔ وہ اندر سوئے پڑے ہیں۔ ابھی جگا دوں تو سر پر وہ جوتے پڑیں کہ ایک بال نظر نہ آئے چندیا پر......''

اس پر پڑوسی نسبتاً دھیمی آواز میں بڑ بڑ کرتے اندر گھس گئے اور اس کی بیوی پہلے تو زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی آئی۔ لیکن اس کے کمرے میں سے دبے پاؤں گذر گئی تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد کپڑا سینے کی مشین چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ گھڑی پر نظر پڑی۔ ساڑھے پانچ ہو چکے تھے۔ سات بجے گرانڈ ہوٹل میں پارٹی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ شراب کے دور کے بعد کھانا بھی ہوٹل میں کھایا جائے اور پھر گلزار بیگم کا گانا سنا جائے ۔ اچھا ہوا جو اس کی آنکھ کھل گئی۔ ورنہ نا معلوم وہ کب تک پڑا سویا رہتا۔

نہا دھو کر وہ بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں پر بُرش پھیرنے لگا۔ قریب اس کی بیوی چٹائی پر بیٹھی کپڑے سی رہی تھی۔ وہ حسب معمول خاموش تھا۔ لاتعلقی سے اپنے بال سنوار رہا تھا۔ معاً اس کو کپڑے دیکھ کر تعجب ہوا...... بچے کے کپڑے؟

کتنے عرصے سے اس نے اپنی بیوی کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ اس کے کام چھوٹا نوکر کرتا۔ وہ اپنے گھر سے بے خبر دن گذار رہا تھا۔ نہ اس نے کبھی بیوی کی طرف توجہ دی۔ نہ اس کو بات چیت کا موقعہ دیا۔ اس کی بیوی ایک بچے کی ماں ہونے والی تھی۔ آج تک وہ اس بات سے بے خبر تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پہلے وہ درمیانی دروازے کے پردے کو احتیاط سے پھیلا دیا کرتا تھا۔ لیکن اب کے وہ پردہ پھیلانا بھول گیا۔ موزے پہننے کے بعد اس نے بوٹوں کے تسمے باندھے۔ جب ٹائی کو گرہ دینے لگا تو آئینے میں اپنے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ دکھائی دی ۔ وہ پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور سائیکل پر سوار ہو کر بازار کی طرف چل دیا۔

ہوٹل کے باہر وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہ کچھ شش و پنج میں تھا۔ اگر صرف آج کے دن وہ پارٹی میں شامل نہ ہو تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر وہ

ایک مرتبہ ہوٹل میں داخل ہوگیا تو دوست اس کو ہرگز نہ آنے دیں گے۔

اتنے میں پیارے لعل آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر وہ دونوں حسب معمول بغل گیر ہوگئے۔ ''میرے یار! اس جگہ کیوں کھڑے ہو چلو نا اندر''

اس نے معذرت چاہی۔ کئی بہانے گھڑے۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ اس نے پیارے لعل کو سمجھا دیا کہ وہ اس کی طرف سے دوستوں سے معافی مانگ لے۔ پیارے لعل اس سے دوسرے دن کا وعدہ لے کر چلا گیا۔

اس کام سے فرصت پانے کے بعد وہ ایک معزز اور ذمہ دار شخص کی طرح ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔

رات ہوگئی۔ اس نے گھر کو واپس جانے کی ٹھانی۔ ہاتھ میں رس گلوں کا آبخورہ لیے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی اس وقت چھت پر خشک کپڑے جمع کر رہی تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ آبخورہ ریڈیو کے پاس تپائی پر رکھ دیا مشین کے قریب ادھ سلے کپڑے پڑے تھے۔ وہ ان کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ اس نے فوراً کپڑے پھینک دیئے۔ اس کا ایک ہاتھ مشین کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دوسرا آبخورے کی طرف۔ وہ ہکلا رہا تھا۔ بیوی کی اچانک آمد سے وہ اس قدر گھبرا گیا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اس کی بیوی نے اتنے دنوں کے بعد اس کے پھیلے ہوئے بازو دیکھے تو اس کے چہرے پر خون کی سرخی جھلکنے لگی۔ محجوب ہو کر بولی۔ ''جی میں بھول گئی......''

اس نے صابن دانی اٹھائی اور تولیہ جھپٹ کر، سلیپر چٹپٹاتی غسل خانے کی طرف چلی۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'تار و پوذ' میں شامل ہے۔

بیمار

محض بارش ہوتی تو خیر، مشکل تو یہ تھی کہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس قدر تیز و تند کہ انسان کے پاؤں زمین سے اکھڑ جائیں۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے پانی کی بوندیں بھی ترچھی ہو کر بھالوں کی طرح گر رہی تھیں۔ جلدی جلدی کھانا کھانے کے بعد وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اور اب بے صبری سے کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا کہ بارش تھمے تو وہ دفتر کو چل دے لیکن بادل تھے کہ گھر گھر کر چلے آتے تھے۔ چھا جوں پانی برس چکا تھا اور ابھی ایسے برسے جارہا تھا جیسے آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گا۔

وہ چاہتا تھا کہ آج وہ بروقت گھر سے چلے تاکہ دفتر میں پہنچ کر منیجر کی کٹی جلی باتیں نہ سننی پڑیں۔ دو دن سے اسے دیر ہو رہی تھی۔ ایک دن کھانا بر وقت نہ پک سکا۔ دوسرے دن اس کی قمیص میں بٹن ہی نہ ٹنکے تھے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا قصور در اصل اس کے چڑچڑے بچے کا تھا لیکن اس نے غصہ میں آکر بیوی کی پیٹھ پر ایک دھول جمادی اور آج بارش نے آن لیا۔ بوندوں کے شور اور ہوا کی سنسناہٹ میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ گلی میں پانی کی چھوٹی موٹی لہریں سانپ کی سی تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر لپکی جارہی تھیں اس پر طرہ یہ کہ محلہ بھر کے مکان کے پرنالوں سے پانی کے گرنے کا غل۔ بارش میں شرابور کتے دم دبائے گوشوں میں دبکتے پھرتے تھے۔

آخر کھڑے کھڑے گھر پر ہی دس بج گئے۔ وہ چھتری لے کر نیچے اُترا۔ سائیکل ڈیوڑھی سے نکال کر گلی میں کھڑی کی اور پھرتی سے چھتری کھول کر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ ہوا کے ایک ہی تند جھونکے سے چھتری کی کمانیاں اُلٹ گئیں۔ اس مضحکہ خیز صورت میں چھتری ادھ کھلے پھول کی طرح نظر آنے لگی۔ وہ سائیکل سے اترا۔ چھتری کو پھر سے درست کر کے سائیکل پر بیٹھا۔ پیڈل پر زور ڈالا ہی تھا کہ چھتری کی کمانیاں پھر الٹ گئیں۔ وہ ڈیوڑھی کے اندر چلا آیا۔ چھتری بیوی کے ہاتھ میں تھما دی اور بلا چھتری کے جانے کی ٹھانی۔ سب سے نیچے اس کے بدن پر ایک بنیائن تھی۔ اس کے اوپر ایک پرانا سوئٹر۔ اس پر قمیص اور قمیص پر اس نے بند گلے کا سوئٹر پہن لیا۔ گرم کوٹ کے کالر دہرے کر کے پن لگا دی تا کہ سینہ سرد ہوا سے محفوظ رہے۔ ٹوپی پر رومال باندھ لیا۔ سائیکل پر سوار ہو کر یا علی! کہہ کر اس نے زور لگایا۔ پہیے چرخ چوں کر کے گھومے۔ اور جب تک وہ گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ اس کی بیوی کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں دروازے کی دراڑ میں سے جھانکتی رہیں اور اس کے دوپٹے کا میلا آنچل دروازے میں سے باہر نکل نکل کر لہراتا رہا۔

بادل جھکے پڑتے تھے۔ بوندوں کی تاریں سی بندھ گئی تھیں۔ بارش کی بوچھاڑ، اور جھڑی میں انسان دور تک دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کڑا کے کی سردی جگر تک اُترتی چلی جاتی تھی۔ بارے بنک کی بلند عمارت کی دیواریں نظر آنے لگیں۔ سرمئی رنگ کے بڑے بڑے چکنے پتھر پانی میں بھیگے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے عظیم الجثہ کچھوے قطار اندر قطار اوپر تلے دھرے ہوں۔ وہ سائیکل اٹھا کر جلدی سے بڑے دروازے کے اندر داخل ہوگیا۔

وہ پانی میں تربتر ہوگیا تھا۔ ٹوپی بھیگ کر سکڑ گئی۔ مونچھیں گیلی ہو کر نیچے بیٹھ گئیں۔ کپڑے تر ہو کر کالے سے نظر آنے لگے تھے۔ بوٹ علاحدہ پھٹ پھٹا رہے تھے۔ سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ناک سے پتلی رطوبت بہہ رہی تھی۔ انگلیاں بالکل بے جان۔ کان سرخ اور ناخن ہلکے نیلے رنگ کے ہوگئے تھے۔

دفتر دوسری منزل پر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ ایک کلرک اوپر سے نیچے آرہا تھا۔'' ہلو عارف! آج منیجر صاحب بھرے بیٹھے ہیں۔''

یہ سن کر عارف کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ٹوپی کو ہاتھ پر پے در پے پٹخیاں دیں۔ رومال نچوڑ کر کوٹ پر پھرایا اور پھر دبے پاؤں دفتر میں داخل ہوا۔ دعا مانگ رہا تھا خدایا! منیجر اپنے کمرے میں ہو۔ لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ منیجر دفتر کے بڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ وہ چپکے سے لپک کر اپنی اونچی کرسی پر جا بیٹھا۔ رجسٹر اٹھا کر ادھر اُدھر رکھنے لگا۔ اپنے گیلے کپڑوں اور بھیگے ہوئے جوتوں کے سبب وہ عجیب بے چینی سی محسوس کر رہا تھا — بنک کے کلرکوں کے لیے کوئلوں کی انگیٹھیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ منیجر ٹلے تو وہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی ٹانگوں کے درمیان رکھ لے۔

دفعتاً منیجر مڑا۔ وہ کچھ لمبا اور اکہرے بدن کا شخص تھا۔ ادھیڑ عمر سڑیل مزاج۔ اس کے چہرے سے خشونت کے آثار ہویدا تھے۔'' تم آج پھر پون گھنٹہ لیٹ ہو۔''

وہ خاموش رہا۔ کل اور پرسوں بھی تم دیر سے آئے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہو۔ کماتے کھاتے ہو۔ پڑھے لکھے ہوش مند ہو۔ آخر تم کو اپنی ذمہ داری کا احساس کیوں نہیں؟

وہ ذمہ داری کے احساس سے معرا تو نہ تھا — اس نے دبی زبان میں بارش کا عذر پیش کیا۔

اس پر منیجر آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے بہت لعنت ملامت کی۔ پھر اس نے دیر سے آنے کی وجہ کا تحریری جواب مانگا۔ اس پر عارف کو بہت خوشامد کرنی پڑی اور ہاتھ جوڑنے پڑے۔ وہ تحریری بیان دینے سے کتراتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح اس کا ریکارڈ خراب ہوجاتا۔ بڑی مشکل سے منیجر نے اس کو معاف کیا اور وہ منیجر کے کمرے سے نکلا تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں طبیعت مضمحل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سب لوگ اسی

کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بلا کسی سے آنکھ ملائے اس نے دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی اپنے قریب گھسیٹ لی۔

پندرہ بیس منٹ بعد اس کے حواس درست ہوئے۔ اس نے چپکے سے چپڑاسی کو بازار بھیج کر چائے کا پیالہ منگوایا۔ اور جب طبیعت قدرے بحال ہوئی تو رجسٹروں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

دراصل آج کام کرنے کا دن نہ تھا۔ ہندوستان میں بادل کی آمد خوشی اور کھیل تماشے کی تمہید سمجھی جاتی ہے یا پھر سردیوں کی برسات میں انسان لحاف میں گھسا مال پوے کھائے اور کہاں یہ چالیس پچاس روپے کے لیے کڑاکے کی سردیوں میں بجلی کی روشنی میں آنکھیں پھوڑو۔ دن کے وقت بجلی کی روشنی میں کام کرنا سب سے بڑھ کر آفت تھی۔ اس پر اس کا بہت ہی برا ردعمل ہوتا تھا۔ پیشانی بھاری محسوس ہونے لگتی اور آنکھوں میں تکان آمیز درد۔

جب تک تیزی سے بارش ہوتی رہی۔ بنک میں کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ ادھر بارش تھمی اور اُدھر لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔اور پہلا ریلا ہی جو آیا تو ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ دوسرے روز بنک میں چھٹی تھی اس لیے بھیڑ اور بھی زیادہ ہوگئی۔

وہ سیونگ فنڈ کی کھڑکی پر مقرر تھا۔ چیک پر چیک چلے آتے تھے۔ اور اس پر ہر ایک کا یہی تقاضا کہ صاحب جلدی سے پاس کروا کر خزانچی تک پہنچوایئے۔ ہر ایک کو یہی شکوہ تھا کہ بنک میں کام درست نہیں ہوتا۔ خدا خدا کر کے اس کی کھڑکی کے آگے سے بھیڑ کم ہوئی اتنے میں ایک کالجیئیٹ آگے بڑھا۔ ’’کیوں صاحب ! آپ نے میرا چیک آگے بھیج دیا۔‘‘

’’جی ہاں! بھیج دیا۔‘‘

اتنے میں ایک اور نوجوان چیک لیے ہوئے آیا۔ اور اخاہ کا نعرہ لگا کر پہلے سے

بغل گیر ہوگیا۔ علیک سلیک کے بعد پہلے نے پوچھا۔ ''یار ڈیوڈ! بڑے دنوں کی چھٹیوں میں کہاں غائب ہوگئے تھے۔ تم تو چھٹیوں کے علاوہ پندرہ دن اور روپوش رہے۔''

ڈیوڈ نے کھڑکی میں سے چیک بڑھاتے ہوئے کہا۔ '' بھئی کچھ نہ پوچھو۔ بتادوں تو ہنسو گے۔''

دونوں خوش پوش' بے فکرے اور کھلنڈرے نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ عارف نے ٹوکن کا نمبر لکھ کر ٹوکن کھڑکی میں رکھ دیا۔ ڈیوڈ نے اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ '' تھینک یو۔''

ڈیوڈ کا دوست اصرار کر رہا تھا۔ '' قسم خدا کی مذاق نہیں اڑاؤں گا۔''

'' تو سنو یار! مسوری گیا تھا میں۔''

'' مسوری؟ اس قدر شدت کی سردی میں کیا دھرا تھا اس جگہ۔''

'' ارے کم بخت! تم کیا جانو ان باتوں کو۔''

اس کے بعد ڈیوڈ نے بتایا کہ وہ مسوری میں برف گرنے کا تماشہ دیکھنے گیا تھا۔ اس کو اس بات کا بڑا اشتیاق تھا۔ دراصل وہ ایک برات میں دہرہ دون گیا تھا۔ اس نے پہاڑوں کے سلسلے برف سے ڈھکے ہوئے دیکھے تو...... '' برات والوں سے رخصت لے کر میں نے بازار سے چند ضروری اشیا خریدیں۔ مچھلی کے بند ڈبے، مکھن، ڈبل روٹیاں، بسکٹ خشک میوے، منجمد دودھ کے دو بڑے ڈبے۔ اور آخر میں وہ ''نورنگی''...... دوسرے دن علی الصبح بستر اور کپڑوں کا سوٹ کیس تانگہ پر رکھ کر موٹروں کے اڈے پر پہنچا۔

تو ایک گھوڑے کا انتظام کیا۔ راجپورہ عین دامن کوہ میں واقع ہے اسی جگہ سے مسوری کی چڑھائی شروع ہوتی ہے جس دکان سے چائے پی اس نے بتایا کہ مسوری سے دو میل ادھر' یعنی بارلوگنج سے برف پڑنی شروع ہوجاتی ہے۔ اس لیے گرم کپڑے پہن کر چلنا چاہیے۔ گرم کپڑے تو خیر میں نے پہن ہی رکھے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر

دستانے' اوورکوٹ اور ایک شیشی میں'' نورنگی'' بھرلی...... ''نورنگی'' سمجھے نا؟ پاؤ ڈیڑھ پاؤ خشک میوہ جات ازقسم کشمش، خوبانی، مغز اخروٹ وغیرہ اوورکوٹ کی جیب میں بھر لیے۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی کہ وہاں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں۔ تم جانتے ہی ہو میں گرمیوں میں مسوری جایا کرتا ہوں۔ سوچا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ڈھونڈھ نکالوں گا۔

ڈیوڈ کا دوست ہمہ تن گوش تھا۔ ڈیوڈ اپنا قصہ اس قدر مزے لے لے کر بیان کر رہا تھا کہ عارف خود اسی کی طرف کان لگائے تھا۔

'' شاید تم کو معلوم ہو۔ راجپور۔ اور مسوری کے درمیان ایک مقام جھڑی پانی ہے اس جگہ میں نے ایک دکان سے جو اتفاق سے کھلی تھی چائے تیار کروا کر پی اور دم لے کر آگے بڑھا۔ اور بھئی جب بار لو گنج پہنچا تو قسم سے جی خوش ہوگیا۔ اب تم سے کیا بیان کروں۔ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تناور درخت خاموش کھڑے تھے۔ ایک طرف پہاڑی دوسری جانب سڑک کے کنارے کنارے پتھروں کی بنی ہوئی ڈھائی تین فٹ کی دیوار دیوار کے اُدھر انواع و اقسام کے پودے اور جنگلی جڑی بوٹیاں اور گہری کھائیاں اور کھڈ۔ پھر تا حدِ نگاہ پہاڑوں کے خوشنما سلسلے...... اس جگہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ برف گرتی دیکھی۔ بس یوں سمجھ لو جیسے روئی کے گالے۔ سپید' پاکیزہ' ہلکے پھلکے' دودھیا رنگ کے پھول سے' جیسے فردوس کی حوریں ٹوکریاں بھر بھر کر یہ پھول دنیا والوں پر پھینک رہی ہوں...... میں گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے نے بھی کنوتیاں ہلائیں۔ اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد پرسکون فضا میں جہاں اس وقت ایک چڑیا تک نہ بولتی تھی' میں نے گھوڑے کو کچھ دیر تک روکے رکھا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

جب مسوری ایک میل رہ گیا تو میں نے بجائے لندور کی طرف جانے کے کلڑی بازار کی طرف گھوڑے کی باگ پھیر دی اور بالکل میجسٹک سنیما کے پاس جا نکلا۔ اب تم سے کیا کہوں؟ جدھر نگاہ اٹھاؤ برف ہی برف۔ عمارتیں برف سے اس قدر ڈھکی ہوئی تھیں کہ چھتیں تک دکھائی نہ دیتی تھیں۔ کہاں وہ چہل پہل اور گہما گہمی اور کہاں یہ پر

اسرار خاموشی۔ —— رکشاؤں اور پہاڑی ٹٹوؤں کے اڈے، بازار، سنیما، دکانیں غرض ہر جگہ سنسان۔ جیسا کہ ہم لوگ قصوں میں پڑھا کرتے تھے کہ جب آدم خور دیو کی آمد آمد ہوتی تو لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ میں روائتی ہیرو شہزادے کی طرح گھوڑے پر سوار تن تنہا بازار میں سے گذرنے لگا۔ دل میں کرید پیدا ہوئی کہ آخر ٹھکانہ کس جگہ ہوگا۔ کوئی دکان یا ہوٹل کھلا نظر نہ آتا تھا۔ میں الفا ہوٹل کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ قلیوں کو بھی اسی جگہ پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہوٹل کا بڑا پھاٹک بند ہے۔ بلند آواز میں پکارا۔ لیکن جواب ندارد۔ ہوٹل کا پھاٹک بڑی سڑک پر واقع تھا۔ پھاٹک سے ہوٹل کی عمارت تک ایک ہموار سڑک چلی گئی تھی۔ ہوٹل کی عمارت پچاس ساٹھ قدم پرے بلندی پر پرشکوہ انداز میں کھڑی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بڑی سڑک پر سایہ دکھائی دیا۔ برف کے گرتے ہوئے تودوں میں سے کسی آدمی کو پہچاننا بھی دشوار تھا۔ سمجھا قلی آن پہنچے۔ لیکن جب وہ شخص قریب آیا تو معلوم ہوا کہ قلی نہیں بوری اوڑھے کوئی اور ہی شخص تھا۔ اس نے آتے ہی پھاٹک میں لگے ہوئے تالے کو کھولا اور اندر جانے لگا تو میں نے بات چیت شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ ہوٹل بند ہے۔ میں نے اس کی منت بھی کی بھائی کوئی ٹھکانہ بتاؤ۔ لیکن اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آگے بڑھ کر پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا حجور! ہم رشوت نہیں لیتے مالک کے حکم سے ہوٹل کھولنے کی اجازت نہیں۔ سب کمرے بند ہیں۔ نکڑ والے کمرے کی چابی میرے پاس ہے۔' میں نے مزید رعب جمانے کے لیے کہا بھائی! ہم تو ہمیشہ اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی اسی بھروسے پر چلے آئے ——

میرے خیال میں مالک نے بھولے بھٹکے مسافر سے روپیہ وصول کرنے کے لیے اسے ایک کمرے کی چابی دے رکھی ہوگی اور نوکر اپنے ٹکے کھرے کرنے کے لیے اسی شخص کو جگہ دیتا ہوگا جو اسے رشوت دے —— کمرہ خوب سجا ہوا اور آرام دہ تھا۔ دراصل

دو کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا کمرہ اس کے پیچھے ایک چھوٹا کمرہ۔ باتھ روم وغیرہ۔ اس کے علاوہ کمرے کے آگے برآمدہ۔ اس جگہ سے پہاڑوں کا نظارہ خوب تھا۔ اس لحاظ سے دو روپے یومیہ کرایہ۔ بہت کم تھا......"

یہ کہہ کر ڈیوڈ خاموش ہوگیا۔ اور اس کے ساتھی نے اندر جھانک کر پوچھا۔

"کیوں صاحب چیک پاس ہوگیا کیا؟"

عارف کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔ "جناب! میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ اکاؤنٹنٹ صاحب کے دستخط ہو جائیں تو چیک آگے بھیجا جائے۔"

'س پر اسے بہت طیش آیا۔ ہندوستانیوں کی نا اہلیت پر لکچر دے ڈالا۔ پھر ڈیوڈ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "یار تمہارے دن اچھے کٹ گئے کئی روز ٹھہرے وہاں۔"

ڈیوڈ نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ چار پانچ روز کے بعد واپسی کا بگل بجے۔ لیکن بائیس دن تک ٹکا رہا۔"

"کیوں کیا کوئی خاص بات پیش آئی؟"

"ہاں یار بڑے مزے کی بات تھی۔"

"بھئی ہم بھی تو سنیں۔"

ڈیوڈ نے اپنے ساتھی پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "غالباً تیسرے روز کا ذکر ہے۔ بعد از دوپہر چار بجے کے قریب میں برآمدے میں آرام کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹی تپائی دھری تھی۔ میں "نورنگی" کا ایک پیگ پینے کے بعد بیٹھا انڈوں کے ٹکڑے کھا رہا تھا۔ برف کے تودے حسب معمول گر رہے تھے — گرمیوں کے دنوں میں زیادہ رونق کتاب گھر پر ہوتی یا کلڑی بازاری میں عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف طرح طرح دار عورتیں آرائش جمال کے بعد بازاروں میں ہم ہما کر نکلیں — دوسری جانب تماشائیوں کا ہجوم بظاہر اپنے کاموں میں مصروف — اس طرح جوہریوں کی دکانیں اُدھر فوٹو گرافروں کی۔ ادھر بھی سجائی دکانوں میں خرید و فروخت

ہو رہی تو اس طرف ہوٹلوں میں کاک ٹیل پارٹیوں کے ہنگامے ـــــ یورپین ہندوستانی پہاڑی سبھی لوگ نظر آتے تھے۔ رکشاؤں کی بھی خوب ریل پیل ہوتی اور پھر گھوڑوں اور ٹٹوؤں کی بھرمار ـــــ کبھی گرجے کے دل کش گھنٹے بج اٹھتے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے سامنے پھیلی ہوئی وادی میں شہر دہرہ دون کی عمارتیں حقیر کنکر پتھروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اور پھر رات کو سونے پر سہاگہ ہو جاتا۔ مسوری دلہن کی طرح آراستہ و پے راستہ نظر آنے لگتی۔ تبھی تو اسے "پہاڑیوں کی ملکہ" کہا جاتا ہے ـــــ کہاں وہ نظارے اور کہاں یہ منظر کہ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ روئی کے گالے گر رہے ہیں۔ کوئی دکان کھلی ہوئی نہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہر طرف زندگی کے آثار مفقود ہیں۔ گرجے کی باوقار عمارت برف تلے دبی جاتی ہے۔ ہر رستے پر سفید روغن سا پھر گیا ہے۔ سنسان بازار اور عمارتیں بہت پر اسرار نظر آتی ہیں۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ ہلکے سرور میں میں ان نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اتنے میں دور سے چند متحرک سائے نظر آئے۔ تعجب ہوا۔ سائے بڑھتے ہوئے جب بالکل قریب پہنچے۔ تو میں نے جھک کر دیکھا کہ کوئی پورا خاندان کا خاندان چلا آرہا تھا۔ سوچا کوئی ہمارے ہی ساتھی ہیں برف دیکھنے کے شیدائی ـــــ میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ پھاٹک میں سے گذر کر ہوٹل کی طرف بڑھے۔

وہ لوگ تھکے ماندے قدم اٹھاتے میرے قریب پہنچے۔ مجھ سے پوچھنے لگے۔ یہاں کوئی کمرہ خالی ہے۔ میں نے آگے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ نوکر سے دریافت کر لیجئے وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ صورت سے عیسائی معلوم ہوتے تھے۔ کچھ مبہم سا خیال تھا کہ جو صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔ ان کو پہلے بھی کسی جگہ دیکھا تھا۔

جب وہ لوگ برآمدے کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ تو نوکر باورچی خانے میں سے باہر نکل آیا اور وہ بات چیت کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

نوکر نے قطعی انکار کر دیا۔ ہر چند انہوں نے بہت اصرار کیا۔ لیکن در اصل نوکر

ر تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے بعد وہ صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر
لے۔ ''جناب آپ ہی اس کو سمجھائیے۔'' میں نے جواب دیا۔'' لیکن صاحب! در
ت نوکر بے بس ہے۔'' اب وہ صاحب انگریزی زبان میں کہنے لگے۔'' ذرا غور
یئے۔ میرے ہمراہ چار بچے ہیں۔ آخر ان کو لے کر کہاں جاؤں۔ سچ عرض کرتا ہوں
بازار بند ہے۔ نہ کوئی دوکان کھلی ہوئی ہے اور نہ کوئی ہوٹل۔ اتنا وقت بھی نہیں کہ
ں چلا جاؤں۔ آپ اس شخص کو کہیے کوئی نہ کوئی کمرہ ضرور ملنا چاہیے۔''

میں نے اچٹتی ہوئی نگاہ ان کے خاندان پر ڈالی۔ ان کی بیوی کی عمر چالیس
، کے قریب ہوگی۔ لیکن صحت ور عورت تھی۔ گود میں بچہ تھا۔ غالباً لڑکا۔ باقی تین
ں تھیں دو کمسن ایک جوان۔ جب میں نے بڑی لڑکی کو دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو
رہ گیا......''

ڈیوڈ کے ساتھی کا منہ ذرا سا کھل گیا۔

''............ اب تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ میں نے اس لڑکی کو کبھی پہلے کسی جگہ
ا ہے میں کھڑا ہوگیا۔ اس شخص کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔''جناب میرا
، ہے کہ میں نے آپ کو نیز آپ کی فیملی کو پہلے بھی کسی جگہ دیکھا ہے۔'' وہ بولے۔
ھے بھی یہی شک گذرتا ہے۔'' چندے سکوت کے بعد کہنے لگے۔'' اگر میں غلطی نہیں
! تو تقریباً چار برس پہلے میں نے آپ کو لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مہتہ کے ہمراہ
ا تھا۔'' اب مجھے بھی یاد آیا ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں میں بحث بھی
، تھی۔ اور میری گفتگو سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ پوچھنے لگے۔ آپ ہی کا نام ڈیوڈ
...... ہم آپ کے مضامین ''مسیحی دنیا'' میں پڑھا کرتے ہیں' ہم ایک دوسرے کو
ن گئے۔ پھر تو بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا گیا۔ خیریت دریافت کی گئی۔ بچوں کے
پر ہاتھ پھیرا گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر انہیں کچھ اعتراض نہ ہو تو میرے
ے میں گذارہ کر لیں۔ وہ بہت شکر گذار ہوئے اندر جاکر انہوں نے کمرہ دیکھا تو

بہت خوش ہوئے۔ سارا سامان اندر منگوا لیا گیا — میرے سنسان کمرے میں چہل پہل ہوگئی۔ ایک گھنٹہ بعد ہم دونوں برآمدے میں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی بیوی نے چائے بھیجی۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ بھی باہر آ جاؤ۔ آخر شرمانے کی بھی کیا بات ہے؟ ڈیوڈ اپنا لڑکا ہی تو ہے۔ اس پر ان کی بیوی باہر آئیں۔ معذرت کرتے ہوئے بولیں۔ بیٹا دل میلا نہ کرنا۔ سب چیزیں ٹھکانے لگا لوں ذرا پھر ہم اکٹھے ہی کھایا پیا کریں گے۔ اس وقت برتن کم ہیں۔ بوری میں سے برتن نکال کر صاف کر لیے جائیں گے تو پھر کوئی دقت نہ ہوگی۔'' اس کے بعد یہ سمجھ لو کہ مجھے کچھ بھی تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ یوں تو ان کی آمد سے پہلے بھی نوکر روٹی پکا دیا کرتا تھا۔ لیکن وہ مزا کہاں۔ اس رات بڑی رغبت سے کھانا کھایا۔ ہم لوگ جلد ہی آپس میں گھل مل گئے۔ ایک تو میری وجہ سے ان لوگوں کی پریشانی دور ہوئی۔ دوسرے میں ان کا پرانا شناسا نکلا۔ تیسرے وہ میرے مذہبی مضامین پڑھتے رہے تھے۔ غرض ہر طرح سے وہ مجھ سے مرعوب ہو چکے تھے......''

ڈیوڈ کے دوست نے بے چینی سے کہا۔ ''بھئی وہ لڑکی کون تھی۔ پہلے اس سے تعارف کیسے ہوا تھا؟''

'' سنو وہ بات بھی بتلاتا ہوں — تقریباً چار برس پہلے کا ذکر ہے میں اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں چند لڑکے اور دو پروفیسر تفریحی دورے کے لیے جنوبی ہندوستان کی طرف گئے۔ جن دنوں ہم جبل پور میں مقیم تھے۔ تو ایک دن اور سب لوگ وہاں کا ایک آب شار اور سنگ مرمر کی چٹانیں دیکھنے چلے گئے۔ چونکہ میں اور پروفیسر مہتہ ان چٹانوں کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لیے ہم لوگ نہ گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد پروفیسر مہتہ کہنے لگے بھئی کہو تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جناب شہر سے واقف نہیں۔ ایک مرتبہ کسی تقریب پر آیا تھا۔ اس لیے چٹانیں ہی دیکھ پایا۔ اور کسی شخص سے واقفیت نہیں — مہتہ کہنے لگے میں ایک دوست کے ہاں

جارہا ہوں چاہو تو میرے ساتھ چلو سیر ہو جائے گی — میں چل دیا تو بھئی انہیں صاحب کے ہاں پہنچے انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اس وقت میں نے ان کی لڑکی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ تیرہ چودہ کا سن۔ رنگ اگرچہ گندمی تھا۔ لیکن جسم تھا کہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور پھر ہر لڑکی کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے دل کش چیز اس کے ہونٹ اور اس کی مسکراہٹ تھی۔ ہونٹوں میں نہ جانے پارہ بھرا تھا۔ یوں لفظوں میں جو زندگی ان کے اندر کروٹ لے رہی تھی اس کا بیان کرنا ناممکن ہے اور پھر وہ مسکراہٹ...... یوں تو ایک سے ایک حسین لڑکی نظر سے گذری ہے لیکن ایسی دل فریب توبہ شکن مسکراہٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ معلوم قتالہ کی مسکراہٹ میں کیا کشش تھی۔ ایک مرتبہ بھولے سے مسکرا دے تو انسان بندۂ بے دام ہو جائے...... اسی روز رات کے وقت انہوں نے ہماری دعوت بھی کی۔ اس وقت مولی، یہ اس کا پیارا نام تھا، کمسن لڑکی تھی۔ مسکراہٹ ہر دم لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ لیکن بھئی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اس وقت میری عمر بھی یہی اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ میں نے اس سے خوب گھل مل کر باتیں کیں۔ جب وہاں سے چلا آیا۔ بس' کچھ نہ پوچھو دنوں تک ذہن پر سرور طاری رہا۔ اور دل کی خلش تھی کہ مٹائے نہ مٹتی تھی۔ لیکن حوادثِ زمانہ نے سارے تصورات مدھم کر دیئے وہ برق ریز مسکراہٹ دھندلی پڑ گئی۔ اب جو وہ معشوقہ نظر آئی تو کلیجہ اچھل کر حلق میں آن رہا۔ بارے دل سنبھلا......''

ڈیوڈ کے ساتھی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یار اب تو بیٹھی سٹھ گئی ہوگی۔''

'' ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اب تو وہ جو بن نکالا تھا کہ نگاہ نہ ٹکتی تھی۔ کیا بناوٹ تھی جسم کی۔ کیا لچک تھی عضو عضو میں۔ کیا لباس کی پھبن تھی...... اور اس بھولی بسری مسکراہٹ کا اب کیا ٹھکانہ تھا۔ اگر کبھی بھی نظر سے دیکھ لے تو بڑے سے بڑا پرہیزگار ہستی بھول جائے۔ سچ پوچھو تو میری ہستی بھی کیا تھی اس کے سامنے......''

دوسرے نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''یار کچھ گٹھ جوڑ بھی

ہوا۔ یا بس یوں ہی دور ہی دور سے مزا کیے۔''

'' کچھ نہ پوچھو...... بھئی ان دنوں کو میری زندگی کا ماحصل سمجھو — وہ لوگ بڑے ملنسار تھے۔ کھانے پینے کا وافر سامان اپنے ہمراہ لائے تھے۔ پہلے روز ہی ہم لوگ ایسے گھی شکر ہوگئے جیسے مدت سے اکٹھے ہی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یار میرا دل تو ایسا الجھا کہ وہاں سے آنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ لیکن تھوڑا بہت تکلف بھی لازمی تھا۔ چوتھے روز میں نے کہا کہ اب میں چلا جاؤں گا۔ پہلے تو سبھی نے ہنسی میں ٹال دیا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں اس معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں تو سب لوگ اصرار کرنے لگے۔ اس وقت ہم رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی اماں بولیں۔'' بھئی رائے شماری کی جائے۔'' چنانچہ جب یہ کہا گیا کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسٹر ڈیوڈ اسی جگہ رہیں وہ ہاتھ اٹھا دیں تو سبھی نے ہاتھ اٹھا دیئے سوائے مولی کے۔ پاپا نے عینک کے نیچے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کرتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا اشارہ کیا۔ لیکن مولی بولی۔ دیکھئے پاپا! یہ ڈماکریسی ہے ڈکٹیٹر شپ نہیں...... میری آزاد رائے تو یہ ہے کہ اگر مسٹر ڈیوڈ جانا چاہتے ہیں تو ان کو نہ روکا جائے — یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی برق پاش نظروں سے دیکھا کہ ہزار جانے کی کوشش کرتا نہ جاسکتا۔ میں کچھ خفیف سا ہو کر بولا۔'' اچھا بھئی اس معاملے میں '' بلیبی'' کی رائے لے لی جائے۔'' ان کے چار پانچ ماہ کے بچہ کو ہم بلیبی کہا کرتے تھے۔ تین لڑکیوں کے بعد یہی ایک لڑکا تھا۔ والدین کی آنکھوں کا تارا، تینوں بہنوں کا دلارا۔ خوب موٹا تازہ پیارا بچہ تھا۔ اس وقت ہمک ہمک کر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ امی نے کہا۔ کیوں بلیبی! تم رائے دوگے۔ نہیں بھئی ابھی میں تو چھوٹا سا ہوں۔ ابھی میں بول بھی نہیں سکتا...... میں نے کہا کہ آپ بلیبی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر میز پر کھڑا کیے رکھیں۔ اگر وہ داہنا پاؤں اٹھائے تو میں رک جاؤں گا۔ اور اگر وہ بایاں اٹھائے تو میں چلا جاؤں گا۔ اس بات پر خوب لے دے ہوئی۔ سبھی اس بات کے خلاف تھے۔ بالآخر بلیبی کو میز پر کھڑا کیا گیا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ خوشی

کے مارے کلکاریاں مار رہا تھا — اس کے دونوں پاؤں میز پر ٹکے ہوئے تھے — پہلے اس کا دایاں پاؤں اوپر اٹھ گیا۔ اس پر خوب ہلڑ مچا۔ قہقہے لگائے گئے...... چنانچہ مجھ کو رکنا پڑا...... تھوڑی دیر بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ آج مولی بڑی بے باک نظروں سے گھورتی رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کروٹیں لیتی رہی اور ہونٹ دعوت دیتے رہے۔ موقع پا کر میں نے اس کی لچکتی ہوئی کمر میں چٹکی لے لی تو تڑپ کر بل کھا گئی......''

ڈیوڈ رُکا۔ اس کے ساتھی نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔ '' بڑا ہاتھ مارا استاد!''

'' ابھی کیا...... ایک دن شام کے وقت ہم دونوں دیر تک باہر گھومتے رہے......''

'' تو وہ تم دونوں کو اجازت دے دیتے تھے؟''

'' ارے بھائی! وہ بھی کوئی مسلمنجی تھی کہ برقع میں لپٹی گھلا کرتی...... تو بھئی اسی طرح گھومتے گھومتے شام خوب گہری ہوگئی۔ تاریکیاں چھانے لگیں۔ وہاں بس برف کا تماشا خوب تھا۔ روئی کے پھوئے سے جھڑ رہے تھے۔ ہم گرجے کے پچھواڑے جا کھڑے ہوئے۔ سامنے دور تک نگاہ نہ جاتی تھی۔ درختوں کی گھنی شاخیں برف کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔ جب برف زیادہ ہوجاتی تو پھسل کر نیچے گر پڑتی — میں نے سگرٹ کیس میں سے سگرٹ نکال کر سلگایا۔ اور یوں ہی از راہِ مذاق سگرٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا...... وہ بولی۔ '' کوئی دیکھ نہ لے۔'' — یہ کہہ کر اس نے ایک سگرٹ اٹھا لیا۔ میں نے دیا سلائی بڑھائی اور ایک بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ وہ چپ چاپ سگرٹ پیتی رہی۔ میں اس کے ساتھ سٹ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بلکہ میری طرف اپنی کٹاری سی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بجلیاں گرانے لگی۔ اس خاموش گوشے میں کس قدر دل کش نظر آ رہی تھی۔ اس کی توبہ شکن مسکراہٹ کو برداشت کرنا میری قوت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے اس کے نرم پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو چوما اور پھر پاگلوں کی طرح لپٹا لپٹا کر اس کے ہونٹ ابرو رخسار، آنکھیں، گردن سبھی کچھ چوم ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال

سی ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ بولی۔ ''بس اب تو رک جایئے......'' پھر ہم ہانپتے کا
واپس آئے — اس کے بعد وہ مجھ سے اس بے باکی سے آنکھیں نہ ملاتی تھی۔ :
قہقہے ہی لگاتی۔ لیکن میری دل جوئی کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتی تھی۔''

ڈیوڈ کے ساتھی کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑتی تھیں۔'' یار ڈیوڈ تم تو بڑے گھ
نکلے...... اچھا تو پھر......کبھی......!''

ڈیوڈ نے پھر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کو ہموار کیا۔'' ......
مرتبہ شام کو میں اسے گھمانے کے لیے لے گیا۔ طبیعت کچھ خراب تھی۔ اماں سے کہ
میں فوراً ہوا کھانے جارہی ہوں...... مسوری میں ایک سڑک ہے کیملز بیک روڈ...... ر
سنسان رہتی ہے۔ گرمیوں میں بھی اس سڑک پر زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی۔ بعض
سڑک کے کنارے پر حجرے سے بنے ہوئے ہیں۔ اوپر چھت ہوتی ہے۔ چا
طرف محض جنگلہ لگا ہوتا ہے۔ اندر سیمنٹ کے بنچ بنے ہوتے ہیں...... ہم لوگ تھک
اسی قسم کے ایک حجرے میں بیٹھ گئے...... یار! شاید تم بار بار برف کا ذکر سن کر پریشا
رہے ہوگے لیکن سچ کہتا ہوں برف کی وجہ سے مسوری جادو نگری بنی ہوئی تھی۔ بڑ
یار، ٹیلے، کھڈیں، پہاڑ، سڑک ہر چیز برف سے اٹی ہوئی کس قدر خاموشی، سکون، ت
ہوا کے سرد جھونکے اور اس قدر طرح دار معشوقہ میرے ساتھ تھی — کہنے لگی سر میں
سا درد ہے۔ اتفاق سے میری جیب میں ''نورنگی'' کی چھوٹی سی شیشی تھی۔ میں ۔
اس کو دوا کہہ کر پلا دی۔ اسے بنچ پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر آہستہ
سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے ہونٹوں کو چوم کر پوچھا۔ اب سر میں
ہے کیا؟...... اس کے بعد میں نے پھر وہی حرکت کی۔ اسے بھی ہلکا سا سرور آگیا
نے بڑی گرم جوشی سے جوابی کارروائی کی...... یار ہم دونوں تو ہوش و حواس کھو بیٹھے
مجھ سے بری طرح لپٹ گئی۔ اور پیار و محبت کے کلمے کہنے لگی۔ بس پھر کیا تھا....
نے ......''

اس کے بعد ڈیوڈ آگے کو جھک کر کچھ کہنے کو تھا۔ کہ خزانچی نے ہانک لگائی۔
''ہاں صاحب! ٹوکن نمبر بتیس اور تینتیس۔''

خدا خدا کر کے چیک وصول ہوا۔ روپیہ لے کر جانے سے پہلے وہ پھر عارف کی کھڑکی کی طرف آئے بظاہر وہ رجسٹروں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ لیکن باطن میں اس کی تمام تر توجہ ان کی باتوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے کھڑکی کے آگے آ کر کہا۔
''لایئے صاحب! مجھے ایک نئی چیک بک عنایت کر دیجئے۔'' اس کے ساتھی نے پوچھا۔''
تو پھر تم بلا ناغہ اس حجرے میں جایا کرتے تھے۔''

'' بس میاں! پھر پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ہمیں فکر کاہے کی تھی ــــ میں نے اس کے فوٹو بھی لیے...... کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں دکھاؤں گا تمہیں۔ وہاں ایک جگہ ہے گن ہل۔ ہم اس پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اس جگہ میں نے اس کے کئی فوٹو لیے۔''

چیک بک لے کر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ چل دیئے۔ ڈیوڈ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' اس دن دھوپ شان دار تھی۔ میں نے اس کے کچھ پوز لیے پھر میں نے اس سے کہا بھئی اس طرح لطف نہیں آتا...... وہ بولی۔ اُس طرح مجھے شرم آتی ہے...... میں نے محبت کا واسطہ دیا۔ گلے سے لپٹا کر پیار کیا...... اور بھئی بڑی مشکل سے وہ جھینپ جھینپ کر بدن کے کپڑے......''

وہ دونوں سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ آتے چیک دیتے وہ ٹوکن پھینک کر کام میں مصروف ہو جاتا۔ اتنے میں ایک صاحب منشی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی چیک لکھنے لگے۔ پھر یکایک ہاتھ رک گیا۔ منشی سے مخاطب ہو کر بولے۔'' منشی جی! چار ہزار کافی ہوگا؟ کہو تو بڑھا دوں۔ پانچ ہزار سے کام چل جائے گا۔''

''جناب دو ہزار کی تو اگلے بدھ کو بھی ضرورت ہوگی۔''

''اجی چلو پھر منگوا لیں گے۔ ممکن ہے ہیرسن کمپنی والوں سے بل وصول ہوجائے۔ کتنا تھا وہ' تین یا ساڑھے تین ہزار......''

عارف نے بے جان ہاتھوں سے چیک پر کچھ لکھا۔ اور رجسٹر کھولا۔ منشی جی بولے۔''بابو جی! ذرا ہمارا حساب بھی بتا دیجئے۔''

عارف نے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا۔''چورانوے ہزار سات سو اڑتیں روپے گیارہ آنے......''

منشی جی نے عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ سیٹھ جی! اس بنک میں آپ نے بہت تھوڑا سا روپیہ رکھا ہے۔''

عارف نے چیک رجسٹر میں رکھ کر چپڑاسی کو دیا ہی تھا کہ اس کو اپنے چچا دکھائی پڑے۔ اس کو تعجب ہوا کہ چچا اس جگہ کیسے آن ٹپکے۔ خیر! وہ باہر نکلا۔

اس کے توندیل چچا ہنسے۔ ادھر ان کا پیٹ نیچے اوپر ہوا اور ان کی ٹوپی کا پھندنا لرزنے لگا۔ وہ بلا وجہ ہنستے ہوئے بولے۔''کہو برخوردار اچھے تو ہو۔ میں ادھر سے جا رہا تھا۔ سوچا برخوردار کو دیکھ لوں۔''

عارف کے چچا پہلے کسی شہر میں خوانچہ لگایا کرتے تھے۔ اب اپنے شہر میں ان کی پھلوں کی دوکان تھی۔ خوب روپیہ کماتے تھے۔ بلا کے چلتے پرزے...... عارف سوچنے لگا کہ چچا ایسے متوالے کہاں کہ یوں ہی دیکھنے چلے آئیں۔ پچھلے دنوں روپے کی انتہائی تنگی کی وجہ سے اسے کپڑا سینے کی مشین بیچ ڈالنے کا خیال آیا۔ چونکہ بزنس کے معاملے میں وہ نرا بدھو ہی تھا۔ اس لیے چچا کے پاس گیا۔ بولا چچا! یہ مشین بیچ کر نئی لینے کا خیال ہے۔ اس کا سودا کروا دیجئے کسی سے۔ چچا آمادہ ہوگئے۔ عارف نے دبی زبان میں کچھ روپے مانگے۔ چچا نے چالیس روپے دیئے اور پھر تیسرے روز کہا لو برخواردار تمہاری مشین پچاس روپے میں بک رہی ہے۔ دس روپے اور تھامو اور رسید لکھ دو عارف بے

چارا حیران۔ بولا چچا! یہ تو لوٹ ہے لوٹ۔ چچا بھی اس کی رگ سے واقف تھے بولے ۔ بیٹا! تو چالیس روپے لاؤ اور مشین اٹھالو۔ وہ بڑا گھبرایا۔ روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ اس نے کہا'' چچا میں اخبار میں اشتہار دے رہا ہوں۔ ممکن ہے کوئی اچھا گاہک مل جائے۔''

دو ہی دن گذرے تھے کہ چچا بنک میں آن دھمکے۔ ادھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد بولے۔'' بیٹا! تمہاری مشین کا وہ گاہک اپنے چالیس روپے واپس مانگتا ہے۔''

عارف جانتا تھا کہ چچا اس کی مشین ہضم کرنا چاہتے تھے۔ اس نے چچا کی بھاری بھرکم توند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' چچا کل اشتہار نکل آئے گا۔ ذرا صبر کیجئے نا!''

چچا نے مسکین صورت بنا کر کہا۔'' برخوردار تم جانتے ہی ہو۔ میں بال بچے دار معمولی دوکان درا ہوں۔ وہ شخص صبح شام دوکان پر آن کر تقاضہ کرتا ہے۔ اگر تم کو مشین نہیں بے چینی تو اس کے روپے دے ڈالو۔''

'' چچا روپے تو ایک ضرورت کے لیے آپ سے مانگے تھے میں نے۔''

چچا نے باچھوں سے پان کالا کھا صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔'' عارف بیٹا! وہ روپیہ میرا نہیں تھا۔ تم میرے بیٹے ہو سوچو اگر روپیہ میرا ہوتا تو میں تم سے طلب ہی کیوں کرتا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی مشین والا چالیس روپے مانگتا ہے روپیہ دے دو اور کسی کو دکھالو۔ باقی بعد میں دے دینا۔ اس نے میری بات پر اعتبار کیا۔ اور روپیہ دے دیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ اب تم نہ مشین دیتے ہو اور نہ روپیہ ہی واپس دینے پر تیار ہو۔''

اب عارف پر اصلیت روشن ہوگئی۔ لیکن مجبور تھا۔'' چچا مشین بیچنے کو میں تیار ہوں۔ لیکن وہ شخص تو مجھ کو لوٹنا چاہتا ہے۔''

بیٹا مشین کی حالت بھی تو دیکھو۔ کل وہ پھر ملا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی مشین کی قیمت کچھ زیادہ ادا کردو۔ کہنے لگا اچھا بھئی تم کہتے ہو تو میں دو روپے زائد

دے دوں گا — اب اگر تم کو باون روپے منظور ہوں تو کرلو سودا۔''

'' چچا مجھے معلوم نہ تھا کہ روپے کا تقاضہ اس شدت سے شروع ہو جائے گا۔ اب میں روپیہ کہاں سے لاؤں؟''

'' برخور دار تمہاری تنخواہ تو مل گئی ہوگی۔ سنا ہے اب تمہاری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے۔ بیٹا سنبھل کر خرچ کیا کرو۔ پینسٹھ روپے کچھ معمولی رقم تو نہیں۔ تمہارے اخراجات بھی کیا ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے......''

عارف خاموشی سے بازار کی طرف دیکھتا رہا۔ چچا اپنی گچھے دار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔'' آج کیا تاریخ ہے تنخواہ نہیں ملی کیا؟''

''پرسوں ملے گی۔''

چچا نے ذرا خوش مذاقی سے ہنستے ہوئے کہا۔''کوئی ہرج نہیں بیٹا! میں پرسوں چلا آؤں گا۔ دیکھو نا! دنیا کے کام بس یوں ہی چلا کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ سے ٹوپی پیچھے کی طرف سرکائی اور چندیا کھجلانے لگے۔

اس کے بعد وہ سیمنٹ کے بھاری بھرکم بورے کی طرح ہلے اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئے۔ عارف واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

شام ہوگئی۔ سب لوگ کام ختم کرکے چلنے کو تیار ہوئے۔ عارف کا یہ دن بہت برا گزرا۔ کوٹ ابھی تک سیلا ہوا تھا۔ وہ از حد تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ گھر جاکر تھوڑی دیر آرام کرے۔ اتنے میں مینیجر آیا بے اعتنائی سے بولا۔''عارف! آج ظفر نہیں آیا۔ اس لیے آج شام کی ڈیوٹی پر خزانچی کے ساتھ تم رہو گے۔''

سب لوگ باتیں کرتے شور مچاتے چلے گئے۔ کمرہ خالی رہ گیا۔ اور پہلے کی نسبت فضا اور بھی بے کیف ہوگئی۔ مہتر جھاڑو دینے آیا۔ چپڑاسی گرے پڑے کاغذات اٹھا رہا تھا۔ خزانچی نے آواز دی کہ عارف میاں! یہاں چلے آؤ— عارف اٹھ کر خزانچی کے کٹہرے میں بیٹھ گیا۔

خزانچی سیدھا سادا بنیا ٹائپ کا ہندو تھا۔ بے تکان اور بے چون و چرا کیے کام میں مصروف رہتا۔ ظرافت تو اس کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ اگر کبھی اپنی دانست میں کوئی ہنسی کی بات کہے بھی تو سننے والے کو الٹا رونا آئے۔

بے کاری میں وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب کوئی شخص روپیہ جمع کروانے کے لیے آجاتا تو ایک آدھ بات ہوجاتی۔ ورنہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہتے— ایک کونے میں میری کوریلی کا کوئی ناول پڑا تھا۔ شروع کے اوراق گم تھے۔ وہ اسی کی ورق گردانی کرنے لگا۔

خزانچی فائلیں کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ لوگ روپیہ جمع کروانے کی غرض سے آتے تو تین سو روپیہ، ہزار، سولہ سو' کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ روپوں کی گنتی سنتے سنتے یکا یک اسے خیال آیا کہ آج اس کو چند روپے درکار تھے۔ آج گھر میں نہ لکڑی تھی نہ آٹا۔ مٹی کا تیل بھی لالٹین میں تھوڑا ہی سا رہ گیا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا تھا کہ وہ شام کو سب چیزیں لے آئے گا۔ بے چاری انتظار کرتی ہوگی۔ شاید کام چلانے کے لیے کہیں سے تھوڑا بہت آٹا لے لیا ہو۔

پھر وہ مشین کی بابت سوچنے لگا۔ شاید کوئی اچھا گاہک مل جائے۔ اگر سوا سو یا ڈیڑھ سو روپیہ وصول ہوجائے تو کچھ کام چل جائے۔ چچا سے چالیس روپے لے کر اس نے بڑی غلطی کی۔ اب وہ روپے بچوں کے کپڑوں پر اور کچھ ادھر اُدھر خرچ ہو چکے تھے۔ اس کی زردرو بیوی کے پاس کپڑوں کی اتنی کمی تھی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتی تھی اور نہ کسی اور کو اپنے گھر میں ہی بلا سکتی تھی۔ اگر مشین نہ بکی اور چچا کو چالیس روپے تنخواہ میں سے دینے پڑے تو اس صورت میں گوالا، دھوبی، بنیا، نائی سبھی اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس نے سوچا کہ سر دست خزانچی سے پانچ روپے ادھار لے لوں تاکہ جب تک تنخواہ نہیں ملتی گھر کا کام تو چلے۔

لالہ شریف آدمی تھا۔ ''لو خان صاحب! پانچ چھوڑ پچاس مانگو تو انکار نہیں۔'' اس

نے نوٹ توڑ موڑ کر جیب میں ٹھونس لیا۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے اور وہ چلنے کو تیار ہوا۔ لالہ بولے۔''خان صاحب! میں ابھی پندرہ بیس منٹ تک یہیں بیٹھوں گا۔تھوڑا سا کام باقی ہے۔''

عارف نے سیلے ہوئے بوٹوں میں پاؤں ڈالے تو اس کی ٹانگیں جھنجھنا اٹھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو دیکھا کہ بازار کی اکثر دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ بازار میں روشنی بھی کم تھی۔ دوکانوں کے پیچھے مکان ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہورہے تھے۔ سڑک معمول کے خلاف بہت صاف ستھری اور بارش سے دھل گئی تھی۔ گیلی سڑک جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اس وقت آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا تک نہ تھا۔نکھرے ہوئے آسمان میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ بڑے بازار کو چھوڑ کر کوچہ گل محمد کو ہولیا۔ لال خان کبابی کی دکان سے کچھ ہی دور پہنچا ہوگا کہ میونسپلٹی کی لالٹین کے قریب چند آشنا صورتیں نظر آئیں۔ ابھی یہ ان کو اچھی طرح پہچان نہ پایا تھا کہ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور اک دم چلا اٹھے۔

وہ اس کے دوست تھے۔ سب نے اسے گھیر لیا۔ شکایتوں کے دفتر کھول دیئے۔

''یار! ہم تمہارے گھر گئے۔ وہاں بالکل تاریکی تھی۔ آوازیں دیں۔ بھاوج نے کہلا بھیجا کہ آپ گھر پر نہیں۔ بھئی ہم تو دل میں شک کر رہے تھے کہ تم ضرور پڑے سو رہے ہوگے۔ ہمیں چکمہ دے دیا— آج کہیں سے ذرا سی ''یہ'' مل گئی۔ ہم اس خیال سے گئے تھے کہ تمہارے ہاں ذرا کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ کھانا کھانے کے بعد سنیما دیکھنے کا خیال تھا۔''

یہ کہہ کر ان میں سے ایک نے کوٹ کے اندر سے بوتل کی جھلک دکھائی۔

کافی بحث مباحثہ کے بعد عارف نے ان کو منالیا کہ یہیں کسی دوکان سے کچھ کھا پی لیں۔ وہ جانتا تھا گھر پر نہ لکڑی تھی نہ آٹا۔

چنانچہ لوگ لال خاں کبابی کے ہاں پہنچے۔ دوکان کے آگے ایک پرانی لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی مدھم روشنی میں کباب، سیخیں، اور مچھلی کے ٹکڑے نظر آرہے تھے۔

چند ایک ڈھیلی پگڑیوں اور الجھے ہوئے بالوں والے حضرات بیٹھے کھا پی رہے تھے۔

وہ لوگ اندر چلے گئے۔ بوتل کے ادھے کو چار، پینے والے۔ نشہ تو خیر کیا ہوتا البتہ ہلکا سا سرور آگیا۔ کھانے پینے میں چار روپے سے اوپر عارف کی گرہ سے کھل گئے...... جب وہ سینما گھر پہنچے تو عارف اپنے ٹکٹ کے دام بمشکل پورے کر سکا۔

فلم شروع ہوئی۔

ایک پہاڑن لڑکی کی داستانِ محبت تھی۔ فلک بوس پہاڑوں کے مناظر تھے۔ دامن کوہ میں ایک جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی میں حسن و جمال کا ایک نمونہ ایک پری مثال لڑکی ــــ عارف کی طبیعت بحال ہونے لگی۔

اس نے آج تک ایسی دل ربا لڑکی نہ دیکھی تھی۔ اور پھر اس کا شباب تھا کہ جوار بھاٹا۔

عارف کی تھکاوٹ دور ہوگئی۔ دل کی پریشانیاں رفع ہوگئیں۔ طبیعت اس قدر مسرور ہو رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ وہ خوب باتیں کرے اور چہکے۔ اس نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوکر کافی بلند آواز میں کہا۔ ''یار کیسی کافر جوانی ہے۔ اس کی گول گول چھاتیاں تو دیکھو کیسا ابھار ہے۔ جو بن پھٹا پڑتا ہے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے بوسے لینے میں کیسا مزا آئے۔ ہائے کیسی کٹی ہوئی رانیں ہیں۔''

ادھر اُدھر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ وہ سمٹ سمٹ کر سر ڈھانپنے لگیں۔

اتنے میں پردہ پر جنگل کی وہ شہزادی گھاس پر لیٹ گئی۔ اس نے بصد ناز بازو اٹھائے اور سینہ تان کر انگڑائی لی کہ عارف کی طبیعت نہال ہوگئی۔ اس نے اپنے ساتھی کی ران پر ہاتھ مارا اور دانت پیستے ہوئے پہلے کی نسبت بلند تر آواز میں للکارنے لگا۔

''مار ڈال! مار ڈال...... ظالم!ــــ یار مزا آگیاــــ اگر کہیں ویرانے میں اسی طرح گھاس پر لیٹی ہوئی مل جائےــــ تو استادــــ بس۔''

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'تار و پود' میں شامل ہے۔

خلا

جب میں کوٹھی کے نزدیک پہنچا تو ٹھٹھک کر ایک درخت کے تلے کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میری صورت سے بھی وحشت ٹپک رہی ہوگی۔ گرمیوں کے دن گیارہ بجے کا وقت دھوپ کی تمازت، سڑک کے کنکر دہکتے انگارے ہورہے تھے۔ چند ایک کنکر میرے بوٹوں میں داخل ہوگئے تھے۔ راستہ بھر پریشان رہا۔ تسمے کھول کر بوٹوں کو جھاڑا...... اور پھر پسینہ پونچھ کر سوچنے لگا کہ اندر جا کر کیا کہوں گا۔ شاید وہ لوگ حیران رہ جائیں کہ آج اس قدر تیز دھوپ میں میں اکیلا چلا آیا۔

خاں صاحب ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ ہم لوگ ان کے مقابلے میں غریب تھے۔ جب تک میرے والد صاحب ملازمت میں تھے اچھا گزارا ہوجاتا تھا۔ لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔ نوکری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر کسی بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ پہلے شہر سے باہر سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ اب ہم لوگ شہر میں آگئے تھے۔ موجودہ مکان کے آگے ایک اونچا چبوترا تھا۔ چند پختہ سیڑھیوں کے بعد برآمدہ۔ برآمدے کے دونوں گوشوں پر ایک ایک غسل خانہ۔ اس چھوٹے سے مکان کے نصف حصہ میں ایک اور کرایہ دار رہتے تھے۔ باہر کے برآمدے میں اپنے غسل خانے کی طرف انہوں نے ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکا رکھا تھا۔ اندر ایک دو دو کمرے تھے۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔ صحن

مشترکہ ہی تھا۔ البتہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ہمارے حصے میں آیا تھا اور ایک ان کے۔ ادھر ہماری یہ حالت تھی۔ ادھر خاں صاحب شہر سے چار میل پرے شان دار کوٹھی میں رہتے تھے۔ خیر یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ورنہ خاں صاحب جن کو میں چچا کہہ کر پکارتا تھا۔ بڑے فراخ دل اور سلجھے ہوئے خیالات کے شخص تھے۔ ہنسی اور مذاق تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مجھ کو بہت پیار کرتے تھے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ہماری مالی حالت میں اس قدر تفاوت تھا کہ زیادہ راہ و رسم کی صورت ہی نہ تھی۔ بہرحال خاں صاحب کی بیوی اور اماں کے اصرار پر کبھی کبھی امی ان کے ہاں چلی جاتیں اور ان کے ہمراہ میں بھی ضرور جاتا۔ میری وہاں خوب آؤ بھگت ہوتی۔ وہ مجھ کو آنکھوں پر بٹھاتے۔ بڑی اماں اگرچہ محبت کا اظہار اس قدر گرم جوشی سے نہ کرتیں البتہ میرے لیے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں مہیا کرتیں۔ لیکن آج تک میں ان کے ہاں اکیلا کبھی نہ گیا تھا— ایک دن پہلے خاں صاحب کا نوکر بازار میں ملا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ خاں صاحب کی انگریزی کتیا، لوسی نے بچے جنے ہیں۔ میں بے چین ہوگیا۔ شام ہوچکی تھی۔ خاں صاحب کے ہاں پہنچنا تو خیر مشکل تھا اس لیے دوسرے دن جانے کی ٹھانی۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ اف! کتا پالنے کا مجھے کس قدر شوق تھا۔ میں نے ڈر کے مارے گھر میں کسی سے اس بات کا ذکر تک نہ کیا مبادا وہ منع کردیں۔ خصوصاً امی کتے کو نجس سمجھتی تھیں۔ اگر ان کو معلوم ہوجاتا تو مجھے گھر سے ہی نہ نکلنے دیتیں......

ہمارے گھر کی فضا بڑی خشک تھی۔ میرے والد صاحب تنومند، متین اور غصہ ور شخص تھے۔ ان کے سامنے چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ امی بے چاری اپنے کام دھندوں میں مصروف رہتیں۔ کوئی بھائی یا بہن نہ تھی۔ اس لیے گھر کی فضا بے کیف سی رہتی تھی۔ خصوصاً جب تک والد صاحب گھر میں رہتے۔ کوئی متنفس دم نہ مار سکتا تھا۔ لیکن وہ کتے سے متنفر نہ تھے۔ دوسرے دن دودھ پینے کے بعد میں اکیلا ہی کوٹھی کی جانب چل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچ کر اندر جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیوں کر دس پندرہ منٹ باہر کھڑا مختلف جذبات کے بحران میں مبتلا رہا۔ کئی دفعہ تو ٹھان لی کہ واپس چل دوں۔ لیکن کتے کی کشش نہ جانے دیتی تھی۔ بالآخر دل کڑا کرکے

پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔

سامنے کوٹھی تھی خاموش و بے حس— فضا بے کیف۔

میں کچھ مایوس سا ہوگیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے سائبان میں سے ہوکر برآمدے کی طرف بڑھا۔ نیلے رنگ کے بھاری پردے پڑے ہوئے تھے تا کہ دھوپ برآمدے میں نہ جاسکے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پردہ اٹھایا۔ برآمدہ خالی تھا۔ تین چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا آئینہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہیٹ لگانے کی کھونٹیاں یا دروازوں کے آگے پائدان۔ چند ایک گملے تھے جن میں بے رنگ و بو پھولوں کے پژمردہ پودے تھے...... میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کاش کوئی مجھے دیکھ کر اندر بلا لیتا۔

برآمدے سے نکل کر میں نے کوٹھی کا چکر کاٹا اور پچھواڑے سے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ ادھر چھوٹا صحن تھا۔ دروازوں کے آگے جالی لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اندر کا شخص باہر سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ کچھ۔مبہم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید کوئی ہو۔ جالی کے قریب پہنچ کر میں نے اندر کی طرف جھانکا۔ بڑی اماں میری طرف پشت کیے کھڑی تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور اپنی ایرانی طرز کی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ اور مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔ بڑی اماں نے گھوم کر نہ دیکھا۔ میرے دل میں پھر وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہ نہ معلوم بڑی اماں کا مجھ سے کیسا سلوک ہو۔ ایک دفعہ پھر بھاگ جانے کی سوجھی۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ بڑی اماں نے گھوم کر میری طرف دیکھا...... گوناگوں جذبات کی وجہ سے نہ معلوم میرے چہرے کی کیفیت کیا ہو رہی ہوگی...... لیکن اماں کا چہرہ جذبات سے خالی رہا۔ میں نے ادب سے ہاتھ پیشانی تک لے جا کر کہا۔

''اماں جی! سلام کرتا ہوں۔''

بڑی اماں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ان کی نظر کمزور تھی۔ گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''تو کون ہے چھوکرے۔''

میں بہت پریشان ہوا۔ دل میں پچھتانے لگا کہ ناحق آیا۔ بوڑھی اماں نے آگے

بڑھتے ہوئے عینک صاف کر کے ناک پر ٹکائی اور قریب سے دیکھنے لگیں۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ زبان سوکھی جارہی تھی۔ بارے وہ مجھے پہچان کر اندر لے گئیں۔ کرسی پر بٹھایا۔ بے چاری پریشان تھی کہ نہ معلوم کیا افتاد پڑی کہ بے چارا ننگے سر اس قدر دھوپ میں پیدل چلا آیا...... ٹوپی بغل میں تھی...... انہوں نے برقی پنکھا چھوڑ دیا اور شربت کا گلاس منگوایا۔ نوکر گلاس پلیٹ میں رکھ کر لایا۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا۔ مجھ کو خوف تھا اگر گلاس پلیٹ میں سے پھسل کر گر پڑا تو وہ مجھے بے تمیز سمجھیں گی۔

بڑی اماں باوضع اور مہذب خاتون تھیں۔ جب میرے دم میں دم آیا تو انہوں نے آنے کا مدعا پوچھا۔ میں نے بتایا تو بے چاری کے چہرے سے مایوسی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ بولیں۔ ''بیٹا! پہلے کیوں نہ بتایا۔ اب تو لوگوں نے بچے لے لیے۔''

میرا دل ٹوٹ گیا۔ رونہاسا ہو کر پوچھا۔ ''ایک بھی باقی نہیں بچا؟''

وہ مجھے خاں صاحب کے پاس لے گئیں۔ خاں صاحب نے اخاہ کا نعرہ لگا کر مجھے بہت پیار کیا۔ گھر باہر ان کا کس قدر دبدبہ تھا اور جو کوئی انہیں ملنے کے لیے آتا تو ان سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اماں نے اصل بات بتائی۔ خاں صاحب نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا کل چار بچے دیئے لوسی نے۔ تین ''لڑکے'' اور ایک ''لڑکی۔'' کیا۔ سمجھے۔'' پھر ہنس پڑے۔ ''تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا کتا انگریزی نسل کا ہے اور لوسی بھی لیکن نسل دونوں کی علاحدہ علاحدہ ہے۔ اب نتیجہ یہ نکلا کہ کتیا اور دو کتے تو اپنے باپ کی طرح خوب لمبے لمبے بالوں والے ہیں۔ اور ایک کتا چھوٹے بالوں والا۔ ہو بہو لوسی کی طرح۔ سمجھے بھائی؟ لمبے بالوں والا ایک کتا تو ہماری پڑوسن میم صاحب نے لے لیا ہے۔ اور دوسرا ریاست نابھ کے ایک رئیس نے مانگ لیا ہے۔ میم صاحب تو اپنا کتا لے بھی گئیں۔ دوسرے کے لیے ہم وعدہ کر چکے ہیں اب کہو— کتیا لوگے؟''

میں نے انکار کے طور پر سرہلا دیا۔

پھر ہم لوگ نوکروں کے کوارٹروں کی طرف گئے۔ لوسی پیال پر لیٹی ہوئی تھی۔

تین بچے اوں اوں کرتے ہوئے ماں کا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹے بالوں والے پلے کی طرف اشارہ کیا...... دوسرے پلے خوب لمبے لمبے بالوں والے تھے اور اپنے باپ کی طرح ان کے جسم پر کہیں کہیں سفیدی بھی موجود تھی۔ لیکن چھوٹے بالوں والا پلا بالکل اپنی ماں کی طرح تھا۔ کالا بھجنگ۔ اس کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں نیچے کو لٹکتے ہوئے لمبے کان میموں کے ہموار کٹے ہوئے پٹوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ وہ خوب موٹا تازہ گول مٹول سا تھا۔ پہلے میں اس کی جلد پر ہاتھ پھیرتا رہا جو مخمل کی طرح نرم تھی پھر میں نے اس کو اٹھالیا۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اس کے پنجوں کے ناخن گنے۔ چاروں پنجوں کے ناخن گنتی میں بیس تھے۔ سنا تھا کہ بیس ناخنوں والا کتا بڑا لڑاکا اور طاقتور ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے زمین پر رکھا اور دونوں کانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھادیا۔ وہ چپ رہا۔ میں نے ایک کان سے پکڑ کر اٹھایا پھر بھی نہیں چیخا۔ جب تک میں یہ آزمائش کرتا رہا۔ خاں صاحب کھڑے مسکراتے رہے۔ میں تھوڑی دیر تک کتے کو دیکھتا رہا۔ جب دل میں یہ خیال آیا کہ میں اسے اپنا سکتا ہوں تو پھر وہ مجھ کو پیارا معلوم ہونے لگا۔ بالآخر میں نے اسے اٹھا کر جھولی میں ڈال لیا۔ اور کہا۔ ''چچا مجھے یہ کتا پسند ہے۔''

خاں صاحب بولے۔ ''بیٹا ابھی اسے اسی جگہ رہنے دو۔ بچہ ہے نا! ماں کا دودھ پئے گا۔ جب آنکھ کھولے گا تو لے جانا یا ہم بھجوادیں گے۔''

میں اس بات پر آمادہ نہ ہوا۔ اور فوراً چل کھڑا ہوا۔

پلا میری جھولی میں پڑا ہوا بلکتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ سو گیا۔ میں ے جیب میں سے رومال نکال کر اس پر ڈال دیا اور دھوپ سے بچاتا ہوا گھر کی طرف لپکا۔

ایک مشکل تو حل ہوچکی تھی۔ اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ فکر یہ تھی کہ کتا گھر میں کیسے لے جاؤں— وہ ننھی سی جان میری گود میں تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اپنے سینہ پر محسوس کر رہا تھا...... جوں جوں میں گھر کے قریب پہنچ رہا تھا توں توں میرے قدم سست

پڑ رہے تھے۔

ہمارے گھر کے نصف حصے میں کرایہ دار رہتے تھے۔ ان سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ فقط میاں بیوی کا ایک جوڑا تھا۔ میاں کسی دفتر میں ملازم تھے۔ نو بجے دفتر کو سدھارتے۔ شام کو پانچ بجے آن صورت دکھاتے۔ ابھی نوجوان تھے۔ ان کی بیوی نئی نویلی دلہن تھی۔ خدو خال اچھے تھے۔ رنگ بہت گورا چٹا تھا۔ بالکل میم صاحب معلوم ہوتی تھیں۔ جسم خوب مضبوط اور بھرا ہوا تھا۔ جب مہندی رچا کر آنکھوں میں سرمہ ڈال لیتیں تو بڑی اچھی لگتی تھیں۔ میاں پردے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ان کی بیوی جن کو میں خالہ کہا کرتا تھا۔ ایک تو وہ یوں ہی چھوکری سی تھیں دوسرے شرمیلی تیسرے اپنے میاں سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس لیے بے چاری کبھی کمرے سے باہر جھانکنے کی جرأت نہ کرتی تھیں۔ میری عمر اس وقت غالباً گیارہ برس کی تھی۔ مجھ سے پردہ نہ تھا۔ خالہ امی کی منہ بولی بہن تھیں۔ بڑی ہنسوڑ اور کھلنڈری۔ معمولی سی بات پر ان کو اتنی ہنسی چھوٹتی کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھیں۔ الہڑ اور طبیعت میں لڑکپن۔ چھپانے سے کیا حاصل۔ انہوں نے ابھی تک اپنے گڈے اور گڈیاں میاں کی نظر سے بچا کر سنبھال رکھے تھے۔ جب ان کے میاں دفتر کو چلے جاتے تو دوپہر کے وقت ہم دونوں گڈوں گڈیوں کے کھیل کھیلتے۔ اس معاملے میں میں ہی ان کا راز داں تھا۔ امی بھی اس بات سے بے خبر تھیں۔

بے چاری خالہ جان پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ نہ کوئی سہیلی کہ دل بہلا لیویں۔ امی کا وہ ادب کرتی تھیں۔ یعنی کم از کم گڑیاں کھیلنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ مجبوراً خالہ جان کو مجھی سے رجوع کرنا پڑتا۔ جب تک میاں غائب رہتے وہ پریشان سی کمرے میں پڑی رہتیں۔ کبھی دو گھڑی امی سے بات کرلیتیں۔ مجھے دیکھتیں تو آنکھوں میں طفلانہ چمک پیدا ہوجاتی۔ ہم خوب کھیلتے، باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے۔۔۔ کبھی وہ نہا دھوکر بال بکھرائے، ایک دھوتی لپیٹے جس کے ایک پلو سے جسم کے

اوپر کا حصہ ڈھانپے ہوتیں، آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں تیل رچاتیں اس دوران میں مجھ سے گپ ہانکی جاتی۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر شرما کر کہتیں۔ ''ذرا منہ ادھر کر لو تا میں قمیص پہن لوں......'' کبھی میں ان کو اپنا گھوڑا بنالیتا۔ بے چاری چوپائے کی طرح چلتیں اور میں ان کی پیٹھ پر سوار ان کی لمبی چوٹی گھما کر ان کے دانتوں میں دے دیتا۔ اور اس لگام کو کھینچ کھینچ کر انہیں کمرے کے اندر خوب دوڑاتا...... ایک دن امی نے دیکھ پایا۔ مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''اللہ رے! تم اچھی خالہ ہو گھوڑا بنی گھٹنوں کے بل چل رہی ہو۔'' اس دن امی نے ہنسی ہنسی میں یہ بات ابا کو بھی بتادی۔ ابا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سن کر بہت بگڑے۔ حرام زادے! کتاب لے کر پڑھا کر...... شرم نہیں آتی۔ کیا اب تو دودھ پیتا بچہ ہے۔ جو اس قسم کے لاڈ بگھارتا ہے۔ پھر انہوں نے اٹھ کر مجھ کو دھواں دھوں پیٹ ڈالا۔ میں مار کھا کر روتا ہوا چھوٹے کمرے میں چلا آیا۔ بے چاری خالہ مارنے کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئیں۔ اور دروازے کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے میرا بازو ر چھو کر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلا دیا اور سسکیاں بھرتا ہوا الگ جا بیٹھا۔ انہوں نے لپک کر مجھے بڑی مشکل سے گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بہت پیار کیا کہنے لگیں۔ ''تو میرا ننھا سا بھیا آنکھوں کا تارا ہے۔ بتا میرا کیا قصور ہے۔ وہ بات میں نے تو ابا کو نہیں کہی امی ہی نے تو کہی۔ اچھا! ہم امی سے بھی سمجھ لیں گے۔'' اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک چونی خرچ کرنے کے لیے دی۔

گھر کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ ابھی تک یہ بھی طے نہ کر سکا کہ گھر کے اندر کیوں کہ جاؤں۔ شاید ابا گھر پر موجود ہوں۔ نہ معلوم کس قدر خفا ہوں۔ پوچھیں کہ صبح سے کہاں تھا...... کاش! ابا گھر پر نہ ہوں امی سے تو خیر نپٹ لوں گا۔ اگرچہ وہ کتوں سے سخت متنفر تھیں۔ اگر ضد پر اڑ گئیں تو کتے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ آخر کار یہ ترکیب سوجھی کہ چپکے سے پہلے خالہ کے کمرے میں گھس جاؤں اور وہاں سے اپنے گھر کے حالات معلوم کروں۔

چنانچہ چبوترے کے ساتھ ساتھ قدم ناپتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور دم سادھے دبے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ایک دم کمرے کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے خالہ آئینے کے سامنے کھڑکی کے قریب کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ میں پہنچا تو بدک کر پیچھے ہٹ گئیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ان کے لیے اچنبھے ہی کی بات تھی۔ مجھے دیکھ کر کر دم میں دم آیا۔ لیکن سانس ابھی تک سینہ میں نہ سماتا تھا۔ ''میں تو ڈر ہی گئی...... ارے آج تو چوروں کی طرح......'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ حیران تھیں کہ آخر بات کیا ہے۔ میں منہ سے کچھ نہ بولا۔ صرف رومال ہٹا کر جھولی آگے کر دی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹیں۔ پھر ایک ہاتھ میں کنگھی دوسرے میں بالوں کی لٹیں سنبھالے آگے کو جھک جھک کر دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو چھوکر انگلی فوراً پیچھے ہٹالی— میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''چھو لیجئے آپ ڈرتی کیوں ہیں کیا یہ کاٹ کھائے گا؟'' لیکن اس بات سے وہ گھبراتی تھیں بہت کچھ کہنے سننے کے بعد انہوں نے ملائمت سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ ''ہئی کس قدر خوب صورت...... نرم...... گدگدا......''

میں نے بتایا کہ چچا کے ہاں سے لایا ہوں...... وہ خاں صاحب چچا ہیں نا! انگریزی کتا ہے یہ۔''

''ہائے کتنا پیارا ہے یہ۔'' انہوں نے ہلکی سی تالی بجا کر کہا۔ ''لاؤ میں ذرا گود میں اٹھالوں۔''

''ارے آپ تو بڑی بہادر ہوگئیں...... ابھی تو چھونے سے دم نکلتا تھا۔'' انہوں نے باہوں میں پلے کو اس طرح لے لیا جیسے وہ روئی کا گالا ہو۔ مسرت کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ''اس کا نام کیا رکھو گے؟''

قدرے سوچ کر میں نے کہا۔ ''بھئی اس کا نام جیک رہے گا۔''

خالہ جیک کہہ کر اس کو پکارنے لگیں جیسے وہ باتیں ہی تو کرنے لگے گا۔
یہ پوچھنے پر کہ ابا گھر پر تو نہیں نا! انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے کہا ذرا چکر لگا آیئے۔ بولیں بھئی میں پہلے کنگھی کرلوں پھر قمیص پہن کر جاؤں۔ اگر بہن (امی) اس طرح دیکھ پائیں گی تو مفت میں خفا ہوجائیں گی۔''
''قمیص پہن کر ذرا پتہ لگا دیجئے۔ کنگھی پھر کرلیجئے گا۔'' میں نے منت سے کہا۔

''بھئی ہٹاؤ۔ اس طرح قمیص پر بال جو گر پڑیں گے۔''
''آپ میری خالہ نہیں کیا؟ جایئے نا...... آپ کی قمیص پر بال گریں گے تو میں چن دوں گا۔''
بڑی مشکل سے گئیں اور پتہ لائیں کہ ابا گھر پر نہیں ہیں اور امی چھوٹے کمرے میں چار پائی پر بیٹھی جراب بن رہی ہیں۔''
جیک کو بغل میں دبایا اور آگے آگے میں، پیچھے پیچھے خالہ...... پہلے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر لپک کر جیک کو امی کی گود میں ڈال دیا۔ پہلے تو گھبرا کر وہ کتے کو اچھالنے لگیں۔ لیکن جب انہوں نے چھوٹا سا پلا دیکھا تو ہاتھ اوپر اٹھا کر چلانے لگیں۔ خالہ نے پلا اٹھالیا۔ امی کے دم میں دم آیا بولیں یہ کتا یہاں نہیں رہے گا۔ یہ پلید جانور ہے۔
''تو امی چچا کے گھر میں بھی کتے ہیں......''
''وہ بڑے آدمی ٹھہرے۔ پھر ان کے ہاں وسیع جگہ ہے یہاں کتا رکھنے کو جگہ کہاں ہے۔ ایک بڑا کمرہ اور ایک چھوٹا آخر یہ کتا رہے گا کہاں؟ اور پھر کھائے گا کیا؟''
اسی ہنگامے میں برآمدے میں ابا کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امی دروازہ کھولنے کے لیے گئیں ادھر خالہ بھی سٹک گئیں۔ میں اکیلا رہ

گیا۔ بڑا گھبرایا۔ جلدی سے جیک کو کرسی پر رکھ کر الماری میں اپنی کتابوں کو ہلانے جلانے لگا۔ ابا نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ یہ کیا شور تھا؟ امی نے بلند آواز میں کتے کا قصہ دہرایا۔ ابا ماتھے پر تیوریاں ڈالے اس طرف آئے۔ میں مسکین صورت بنائے کتابیں اِدھر اُدھر رکھ رہا تھا۔ جیسے مجھ کو اس قصہ سے کچھ سروکار ہی نہ ہو۔

جیک آنکھیں بند کیے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابا کچھ دیر کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے لیکن ماتھے پر بل بدستور قائم تھے۔ امی بولیں۔ ''کھانا لاؤں۔'' ابا نے خاموشی سے سرہلادیا۔ امی کھانا لانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ اور ابا چار پائی پر بیٹھ گئے جیک کی کرسی نزدیک گھسیٹ لی۔ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ ''بہت اعلیٰ نسل ہے۔''

میں مسرت کو دبا کر نہایت سنجیدگی سے نصاب کی کتاب ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلا گیا۔ ''ابا جی! چچا کہتے تھے کہ اس کا ابا بھی انگریزی نسل کا ہے اور اس کی ماں بھی، لیکن دونوں کی نسل جدا جدا ہے۔''

''ہاں ہاں...... لیکن یہ انگریزی نسل کا ہوانا! بہت اعلیٰ نسل ہے۔''

امی دورکابیاں اٹھائے اندر داخل ہوئیں...... ابھی میں اس کو کہہ رہی تھی کہ کتا واپس کردے۔ ہم اسے کہاں رکھیں گے کیا کھلائیں گے؟''

ابا کے ماتھے کے بل اور گہرے ہوگئے۔ لیکن بولے نہیں۔

پھر امی ابا کو پنکھا جھلتی رہیں اور کتے کے خلاف بولتی رہیں۔ ابا بالکل خاموش رہے۔ کھانا کھا لینے کے بعد انہوں نے تولیے سے مونچھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑا سا دودھ لے آؤ۔''

امی لمحہ بھر کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔

ابا نے دوبارہ اپنی بھاری اور بے کیف آواز میں کہا۔ ''دودھ لے آؤ۔''

امی چپکے سے دودھ لے آئیں۔ ابا نے ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ دھوکر اس میں دودھ ڈالا اور جیک کے آگے رکھ دی۔ لیکن جیک کا سوائے اوں اوں کرنے کے اور کسی طرف دھیان ہی نہ تھا۔ ابا دودھ کی پلیٹ اس کی ناک کے قریب لے گئے لیکن اس نے دودھ پینا تھا نہ پیا۔ اب میں اٹھا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر دودھ میں ڈبودیا۔ لیکن جیک نے دودھ نہ پیا۔ دودھ اس کی تھوتھنی سے بوند بوند کر کے ٹپکنے لگا۔ خالہ چھپ کر کھڑی ہنس رہی تھیں۔ امی نے کپڑے کے ٹکڑے سے جیک کا منہ پونچھ دیا۔

جب ابا کسی بات پر اڑ جائیں تو امی بھی ہامی بھرنے لگتیں۔

کچھ دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ جیک اندھا دھند ادھر اُدھر لپکنے لگا۔ ابا نے کہا۔ ''ابھی رہنے دو۔ بھوک لگے گی تو خود ہی پی لے گا۔''

امی بدستور جراب بننے لگیں۔ ابا دوسرے کمرے میں چلے گئے تو خالہ چھم سے اندر آکر کولہے پر ہاتھ رکھ کھڑی ہوگئیں۔

میری فاتحانہ نظریں امی سے ملیں تو امی نے ملامت آمیز محبت کے ساتھ مسکرا کر کہا۔ ''ارے یہ کالا کلوٹا اٹھالایا۔ چتکبرا یا سفید لایا ہوتا۔''

پہلے دو تین دن تک جیک رات بھر چیختا رہا۔ کسی کو سونے نہ دیا۔ لکڑی کے خالی کھوکھے میں ٹاٹ ڈال کر اس پر جیک کو بٹھادیا گیا۔ بعد ازاں اس میں پانی اور دودھ بھی رکھ دیا گیا۔ خالہ نے ایک چھوٹا سا گدیلا سیا۔ لیکن جیک رات کے وقت پانی والی گرا کر اسے بھگو دیتا تھا۔ خالہ صبح ہی صبح گدیلا اٹھا کر سوکھنے کے لیے دیوار پر ڈال دیتیں اور حسب عادت کہتیں۔ ''ہئی! بے چارے کو نمونیا نہ ہوجائے کہیں۔'' ان دنوں ہم بہت تنگ دست تھے۔ تاہم جیک کے لیے ہر روز ایک پاؤ دودھ لینے لگے۔ پہلے دو چار روز تو جیک نے سوائے شور مچانے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ نہ دودھ پیتا نہ روٹی کھاتا۔ عجب

مشکل تھی۔ ایک ترکیب سوجھی۔ روئی دودھ میں بھگو کر جیک کا منہ کھولتے اور وہ منہ چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن ہم کہاں چھوڑنے والے تھے۔

جیک عموماً پڑا سویا کرتا۔ جب وہ پاؤں پھیلائے ٹاٹ پر پڑا سویا کرتا تو ٹاٹ پر کالی مخمل کا پیوند دکھائی دیتا تھا۔ اڑد کے دانے کی طرح اس پر سفیدی نام کو نہ تھی۔ ابا باہر سے آکر کھانا کھانے کے بعد جیک کو اٹھا کر سامنے کی کرسی پر بٹھا دیتے۔ چٹکی بجا بجا کر اس کا نام لے کر پکارتے۔ ''جیک! جیک! جیک!! جیکی! جیکی......'' لیکن جیکی اندھوں کی طرح ادھر اُدھر ہل جل کر رہ جاتا۔

ایک دن ہم سب سے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں چھوٹے کمرے کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو خالہ اپنی مہندی لگی انگلیوں سے اشارے کر رہی تھیں۔ میں اٹھا خالہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ منہ میرے کان کے قریب لے آئیں۔ شاید الائچی چبا رہی تھیں۔ ان کے منہ سے خوشبو کا ایک بھبکا سا نکلا۔ بولیں۔ ''جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جیک آنکھیں کھولے ٹک ٹک دیکھ رہا ہے۔ میرے منہ سے مسرت کی ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے جھپٹ کر اس کو اٹھالیا اور بھاگا بھاگا ابا کے پاس پہنچا۔ ''ابا! دیکھئے جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔''

ابا نے جیک کو گود میں بٹھالیا۔ امی بھی جھک جھک کر دیکھنے لگیں۔ خالہ دروازے کے قریب ابا کی نظروں سے ہٹ کر کھڑی مارے خوشی کے ہاتھ پر ہاتھ رگڑ رہی تھیں۔ کبھی کمسن لڑکیوں کی طرح اچھلنے لگتیں۔

ایک ڈیڑھ مہینے میں جیک سب کو پہچاننے لگا۔ پہلے پہل تو امی کو بھی بہت دقت ہوئی۔ مہترانی کو بلا کر اس کی غلاظت اٹھوانی پڑتی لیکن جلد ہی وہ ''حاجاتِ ضروری'' کے

لیے باہر جانے لگا۔

پہلے دنوں میں ابا سیر و شکار کے بہت شوقین تھے۔ کتوں سے بھی انس تھا۔۔۔ جیک کا رنگ ہی کالا تھا۔ ورنہ تھا اصلی۔ ''انگریز کتا'' بے وقت روٹی نہ کھاتا تھا اسے دن میں دو مرتبہ پابندیٔ وقت کے ساتھ کھانے کو دودھ روٹی ملتی۔ پھر وہ آرام سے پڑا رہتا کیا مجال جو دن میں کوئی کھانا کھائے اور وہ للچائی نظروں سے دیکھے۔ اس کے بال چھوٹے تھے لیکن بہت ملائم اور از حد چمکیلے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ پہلے پہل جب وہ رات کے وقت چلاتا تو ابا اس کو اپنی کھاٹ پر بٹھا لیتے۔ امی کو پلید جانور کا سفید بستر پر بیٹھنا سخت ناگوار گزرتا تھا لیکن لاچار تھیں۔ اور اب تو جیک خیر سے کسی اور جگہ سونے پر رضا مند ہی نہ ہوتا تھا۔ اگر اس کو کھوکھے میں سلا دیا جاتا تو رات کو ابا کی چار پائی کے قریب جا کر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ ابا اس کو پائنتی کی طرف ڈال دیتے آرام سے چپ چاپ پڑا سوتا۔ اگر کہیں رات کو ابا کے پاؤں حرکت کرتے تو وہ سمجھتا کہ وہ اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کمر کس کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ لاڈ میں غراتا، بھونکتا، کبھی اچک کر آگے بڑھتا کبھی ''پیچھے ہٹتا اور کبھی پاؤں کا انگوٹھا منہ میں لے لیتا۔

جو کبھی میں سینما دیکھنے کے لیے چلا جاتا ابا بھی دیر سے گھر آتے تو امی چار پائی پر بیٹھی ان کا انتظار کرتیں۔ اس وقت جیک امی کی چار پائی کے نیچے دبکا بیٹھا ہوتا اور اگر کوئی ذرا سی آواز سنائی دے جاتی تو فوراً بھونکنے لگتا۔ امی کہتیں۔ ''بھئی اب تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔''

پہلے پہل جب کبھی ابا گھر پر آتے تھے تو اگر ہم لوگ بولتے بھی ہوتے تو خاموش ہو جاتے۔ عموماً خالہ، امی اور میں بیٹھے آپس میں ہنسی مذاق کرتے۔ خوشی میں ہنستے چلاتے اور جوں ہی ابا کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی خالہ پھرتی سے اپنے گھر کو چل دیتیں۔ میں کوئی کتاب اٹھا لیتا اور امی دروازہ کھولنے چلی جاتیں۔ ابا کے ماتھے پر پہلے ہی کئی تیوریاں ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر داخل ہوتے تو ان کی تعداد میں اور بھی اضافہ

ہوجاتا۔ لیکن اب وہ آتے تو سب سے پہلے جیک کو ان کے آنے کی خبر ہوجاتی۔ وہ سب سے پہلے دروازے کے قریب پہنچتا۔ چونکہ دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھی ہوتی تھی اس لیے دروازہ پنجوں سے کھرچتا اگر اتنی دیر میں امی پہنچ جاتیں تو بہتر ورنہ وہ اپنی مخصوص آواز میں بے تابی کے ساتھ بھونکتا ہوا امی جہاں کہیں بھی بیٹھی ہوتیں ان کے پاس پہنچ جاتا۔ جب دروازہ کھلتا تو جیک کود کر ان کے پاؤں میں پہنچ جاتا اس کی تیزی سے ملتی ہوئی دم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی سی نظر آتی تھی۔ پانچ سات منٹ تک لاڈ کرتا اس دوران میں اگر ابا ذرا بھی کسی اور طرف دھیان کرتے تو وہ بھونک بھونک کر ان کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ عموماً ہوتا یہ کہ جوں ہی ابا اندر آتے وہ پتلون کی کریز کا خیال کیے بغیر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھ جاتے اور جیکی اچھل اچھل کر پیار کرتا۔ ابا کے خشونت انگیز چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی۔ اور وہ بچوں کی طرح چلانے لگتے۔ ''ہو ہو ہو جیکی! یو جیکی!! ''پھر وہ اس کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپا کر کہتے۔ میرے گھر پہنچنے کی جیکی کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔''

جب ابا پلنگ پر بیٹھے ہوتے تو جیک کو گود میں بٹھا لیتے۔ جیکی کی صورت سے تفاخر کے جذبات صاف عیاں ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑی بھاری ہستی محسوس کرتا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس کو چھونے کی کوشش کرتا تو وہ غرانے لگتا۔ یعنی اس وقت وہ کسی اور کے پاس جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم بار بار اس کو چھونے کی کوشش کرتے اور جب وہ غراتا تو ابا کہتے۔ ''بھئی ہٹو اس وقت جیکی ہمارے پاس ہی بیٹھے گا— '' اور ان کی سرخ کنپٹیوں کے قریب آنکھوں کے گوشوں کی جھریاں اور بھی گہری ہوجاتیں۔

رفتہ رفتہ جیکی بہت سمجھدار ہوگیا۔ وہ سب کو پہچانتا تھا۔ گھر کے لوگ جب اکٹھے بیٹھے ہوتے تو وہ کبھی زمین پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لیے اسے اسٹول پر بٹھایا جاتا تھا۔ اسٹول پر بڑی تمکنت سے وہ اس انداز میں بیٹھتا جیسے وہ سب کی باتیں سنتا ہو اور بعض اوقات سر گھما گھما کر ہماری طرف اس انداز سے دیکھتا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا بھی

ہو۔ رات کو پائنتی پر سوئے سوئے اگر کہیں پیشاب کی حاجت ہوتی تو اٹھ کر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ چونکہ چھوٹا سا تھا اس لیے تاریکی میں پلنگ سے چھلانگ لگاتے ہوئے اسے ڈر معلوم ہوتا تھا جب اسے نیچے اتارا جاتا تو دروازے کے پاس جا کر بھونکنے لگتا۔ دروازہ کھلنے پر وہ باہر جاتا اور پیشاب کرنے کے بعد لوٹ آتا۔

امی اس کو باورچی خانے میں نہ گھسنے دیتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم باورچی خانے میں چوکیوں پر بیٹھے کھانا کھاتے۔ اس وقت جیک کو باورچی خانے سے باہر دروازے کے قریب بیٹھنا پڑتا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا۔ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا لیکن امی کے خوف سے اندر داخل نہ ہوسکتا تھا۔ وہ یہ بات ہرگز نہ سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس کے لیے یہ ممانعت کیوں تھی۔ امی گاہے بگاہے بیلن اٹھا کر خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ اس وقت جیک کی حرکات قابل دید ہوتی تھیں اور اگر امی کی توجہ اس کی طرف نہ رہے۔ تو وہ دم دبائے چپکے سے چوروں کی طرح دبے پاؤں ہمارے پیچھے آ کر بیٹھ جاتا۔ معاً امی دروازے کی طرف دیکھ کر کہتیں۔ ''ارے جیک کہاں گیا'' اس وقت جیک ہم دونوں کے بیچ میں سے تھوتھنی نکال ان کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتا۔ ہم اس کی یہ حرکات دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے دہرے ہوجاتے۔ ابا سفارش کرتے۔ ''اچھا رہنے دو۔ بیٹھا ہے اپنا چپکے سے۔''

جب ابا گھر پر نہ ہوتے تھے تو خالہ جان کے کمرے میں ہم دونوں گڑیوں کے کھیل کھیلا کرتے۔ اب ہم جیک کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ کبھی دلہا دلہن کو ڈبے کی بگھی میں بٹھا کر جیکی کو گھوڑا بنایا جاتا۔ کپڑے کے لمبے ٹکڑوں سے بگھی کے دونوں سرے باندھ کر جیک کی گردن بیچ میں پھنسا دی جاتی۔ جیکی کو میں قابو میں رکھتا اور اس طرح وہ دلہا دلہن کی بگھی گھسیٹتا، کبھی تو وہ یہ کام اچھی طرح کر دیتا اور کبھی اچھل کود کر اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتا۔ ایک دن بہت مزا آیا۔ بگھی کے اندر گڈا اور گڑیا ٹھنسے بیٹھے تھے۔ جیک بگھی کے آگے جتا ہوا تھا۔ اتنے میں ابا باہر سے آئے۔ انہوں نے باہر سے جیک کا

نام لے کر جو پکارا۔ جیک بے قابو ہوکر سرپٹ بھاگا تو مکھی (ڈبہ) اڑاتا سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ ابا حیران تھے کہ آخر اس کے گلے میں کیا بلا بندھی تھی۔ جب اصل حال معلوم ہوا تو مجھ کو گالیاں سننی پڑیں۔

ایک مرتبہ اسی طرح کھیلتے کھیلتے جیک چار پائی کے نیچے سے نکلا دبے پاؤں آگے بڑھا اور پھر جھپٹ کر گڈے کو اس کی چھوٹی سی کرسی سے منہ میں دبوچا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر خالہ اور میں شور مچاتے اس کے پیچھے ہولیے۔ جیک کی چمکیلی آنکھوں سے شرارت صاف عیاں تھی۔ وہ کان سمیٹے تیر کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے غائب ہوگیا۔ ہم نے بہتیرا اس کو ادھر اُدھر ڈھونڈا لیکن سب بے سود۔ آخر بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ وہ اوندھے ٹب کے نیچے دبکا بیٹھا ہے۔ ٹب اٹھایا تو دیکھا کہ گڈے کے پھوسڑے اڑ چکے ہیں۔ اس پر خالہ منہ بسورنے لگیں۔

ایک روز چار پائی پر لیٹا میں ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ابا باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں صحن سے امی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ امی نے گھی کا ڈبہ دھوپ میں رکھا تھا کہ خوب پگھل جائے۔ کوئی پاؤ ڈیڑھ پاؤ گھی تھا کہیں جیک کی نظر پڑ گئی۔ نہ معلوم وہ کیا سمجھ کر سارا گھی پی گیا۔ خالہ گھبرائی ہوئی قریب کھڑی تھیں۔ جیک کا پیٹ خوب پھولا ہوا تھا۔ اس کی پھرتی مفقود ہوچکی تھی۔ بھاری بھرکم قدموں سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

ہم سب پریشان ہو رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا اس کو اتنا گھی ہضم نہیں ہوگا۔ اور وہ ضرور ہیضہ کرے گا۔ کسی صورت بچ نہیں سکتا۔ خالہ نے چورن کھلانے کی رائے دی لیکن میں نے سوچا نہ معلوم چورن سے کچھ خرابی ہوجائے۔ جیک کی صورت سے بے چینی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ غنودگی سی محسوس کر رہا ہو۔ امی نے تجویز پیش کی کہ اسے باہر گھمالاؤں شاید اس طرح گھی ہضم ہوجائے۔ چنانچہ میں اسے زنجیر سے باندھ کر گھمانے کے لیے لے گیا۔ وہ پھرتی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے

پھولے ہوئے پیٹ کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں بمشکل دکھائی دیتی تھیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھمانے کے بعد میں واپس آیا۔ ہمارے شبہات غلط نکلے۔ جیک کو نہ بدہضمی ہوئی اور نہ اس کو ہیضہ ہی ہوا۔ اگرچہ رات بھر ہم فکر مند رہے لیکن دوسرے دن اس کا پیٹ بالکل ہموار دیکھ کر دل کو تسلی ہوگئی۔ ہم سنتے آئے تھے کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا نہ معلوم جیک نے کیسے ہضم کرلیا۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ جیک قدرے بڑا ہوگیا تھا۔ اس کے لیے دودھ بھی بجائے پاؤ بھر کے آدھ سیر آنے لگا تھا۔ اگرچہ دودھ روٹی صبح شام ہی ملتی تھی لیکن اب دوپہر کو چند بسکٹ بھی کھلائے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جیک کچھ کمزور سا نظر آنے لگا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اب وہ بڑھ رہا ہے۔ اس لیے کمزور دکھائی دیتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اب وہ کچھ مضمحل سا نظر آتا تھا۔

ایک روز ابا کے ایک دوست ملنے کے لیے آئے۔ جیک کو دیکھا کہنے لگے۔ اچھی نسل کا کتا ہے۔ لیکن ہم دیسی لوگ ان کو پال نہیں سکتے۔ ان کتوں کی غور و پرداخت ماہر شخص ہی کرسکتا ہے۔ ابا نے بتایا کہ پہلے جیک خوب موٹا تازہ تھا۔ لیکن اب نہ معلوم اس کو کیا ہوگیا ہے۔ کوئی خفیہ روگ ہے جس کا علم نہیں۔ غالباً معدے میں گڑ بڑ ہے۔ فراغت بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ بھوک بھی کم لگتی ہے۔ اب پہلے کی طرح چونچال بھی نہیں رہا۔ ابا کے دوست نے بتایا کہ اس حالت میں اس کے دودھ میں تھوڑی سی پسی ہوئی گندھک ملا دیا کریں۔

یہ نسخہ بھی آزمایا گیا۔ پہلے تو کچھ افاقہ معلوم ہوا لیکن اس دوا کا اثر دیرپا ثابت نہ ہوا۔

رفتہ رفتہ جیک بالکل دل شکستہ رہنے لگا۔ یوں ہی مضمحل سا ایک جگہ پڑا رہتا۔

دودھ کی پیالی کو پہلے سونگھتا پھر کبھی تھوڑا سا زبان سے لپلپاتا — لیکن کبھی پیالہ بھر نہ پیتا تھا۔ اب اگر ابا کے پاؤں کی آہٹ آتی تو وہ دروازے تک جاتا ضرور لیکن وہ جوش و خروش مفقود تھا۔ ابا چار پائی پر بیٹھ جاتے تو یہ چھوٹے کمرے میں واپس آکر اپنے بورئیے پر بیٹھ جاتا۔

ہم روز اسی کا ذکر کرتے بسکٹ کے ٹکڑے اس کے آگے ڈالتے۔ اس کے سامنے گیند لڑھکاتے۔ لیکن سب بے سود جو دوا کسی نے بتلائی کھلائی گئی لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔

ایک دن ابا ایک شخص کو ہمراہ لائے اس نے بڑے غور سے جیک کو دیکھا بھالا۔ اس کی آنکھیں پیٹ اور رانیں ٹٹولیں۔ پھر ابا نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ وہ بولا یہ کتا بہت جلد اچھا ہوجائے گا۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ ابا نے مجھ کو اس کے ساتھ بھیجا۔ اور میں اس کے گھر سے دوا لے آیا۔

دوسرے دن جیک کچھ بہتر ہوگیا۔ ابا جیک کے لیے ایک بہت عمدہ سا پٹکا لائے جس میں نکل کیے ہوئے سفید سفید بڑے سر کے کیل جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت مہین اور خوب صورت سی زنجیر تھی۔ اس دن شام کے وقت میں جیک کو نئے پٹکے اور اور نئی زنجیر کے ساتھ گھمانے لے گیا۔ ابا کہنے لگے اب جیک بہت جلد اچھا ہوجائے گا۔

تین چار روز بعد جیک پر کچھ ایسا شدید ردِعمل ہوا کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگیا۔ بس بورئیے پر لیٹا رہتا۔ ابا باہر سے آتے تو وہ اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن اُٹھ نہ سکتا تھا۔ چنانچہ ابا جب اس کے قریب جاتے تو پڑے پڑے دم ہلا کر پیار کر لیتا۔

اس کے بعد اس کی آنکھیں بند رہنے لگیں۔ اگر کھلی بھی ہوتیں تو پتھرائی ہوئی سی۔ ہم اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائے امّی نے ابا سے کہا کہ جیک کو حیوانوں کے اسپتال لے جائیں۔ چونکہ وہ چلنے سے معذور تھا اس لیے میں نے اسے تولیہ میں لپیٹ کر اٹھا لیا اور ابا کے ساتھ حیوانوں کے ہسپتال میں پہنچے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کی

فیس لی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ہم ان دنوں بڑی مشکل سے گذر کرتے تھے۔ خیر ابا نے فیس دے دی۔ اور جیک کی بیماری کا طویل بیان دیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا اب اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اس کے بعد وہ انگریزی میں ابا سے باتیں کرنے لگا۔ ابا نے الٹے ہاتھ سے اپنی ناک کو قدرے رگڑا۔ دوائی کے دام دے کر کسی کام سے چلے گئے اور میں جیک کو لے کر گھر آیا۔

تھوڑی دیر بعد ابا بھی آ گئے۔ ہم گئی رات تک جیک کے پاس بیٹھے رہے۔ جیک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کئی مرتبہ خالہ جیک کا حال پوچھنے آئیں۔ چونکہ ابا جیک کے پاس بیٹھے تھے اس لیے باہر سے لوٹ جاتی تھیں۔

دوسرے دن علی الصبح میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابا اور امّی جیک کے قریب بیٹھے ہیں میں بھی اٹھ بیٹھا۔ چار پائی سے اتر کر ان کے قریب گیا دیکھا کہ جیک بڑی بری حالت میں ہے۔ اس کی خوشنما کھال بھدّی میلی اور ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ ایک پہلو پر لیٹا تھا۔ ایک کان پیچھے کو الٹ گیا تھا۔ کان کے اندر قدرے سرخ گوشت دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں بے نور تھیں۔ مکھیاں اڑانے کے لیے وہ کان تک نہ ہلا سکتا تھا۔ وہ ٹانگیں جو صحت کی حالت میں ڈھیلی اور قدرے خم دار تھیں اب اکڑ کھنچ کر سیدھی ہو گئی تھیں پیٹھ کے منکے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ امّی گرم پانی والی ربڑ کی بوتل سے اس کو ٹکور کر رہی تھی۔ جیک کو نہ معلوم کیا مرض تھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ابا ذرا جھک کر ملائم آواز میں اس کا نام لے کر اس کو پکارنے لگے۔ ”جیکی! ...... جیکی!!“

جیک نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ بہت مشکل سے...... پھر جیسے اس نے پہچان لیا ہو صرف اس کی دم میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ دم ایک مرتبہ فرش سے ذرا سی اٹھی اور پھر گر پڑی...... اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں جیسے پپوٹوں پر اس کا قابو نہ رہا ہو...... اس کے بعد سینہ نیچے ہوا اور پھر نہ اٹھا...... اس کا دم نکل گیا۔

وہ صبح بہت ہی سہاؤنی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ چمک دار دھوپ سایوں کو دھکیلتی دیواروں کے اوپر سے نیچے کی طرف اُتر رہی تھی۔ گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑوں اور دروازوں پر گھریلو چڑے اور چڑیاں پھدکتی پھرتی تھیں۔

جیک دیوار کے ساتھ بورے پر سفید کپڑے سے ڈھکا پڑا تھا۔ اس کی کالی کالی پتلی ٹانگیں کپڑے سے باہر نکل آئی تھیں — ابا دوسرے کمرے میں بیٹھے قینچی سے انگلیوں کے ناخن کاٹ رہے تھے۔ امّی چھوٹے کمرے میں' چارپائی سے پاؤں لٹکائے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے عجب بے ڈھنگے طریقہ سے بیٹھی تھیں...... اور میں یوں ہی رسّی کے ایک ٹکڑے میں گرہیں دیئے جارہا تھا — خالہ کے میاں دفتر کو روانہ ہوچکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد خالہ عموماً ہلکے سروں میں کوئی گیت گنگنایا کرتی تھیں اور پھر غسل خانے میں آدھ پون گھنٹہ نہانے دھونے میں صرف کرتیں — آج وہ دروازے میں خاموش کھڑی تھیں اور وہ اپنی سفید موم بتی کی سی انگلی سے ناک کی چمکتی ہوئی کیل کو بار بار بے خبری کے عالم میں چھور ہی تھیں۔

ہم میں ہر ایک اپنے بشرے سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔''

یہ افسانہ، افسانوی مجموعہ 'تارو پود' میں شامل ہے۔

تین باتیں

رویل سنگھ گوردوارہ ڈیرہ صاحب کے صحن میں سویا ہوتا تو اُسے منہ اندھیرے ہی جاگنا پڑتا۔ چونکہ گوردوارے میں صبح ہی صبح شبد کیرتن شروع ہوجاتا تھا۔ اور صحن کی صفائی کے لیے مسافروں کو جگانا پڑتا تھا اس لیے چھت پر دیر تک سویا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور تیز دھوپ میں شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کا کلس جگمگا اٹھا۔

کیرتن شروع ہوچکا تھا اور گرو پریم کے متوالے نروناری جمع ہو رہے تھے۔ رویل سنگھ کو اپنی غفلت پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ جب وہ گاؤں میں تھا تو کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھا تھا۔ لیکن جب سے وہ لاہور میں آیا تھا، دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ طلوع آفتاب تک غٹ رہتا تھا۔

لیٹے لیٹے اس نے اپنے پاؤں پر نگاہ ڈالی' اس کے پاؤں بڑے بڑے تھے اور ٹخنوں کی ہڈیاں کسی بیل کی ہڈیوں سے کم نہ تھیں۔ اس کی ٹانگیں بہت لمبی تھیں۔ اور لمبی دوڑوں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ مضبوط اور خوش وضع ہوگئی تھیں۔

کچھ دیر اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ دفعتاً اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جو لوگ رات کو اس کے ساتھ چھت پر سوئے تھے۔ ان میں سے بیش تر جا چکے تھے۔ اس نے صحن کی طرف جھانک کر دیکھا جہاں عورتیں چھوٹے چھوٹے گھونگٹ نکالے

ہاتھوں میں دونے اور کٹوریاں تھامے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

اپنے گھر میں بھی وہ اسی طرح اُچھل کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ یہاں اسے کوئی کام نہ تھا۔ پہاڑ سا دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ چار دنوں سے وہ گوردوارے کے لنگر سے روٹی کھا رہا تھا۔ تھوڑی سی نقدی جو اس کے پاس تھی وہ شربت اور لسی پینے کے لیے— اس کے پاس صرف چند آنے باقی رہ گئے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد اس کا گذارہ کیسے ہوگا۔ وہ شرافت کا کچھ ایسا قائل بھی نہ تھا۔ وہ لٹکے ہوئے کلوں والے بنیوں کو بڑی خوف ناک نظروں سے گھورا کرتا تھا۔ لیکن یہ لاہور تھا۔ ایک گہما گہمی — متواتر آمد و رفت — کوئی اکا دکا مل جائے تو وہ ایک ہی دھول جما کر اپنا شکار ہتھیا لے۔ اسے یاد آیا کہ...... پانچ چھ ماہ پہلے وہ اس کے ساتھی گاؤں کے ایک ساہوکار کے گھر میں آدھی رات کے وقت جا گھسے۔ جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو جلدی میں انہوں نے تیرہ بوریاں گیہوں کی اڑالیں۔ لیکن پکڑ لیے گئے۔ تین ساتھی تو سزا پاکر بڑے گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ اور اس کے ایک ساتھی کا جرم ثابت نہ ہوسکا — آئندہ کے لیے اس نے توبہ تو نہ کی، البتہ محتاط ہوگیا...... احتیاط کی چند اور وجہیں بھی تھیں...... ایک تو گرفتاری کی صورت میں اسے بچانے والا کوئی نہ تھا، باپ مرچکا تھا اور ماں بے چاری بے دست و پا تھی۔ دوسرے امرکور جس کے ساتھ اسے بہت زیادہ محبت تھی۔ اور جو نازک اندام اور دھارمک خیالات کی لڑکی تھی، اس سے کہنے لگی کہ اگر تم جیل چلے گئے تو میں کچھ کھا کر مرجاؤں گی۔ رویل سنگھ جانتا تھا کہ وہ ضدی لڑکی جو کچھ کہتی ہے اسے پورا کر دکھائے گی۔ چنانچہ اس کی محبوبہ اور اس کی ماں نے مل جل کر اسے اس بات پر رضا مند کر ہی لیا کہ وہ شہر میں جا کر کوئی نوکری تلاش کرلے۔ تاکہ وہ لوگ آرام سے زندگی بسر کرسکیں۔

اس کی محبوبہ امرکور اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ سیانی اور دور اندیش تھی۔ اس نے رویل سنگھ کے دل میں بجائے آوارگی کے گھر کا پیار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایک گھر ہوگا۔ وہ دونوں خوب مزے میں بڑے پیار سے اکٹھے رہا کریں گے۔ ان کے ہاں ننھے منّے بچے پیدا ہوں گے۔ پھر انہیں کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ رویل سنگھ کا کند ذہن

ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا اکھڑ دل گھر کی کشش سے بے گانہ ہی رہا۔ لیکن جب شام کے دھندلکے میں کسّی کی پٹڑی پر امرکور گیلی مٹی کا تسلہ سر پر جمائے ہنس ہنس کر اس قسم کی باتیں کرتی تو اس کی تیزی سے گھومنے والی چمک دار آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹ اسے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے' اس کی زبان باچھوں پر کھلنے لگتی۔ جیسے امرکور مٹھائی کا دونا ہو۔ اگر وہ امرکور کا ایسا ہی شیدائی تھا تو گھر گھر کا پیار، اور بچے، تو معمولی باتیں تھیں۔ لیکن جب امرکور دیکھتی کہ وہ اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی بجائے حریص نظروں سے اس کے گالوں اور ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا ہے تو سٹ پٹا کر ٹوٹے ہوئے اسپرنگ والی گھڑی کی طرح خاموش ہوجاتی۔ اوہو ہو ہو'' رویل سنگھ اسے دونوں بازوؤں میں اُچک لیتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں متحرک ہوجاتیں۔'' بھئی امرو دیکھو منہ مت پھلاؤ۔ دھرم سے جو تم کہوگی وہی کروں گا۔'' تو میں کیا کہہ رہی تھی...... تم سے ؟'' امرکور چمک کر پوچھتی۔

'' سنو امرو! میری موٹی عقل ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ بس مجھے اتنا بتادو کہ میں کیا کروں؟''

پھر وہ اُس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر ہونٹ رکھ دیتا۔ امرو اُسے پیار کرنے کی چھٹی بھی دے دیتی اور ساتھ ہی ملامت بھی جاری رکھتی۔ دیکھو! ...... کوئی آرہا ہے ......؟ کوئی دیکھ لے گا! ...... اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی اس جگہ...... بس دیکھ لینا۔ ہاں ہا......''

ان کے گھر کے قریب ہی امرو کی گائے بندھی رہتی تھی۔ شام کے وقت امرو وہاں دودھ دوہنے کے لیے آتی تھی۔ جب وہ ادھر سے گذرتا تو اُچک کر ایک نظر ادھر ضرور ڈالتا۔ اگر امرو دکھائی دیتی تو پہلے ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر لیتا اور پھر اسے مخاطب کر کے گنگنانے لگتا۔

نی ...... لچھیے بادام رنگئے
تینوں لین کبوتر آیا

......" جو بولے سونہال" — گرو کے متوالوں نے نعرہ بلند کیا۔ تو رویل سنگھ چونک اٹھا۔ اب پرشاد بانٹا ہی جانے والا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اپنا کنگھا سنبھالا اور منتشر بالوں کو سمیٹنے کے بعد جلدی سے پگڑی باندھی اور چادر کندھے پر ڈال کر تہمد کی سلوٹیں درست کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور پگڑی کے شملے سے چہرہ پونچھا۔ گوردوارے کے دروازے پر نہنگ سکھوں کو کھڑے دیکھ کر بڑے عقیدت مندانہ انداز سے پاؤں بھی دھو ڈالے اور دروازے کی چوکھٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوا۔ پہلے ایک مرتبہ اس نے غلطی سے چوکھٹ پر پاؤں رکھ دیا تھا تو سیوادار نے اسے آنکھیں دکھا کر ٹوک دیا تھا۔

پرشاد بانٹا جارہا تھا۔ اس نے پہلے تو سامنے سے ہاتھ بڑھا کر پرشاد لیا۔ پھر پینترا بدل کر دوسری طرف ہاتھ بڑھا کر پرشاد لے لیا۔ پرشاد دینے والے کو ذرا شک گذرا۔ جب ذرا چکر کاٹ کر اس نے تیسری مرتبہ ہاتھ بڑھائے تو پرشاد بانٹنے والے کو غصہ آگیا۔ "سردار جی! بڑے افسوس کی بات ہے"۔ واقعی بات افسوس کی تھی لیکن وہ صبح کو اسی حلوے سے ناشتہ کیا کرتا تھا۔ اور اوپر سے پاؤ بھر دہی کی لسّی پی لیتا تھا۔ گاؤں میں تو ہر شخص کو پاؤ بھر حلوا دیا جاتا تھا لیکن یہاں' —؟ یہ شہری لوگ چھ ماشہ حلوہ دے کر رہ جاتے تھے۔ چنانچہ رویل سنگھ نے کہا۔ "گیانی جی! اتنا سا حلوہ تو ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے...... یہ تو بس ہتھیلیوں سے چپک کر رہ جاتا ہے۔"

پرشاد بانٹنے والے کے تیور بگڑ گئے۔ "سردار صاحب! پرشاد آخر پرشاد ہے...... اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرشاد ہی سے پیٹ بھر لیا جائے۔"

رویل سنگھ اس قسم کی منطق سے واقف نہیں تھا۔ چپ چاپ ایک طرف سرک کر کھڑا ہوگیا۔ جب سبھی متوالے چلے گئے تو وہ ایک کونے میں سیمنٹ کے سرد فرش پر آلتی

پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں گیانی جی نمودار ہوئے اور ایک بڑے دونے میں پاؤ، ڈیڑھ پاؤ حلوا ڈال کر اسے دے گئے۔ رویل سنگھ حیران رہ گیا۔ جب حلوا کھا کر وہ باہر نکلا، تو پاؤ بھر دہی میں سیر بھر پانی ڈال کر لسّی پینے لگا۔

لسی پینے کے بعد وہ سیدھا بڈھے دریا کی طرف چل دیا۔ دو دن پہلے وہ سردار بدھ سنگھ چوب فروش کے ہاں گیا تھا۔ وہ ان کے گاؤں ہی کے رہنے والے تھے انہیں ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ اور وہ رویل سنگھ کو نوکری دینے پر رضا مند ہوگئے تھے لیکن یہ الفاظ بدھ سنگھ کے بیٹے ہرنام سنگھ نے کہے تھے۔ اسی لیے وہ بدھ سنگھ سے ملنے کے لیے آج پھر وہاں آیا تھا۔ بدھ سنگھ کو مصروف دیکھ کر رویل سنگھ کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

رویل سنگھ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ دو جماعتیں پاس کر چکا تھا۔ تیسری جماعت میں ایک مرتبہ ماسٹر نے اسے زیادہ دیر تک مرغا بنائے رکھا تو اس نے پڑھنا لکھنا ترک کردیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزی پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ وہ ''اے'' سے ''زیڈ'' تک سارے حروف پڑھ لیتا تھا۔ اور ان میں سے بعض لکھ بھی سکتا تھا۔

فراغت پاکر بدھ سنگھ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نظر کمزور تھی۔ اور کان بھی کچھ بہرے تھے۔ چنانچہ رویل سنگھ کو اس کے قریب پہنچ کر اور چلاّ چلاّ کر اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔ بمشکل بڈھے نے بتایا کہ ان کے پہلے ملازم کا خط کل ہی آیا ہے۔ اور وہ دوچار روز تک واپس آنے والا ہے۔ اس لیے وہ اسے نہیں رکھ سکتے۔

ادھر سے جواب پاکر رویل سنگھ نے سبیل سے پانی پیا اور شہر کی طرف چل دیا۔ اب وہ بالکل مایوس ہوچکا تھا۔ اس نے سوچا آج سیر کر کے کل گاؤں واپس چلا جائے۔ وہ بڑی بڑی امیدیں لے کر شہر میں آیا تھا۔ لیکن اب کیا منہ لے کر واپس جائے گا۔ وہ ایک بے فکر اور آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اس قسم کی پابندیوں اور مجبوریوں سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ گھومتے گھامتے وہ شاہی محلّہ کے نزدیک ایک دھرم شالہ میں پہنچ گیا۔ وہ

دن میں ایک آدھ مرتبہ اس دھرم شالہ میں چلا آیا کرتا تھا۔ یہاں کا گرنتھی البیلی طبیعت کا نوجوان شخص تھا۔ ان دونوں میں کچھ بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر رویل سنگھ نے اسے کبھی اپنا رازدان نہیں بنایا تھا۔ گرنتھی اسے ابھی تک ایک کھاتا پیتا زمین دار سمجھتا تھا۔

وقت کٹی کے لیے رویل سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ جاتا۔ وہ دونوں فرش پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کرتے— اور برقی پنکھے تلے اینٹوں کے بنے ہوئے سرد فرش پر لیٹ جاتے ادھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہتے۔ نیند آتی تو سو بھی جاتے۔

آج وہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ جب سیڑھیاں چڑھ کر ہال میں داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ پہلو والے کمرے میں گرنتھی ریٹھوں کے پانی سے سر دھو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر گرنتھی نے قہقہہ لگایا۔ دوچار باتوں کے بعد رویل سنگھ اندر چلا گیا۔ اس نے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ در اصل اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ لنگر کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ اب اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا وہاں سے نہیں کھائے گا۔

پنکھا چھوڑ کر اس نے پگڑی اتاری اور فرش پر لیٹ گیا۔ گرنتھی نہانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کیے جاتا تھا۔ اس کی بے تکی باتوں سے رویل سنگھ اپنی بھوک کو بہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گرنتھی اپنے لمبے لمبے بال نچوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور ایک بڑے مزے کی بات شروع کر دی۔

اتنے میں ایک شخص انہیں کھانے پر بلانے آیا۔ شرادھوں کے دن تھے۔ رویل سنگھ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ آج پیٹ بھر کھانا ملے گا۔ معمولی سے تکلف کے بعد کھانے میں شریک ہوگیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس پر ایسی گہری نیند چھائی کہ شام تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔

اٹھتے ہی اس نے نل کے ٹھنڈے پانی سے اشنان کیا تو طبیعت کھل گئی۔ گرنتھی نے شکر کے ٹھنڈے شربت میں ستو گھول رکھے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دو

لوٹے پیے۔ وہ ستوؤں کا بڑا شوقین تھا۔

دوبارہ پگڑی باندھ کر اس نے گرنتھی سے مصافحہ کیا۔ اور اس نے بتایا کہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے اور وہ کل اپنے گاؤں لوٹ رہا ہے۔ اس پر گرنتھی نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور تاکید کی کہ وہ جب کبھی لاہور آئے تو اسے ضرور ملے۔"

یہاں سے وہ بازار کی سیر کرنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ انارکلی میں گھومتا ہوا وہ نیلہ گنبد جانکلا۔ وہاں اس نے لکڑی کے بڑے بڑے تختوں پر مختلف قسم کی تصویریں دیکھیں ایک تصویر میں پہاڑ کا منظر دکھایا گیا تھا۔ پہاڑ میں جگہ جگہ بل بنے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر پتھروں پر بڑے بڑے چوہے دوڑتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ نیچے لکھا تھا۔" جاپانی چوہے ہیں انہیں مار بھگاؤ۔" یہ تصویر دیکھ کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ خصوصاً چوہوں کی صورتیں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔ یعنی جسم تو چوہے کی مانند اور سر انسانوں کے۔ بعض چوہوں نے عینکیں بھی لگا رکھی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ جب وہ گاؤں میں جا کر امرکور سے ان چوہوں کا ذکر کرے گا۔ تو وہ کس قدر خوش ہوگی۔ کتنی حیران ہوگی ۔۔۔ پھر اس نے دماغ پر زور دیا کہ آخر یہ جاپانی کون ہیں؟ یہ کس قسم کے چوہے ہوتے ہیں اس نے آج تک ایسے چوہے نہیں دیکھے تھے۔ اس نے پگڑی سرکائی، سر کھجایا۔ غور کیا۔ لیکن کچھ نہ سمجھ سکا۔

اتنے میں کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ یہ اس کا ایک پرانا دوست ہرسا سنگھ تھا۔ دھوپ میں اس کا چہرہ کالے بوٹوں کی طرح چمک رہا تھا۔ آدھی پگڑی سر پر بندھی ہوئی تھی اور آدھی ادھر اُدھر جھول رہی تھی۔ رویل سنگھ اچھل کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

ہرسا سنگھ بھاٹڑوں کے خاندان سے تھا۔ رویل سنگھ کو اس سے خاص انس تھا۔ ہرسا سنگھ مضبوط جسم کا شیر دل شخص تھا۔ اسے ایسے ایسے ہتھکنڈے یاد تھے کہ بڑے بڑے استاد اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ دونوں بچپن ہی سے بہت گہرے دوست تھے

ہرسا سنگھ کبڈی کھیلنے میں طاق تھا۔ اس کا جسم مچھلی کی طرح چکنا اور خرگوش کی مانند پھرتیلا تھا اور وہ بھیڑیئے کی طرح خونخوار اور مکار تھا۔ جوان ہوتے ہی اس نے بڑے پیمانے پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے علاقہ کے ایک نامی ڈاکو سندر سنگھ سے بھی ساز باز کی تھی۔ اور ان دونوں نے مل کر بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ بعد میں سندر سنگھ کو پھانسی ہوگئی اور ہرسا سنگھ روپوش ہوگیا۔ آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر رویل سنگھ کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ دونوں ایک حلوائی کی دوکان میں داخل ہوئے ہرسا سنگھ نے دو سیر مٹھائی خریدی اور مٹھائی کھانے کے بعد دونوں نے پیٹ بھر کر لسّی پی۔

ہرسا سنگھ نے اسے بتایا کہ اس نے ضلع امرتسر میں دو ایسے گھر تاڑ رکھے ہیں۔ جہاں سے مال اڑالانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ یہ سن کر رویل سنگھ بہت خوش ہوا۔ اس قسم کی گفتگو سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے مستقبل کا نہایت دل فریب تصور باندھا اور ان دونوں میں عہد و پیمان ہوگیا کہ وہ کل پھر اسی جگہ ملیں گے۔ یہ طے کر کے وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔

ہرسا سنگھ کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک رویل سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل پر سے بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ لیکن جب اسے امرو کا خیال آیا تو وہ کچھ مایوس سا ہوگیا۔ اگر اسے معلوم ہوگیا کہ اس نے پھر ڈاکے ڈالنے شروع کیے ہیں۔ تو یقیناً بگڑ جائے گی۔ اسے چور کی بیوی بننا کبھی پسند نہ تھا۔ اس پر اس نے دل ہی دل میں امرو کو دو تین گالیاں بھی دیں...... لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے پھر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ اگر یہ ممکن ہوسکے کہ وہ صرف ایک بار ڈاکہ ڈال لے پھر چاہے زندگی بھر کے لیے اس پیشے کو خیر باد کہہ دے لیکن اگر وہ گرفتار ہوگیا تو اس کی زندگی برباد ہوجائے گی۔ امرو سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ماں کو علاحدہ دکھ ہوگا۔ اور وہ خود جیل میں پڑا سڑے گا۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ چلا جارہا تھا۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن وہ صحت ور

اور مضبوط ہونے کے باوجود مکار تھا۔ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر کیا کرے۔ سڑکوں پر بے شمار موٹریں، بیش قیمت کپڑے پہنے ہوئے امیر لوگ اعلا سے اعلا دکانیں اور اونچے اونچے مکانات دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ آخر ان سب کے لیے اس قدر روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ وہ کیوں اپنی محبوبہ کے ساتھ پر امن زندگی بسر کرنے سے معذور ہے؟ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا وہ ایک باغ میں جا نکلا۔ ایک روش کے کنارے بڑے سے بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''بہادری کے صلہ میں۔''

وہ سوچنے لگا کہ ''صلہ'' کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ غور سے اس تمغہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''وکٹوریہ کراس''۔۔۔ منگل سنگھ آٹھویں راجپوتانہ رائفلس کو بہادری کے صلہ میں وکٹوریہ کراس دیا گیا۔''

وہ نہیں جانتا تھا کہ وکٹوریہ کراس ہوتا کیا ہے۔ اور کیسی بہادری پر دیا جاتا ہے اور پھر وکٹوریہ کراس ملنے کے بعد کیا ہوتا ہے......اُکتا کر وہ پرے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی کم عقلی پر بہت ہی افسوس ہوا۔ وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا اور اپنی پیشانی کو انگلیوں سے بجا بجا کر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے وہ ہرسا سنگھ سے دوبارہ ملے یا نہ ملے۔

وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ ایک بازو سر کے نیچے رکھ لیا۔ دوسرا پیشانی پر اور نیم وا آنکھوں سے دور دور تک نظر دوڑانے لگا۔ سامنے ٹھنڈی سڑک کے پرلے سرے پر بہت لمبا چوڑا تختہ آویزاں کیا گیا۔ اس پر ایک خوب صورت عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس عورت کا چہرہ اس کے پورے قد کے برابر تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ سرخ گالوں والی بہت حسین عورت تھی۔ وہ حیران ہوا کہ آخر یہ کس عورت کا فوٹو ہے۔ نیچے انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ اس نے سوچا شاید یہ کسی میم کی تصویر ہو۔ حالانکہ اس نے دیسی کپڑے پہن رکھے تھے۔ مگر اس نے سنا تھا کہ اب میمیں بھی دیسی

کپڑے پہننے لگی ہیں۔ لیکن اس تصویر کو سر بازار دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ غیر مردوں کے سامنے اپنے حسن کی نمائش کیوں کی گئی تھی۔ پھر وہ تصویر کی لمبائی چوڑائی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہونے لگا۔ ''بلے بلے— اس بورڈ کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا تختہ تھا۔ اس پر موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ اس نے پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں اور بھی زیادہ کھول لیں۔ دیر تک غور کرنے کے بعد وہ پڑھ سکا۔

''انڈین آرمڈ کور''

''کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔''

وہ اچھل پڑا۔ یہ انڈین آرمڈ کور نیا ہی نام ہے۔ ہربنس کور پریم کور۔ جیت کور تو اس نے سن رکھے ہیں۔ لیکن انڈین آرمڈ کور بالکل نیا نام ہے۔ شاید کسی انگریز عورت کا نام ہو۔ ادھر اُدھر کچھ لوگ گھوم رہے تھے۔ اس کے دل میں آئی کہ کسی سے اس عورت کی بابت دریافت کرے۔ لیکن عورت کا معاملہ تھا۔ اس قسم کی بات بے باکی سے پوچھتے ہوئے اسے شرم سی محسوس ہوئی چنانچہ اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ آخر اس نے اپنی چادر کو تہ کر کے اسے سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں ایک لطیف سی نمی تھی۔ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ لیٹے لیٹے وہ انڈین آرمڈ کور کی بابت پھر سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ اسے کچھ سمجھ آنے لگی کہ اس عورت کی تصویر نصب کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اس نے سنا تھا کہ لاہور میں بڑی بڑی بد معاشیاں ہوتی ہیں۔ لیکن کیا کوئی عورت اس قدر جرأت کرسکتی ہے کہ اپنی تصویر اس طرح سر بازار کھڑی کر کے دوسرے تختے پر لکھوا دے۔ کہ'' انڈین آرمڈ کور'' کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے — اس نے پریوں کی کہانیوں میں ایک خوب صورت ملکہ کا قصہ سنا تھا۔ اس کی جوانی بس ایک قیامت تھی۔جو بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ وہ نت نئے نوجوانوں سے گٹھ جوڑ کرتی۔ اور جب وہ بے کار ہوجاتے تو انہیں مگر مچھوں کے تالاب میں پھینکوا دیتی...... مگر وہ تو کہانی تھی۔ لیکن یہ

عورت؟ — آخر اسے نوجوانوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس کا چال چلن بھی خراب ہے۔ کیا یہ بھی نوجوانوں کو بے کار کر کے پرے پھینک دیتی ہوگی۔ کیا گورنمنٹ نے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جو ایسی بدکار اور نوجوانوں کو برباد کر دینے والی عورتوں پر لاگو ہو سکے۔

رفتہ رفتہ باغ میں آمد و رفت بڑھنے لگی۔ کالی کالی ماما ئین بچوں کی گاڑیاں دھکیلتی ہوئی آئیں۔ چند شوقین مزاج کالجیٹ چھوکرے انگریزی میں گٹ مٹ کرتے ہوئے ادھر اُدھر مٹر گشت کرنے لگے۔ کئی بوڑھے کھوسٹ اپنی چکنی کھوپڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بنچوں پر آ بیٹھے۔ قریب کے درخت سے ریڈیو کی آواز آنے لگی۔ اس نے پہلے بھی ریڈیو سنا تھا۔ لیکن باغ میں دفعتاً ریڈیو کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ ادھر اُدھر کے لوگ بھی ریڈیو والے درخت کے قریب زمین پر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو درست کیا۔ سنبھل بیٹھا۔ اتنے میں ریڈیو سے مرزا صاحباں کے بول سنائی دیئے۔ اس کے دل پر سرور طاری ہوگیا — ایک چھابڑی والا ادھر آنکلا۔ اس نے جیب ٹٹول کر دیکھی۔ ایک ٹکا بچ گیا تھا۔ اب یہی اس کی کائنات تھی۔ اس نے چھابڑی والے کو آواز دے کر دو پیسے کے کچالو لیے اور انہیں تنکے سے اڑس اڑس کر کھانے لگا۔

کچالو کھانے کے بعد وہ اٹھا۔ نل سے پانی پیا اور مونچھیں پونچھتا ہوا ریڈیو والے درخت کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک اور بڑا تختہ لگا ہوا تھا۔ جس پر نیچے اوپر تین آدمی بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے تین آدمی بندوقیں تھامے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ ہر جوڑ کے ساتھ حاشیے میں لکھا تھا۔

اٹلی میں دشمن کو بھگانے والا کون؟ — پنجابی جوان!

جرمنوں کو کون بھگا رہا ہے؟ — پنجابی جوان!

جاپانیوں کو کون مار بھگائے گا؟ — پنجابی جوان!

وہ غور سے ان تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی مضحکہ خیز صورتیں بنا رکھی ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھاگنے اور بھگانے والے لکڑی کے بنے ہوئے ہوں۔ وہ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بورڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی۔ اور زور سے کھانس کر بلغم اُگلا۔ اور آنکھیں جھپکتا ہوا ریڈیو کی طرف بڑھا۔ آواز درخت کی ٹہنیوں میں سے آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر رات کو درخت پر چڑھ کر ریڈیو اڑا لیا جائے تو کیسی رہے۔ وہ درخت کے تنے اور ٹہنیوں پر نظر دوڑا دوڑا کر اوپر چڑھنے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ جب اس نے ادھر اُدھر گھوم کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ درخت پر سوائے بھونپو کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک بابو نے اسے بتایا کہ ریڈیو پرے سرکاری کمرے میں بند ہے۔ وہاں سے بجلی کا ایک تار درخت سے باندھ دیا گیا ہے۔ اور تار کے آگے بھونپو لگا یا گیا ہے۔

روڈیل سنگھ مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ یہاں بھی چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک پر لکھا تھا۔ ''ہندوستان کو بچاؤ'' اس نے اپنے کسے ہوئے جوڑے کو ڈھیلا کیا اور سوچنے لگا کہ ہندوستان کہاں ہے؟ وہ یوپی کے لوگوں کو ہندوستانی سمجھتا تھا۔ اور بس اتنا جانتا تھا کہ پورب کی جانب کوئی دیس ہے۔ جسے لوگ ہندوستان کہتے ہیں وہاں کے لوگ دبلے پتلے سے ہوتے ہیں۔ ان کی زبان بھی خوب ''چڑ پڑ'' سی ہوتی ہے۔ پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ نا معلوم بے چارے ہندوستان پر کیا آفت آن پڑی ہے؟ آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی الجھنوں میں گم ہوگیا۔ اتنے میں کسی عورت نے ریڈیو پر پنجابی گیت گانا شروع کیا۔

دے پنجابی جواناں! — وے ویرا تیتھوں
جرمن جاپانی تھر تھر کمبدے

وہ تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج وہ ذرا جلد ہی گوردوارے پہنچ جائے گا۔ ورنہ اگر کھانے کا وقت ختم ہوگیا تو اسے پھر بھوکا رہنا پڑے گا۔

لاہور میں اس کا جی نہیں لگا۔ اسے اس بات کا دلی رنج تھ کہ اسے کوئی نوکری نہیں مل سکی ــــ اس کے قریب بیٹھا ہوا لڑکا ایک دوسرا بورڈ پڑھنے لگا۔

''انڈیا کی جے۔''

''آجاؤ نوجوان! دشمن بھاگ رہا ہے۔ یہی موقع ہے اس کا پیچھا کرنے کا۔''

ایک سپاہی لوہے کی ٹوپی پہنے اور دونوں ہاتھ اٹھائے للکار رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اور سپاہی بھی چلے آرہے تھے۔ رویل سنگھ نے پھر ہاتھ پھیلائے اور منہ کھول کر ایک لمبی سی جمائی لی۔

اس کے منہ کے چوڑے دہانے میں موٹے سے موٹے دشمن کی کھوپڑی آسکتی ہے۔ اور اس کی فولادی انگلیاں تکڑے سے تکڑے دشمن کا ٹینٹوا دبا سکتی ہیں۔ لیکن دشمن تھا کدھر؟

اس کی بھوک تیز ہوتی جارہی تھی۔ دماغ میں خیالات کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ لوگ شور مچا رہے تھے۔ ریڈیو گیت سنا رہا تھا۔ کتے بھونک رہے تھے ــــ وہ چادر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ زیادہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ گورو کے لنگر میں وقت سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔

جب وہ باغ کے پھاٹک سے گذرنے لگا، تو اس نے ایک اور بڑا سا تختہ دیکھا۔ اس پر ایک فوجی سکھ کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے گالوں پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ خوشنما داڑھی خوب کس کر بندھی ہوئی تھی۔ اور سر پر گول سی دوہری پگڑی بندھی تھی ــــ اس کے ایک ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی سے وہ ان انگلیوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''۳ باتیں۔''

''اچھی خوراک''

''اچھی تنخواہ!''

''جلدی ترقی''

اور نیچے لکھا ہوا تھا۔

''کھانا مفت ملتا ہے۔ وردی، بوٹ اور تنخواہ سب کچھ مفت ہی مفت، گھر جانے کے لیے چھٹیاں بھی پوری تنخواہ پر۔''

رویل سنگھ کچھ دیر تک اس تختے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اپنی لمبی زبان ہونٹوں اور باچھوں پر پھیری — اور پھر پتہ پوچھتا ہوا بھرتی کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا —

یہ افسانہ، افسانوی مجموعہ 'تار و پود' میں شامل ہے۔